قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

مارچ 2017 قیمت 15₹

ماہنامہ

اُردو دُنیا

دہلی

Monthly **URDU DUNIYA**, New Delhi

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

بچّوں کے لیے اردو کی تاریخ کا سب سے خوب صورت، خوب سیرت شاندار رسالہ

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ
بچوں کی دنیا
دہلی
Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں
قسط وار ناول
عجیب وغریب خبریں

دل چسپ کہانیاں
معلوماتی مضامین
ہنسنے ہنسانے کی باتیں

ان کے علاوہ:

کہکشاں ♦ سیاحتی مقامات

اردو ایس ایم ایس ♦ اردو فیس بک ♦ دماغی ورزش

ننھے فنکار ♦ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

ہندوستان بھر میں سب سے زیادہ چھپنے والا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 10 روپے   سالانہ: 100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

ماہنامہ اردو دنیا نئی دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:19، شمارہ:03، مارچ 2017

مدیر : پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

نائب مدیر : ڈاکٹر عبدالحی

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع:

ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا

فیز-II، نئی دہلی-110020

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: محمد اکرام

ڈیزائننگ: محمد زید

قیمت -/15 روپے   سالانہ -/150 روپے

Total Pages:100

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ، نئی دہلی-110025

فون: 49539000   شعبۂ ادارت: 49539009

ویب سائٹ

http://www.urducouncil.nic.in

E-mail: editor@ncpul.in

urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم، نئی دہلی۔110066

فون: 26109746، فیکس: 26108159

ای میل: sales@ncpul.in,ncpulsaleunit@gmail.com

شاخ: 22-7-110 تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلیکس

بلاک نمبر 5-1 پتھر گٹی، حیدرآباد۔500002

فون: 040-24415194

مشمولات

اداریہ

ہماری بات 4

خطوط

آپ کی بات — قارئین کے خطوط 5

انٹرویو

آج اردو انتہائی دشواریوں کے باوجود زندہ ہے: نند کشور وکرم — محمد عارف اقبال 9

نقد و نگاہ

کرشن چندر کے افسانوں میں کردار سازی — شبنم حمید 13

منیر نیازی کی غزل کے فکری وفنی سروکار — ظفر النقی 16

مائی تھوز کا ہندوستانی سوندریہ — اکرم پرویز 18

فضائی آلودگی کا مسئلہ اور اردو کے نظم نگار شعرا — سمیٰ 21

عکس رفتہ

2016 کا فکشن — اسلم جمشید پوری 24

2016 کا ادبی جائزہ — عبدالرحیم نشتر 28

اردو افق

اردو زبان کی بین الاقوامی شہرت — ٹی آر رینا 31

سلسلۂ صحافت

جموں وکشمیر میں اردو صحافت — مشتاق قادری 36

نشان دانش

کامل القادری کی ادبی خدمات — سید شاہد اقبال 39

خراج عقیدت

اخلاق الرحمن قدوائی: اسم بامسمّیٰ — محمد رحمت اللہ 41

فرحت قادری: شخص اور شاعر — احمد صغیر 43

حکیم سید غلام مہدی راز — سید حبیب الرحمن 45

شخصیت

اختر شیرانی — طلحہ نقشبندی القادری 48

ہم نے جنھیں بھلا دیا

نامور شاعر سریر کابری — حسن نواب حسن 51

نیا آسمان، نئے ستارے

اردو کے اہم ڈرامانگار — قرۃ العین 54

میر وسودا کے عہد کی اردو شاعری پر فارسی کے اثرات — غلام اختر 58

بچوں کی دھن — محمد مبین الرحمٰن 60

سائنس/ٹیکنالوجی

ڈیجیٹلائزیشن اور سائبر جرائم — مومن فہیم احمد عبدالباری 62

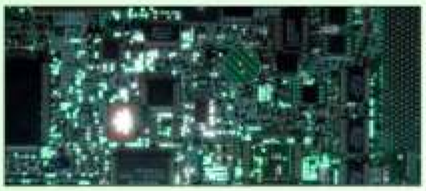

صحت

سینی ٹیشن اور اس کی دشواریاں — جمال نصرت 64

فلم

راج کپور — ف س اعجاز 66

کتابوں کی دنیا

تبصرہ وتعارف — ادارہ 69

خبر نامہ

اردو دنیا کی خبریں — ادارہ 81

ہماری بات

اردو زبان صرف برصغیر تک محدود نہیں ہے بلکہ اس کا دائرہ یورپی، خلیجی اور دیگر ممالک تک پھیلا ہوا ہے۔ جہاں غیر ملکی زبان کی حیثیت سے اس کی تعلیم و تدریس کا بھی معقول انتظام ہے۔ بیرون ملک جامعات میں بھی اردو زبان و ادب کے تعلق سے تحقیق کا سلسلہ جاری ہے۔ بعض ایسے موضوعات پر ان اداروں میں تحقیق ہورہی ہے جن پر ہندوستانی جامعات میں تحقیق میں بہت سی دشواریاں پیش آسکتی ہیں۔ اردو میں کی جانے والی ایسی غیر ملکی تحقیقات سے اردو کا دامن فکری اور لسانی اعتبار سے وسیع ہورہا ہے۔ خاص طور پر دوسری زبانوں سے تعلق رکھنے والے افراد اردو زبان کے ادیبوں، شاعروں اور فنکاروں سے متعارف ہورہے ہیں۔ اس طرح اردو زبان کا تخلیقی اور تنقیدی سرمایہ دوسری زبانوں میں منتقل ہورہا ہے۔ عالمی زبانوں میں بھی اردو کی شاہکار تخلیقات ترجے اور تحقیق کے ذریعے اپنی پہچان کو مستحکم کررہی ہیں۔ عربی، فرانسیسی، روسی، جرمنی، فارسی اور انگریزی زبانوں میں اردو کے معتبر اور مستند قلم کاروں کے نہ صرف ترجے ہورہے ہیں بلکہ ان کی شخصیت اور افکار کے حوالے سے ان پر تنقیدی مکالموں کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ کئی جامعات میں پریم چند سے لے کر انتظار حسین تک نہ صرف نصاب میں شامل ہیں بلکہ ان کے افسانوی آرٹ کے حوالے سے بھی تحقیقی مقالے لکھے جارہے ہیں۔ اسی طرح غالب سے لے کر فیض احمد فیض اور دیگر شعرا کے ترجے بھی دیگر عالمی زبانوں میں ہورہے ہیں اور ان کے تخلیقی افکار بھی ان کے تنقیدی ڈسکورس کا حصہ بنتے جارہے ہیں۔ اردو زبان کے لیے یقیناً یہ خوش بختی کی بات ہے کہ اس کا دائرہ روز بروز وسیع سے وسیع تر ہوتا جارہا ہے اور اس کے دامن میں نئے نئے موضوعات آرہے ہیں۔ یہ ایک طرح سے اردو کی عظمت کا اعتراف بھی ہے کہ اس سے جڑے ہوئے تخلیق کاروں کو عالمی سطح پر شناخت مل رہی ہے۔

ایسے میں ایک سوال اٹھتا ہے کہ ان غیر ملکی جامعات میں کیا صرف ہمارے کلاسیکی شعر و ادب کو ہی تحقیق اور تنقید کا محور بنایا جارہا ہے یا معاصر ادب بھی ان کی تحقیق یا نصاب میں شامل ہے۔ جن موضوعات پر کام ہورہا ہے ان کی نوعیت کیا ہے۔ اس کی فہرست پر نظر ڈالی جائے تو اندازہ ہوسکتا ہے کہ دوسری زبانوں کے محققین اردو زبان کو کن نئے زاویوں سے متعارف کرانے کی کوشش کررہے ہیں۔

عالمی سطح پر اردو کی شناخت کے دائرے کو وسیع تر کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمارے یہاں ایک ایسی کمیٹی کی تشکیل ضروری ہے جو مختلف زبانوں میں اردو زبان و ادب کے تعلق سے کیے گئے ترجے اور تحقیق کے کام کا جائزہ لے کر اردو دنیا کو یہ بتاسکے کہ کن کن ملکوں میں اور کن کن سطحوں پر اردو زبان و ادب کے تعلق سے کام ہورہا ہے۔

قارئین! عالمی سطح پر جہاں اردو زبان کا دائرہ پھیل رہا ہے وہیں ملکی سطح پر ہم کچھ سکڑتے اور سمٹتے سے جارہے ہیں۔ خاص طور پر وہ علاقے جو کبھی اردو زبان کا گہوارہ سمجھے جاتے تھے وہاں اردو کی صورت حال تشویش ناک ہے۔ اس کی وجہ پر غور کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ خود ہم نے ہی اردو زبان سے قدرے کنارہ کشی اختیار کرلی ہے ورنہ اس زبان کے چاہنے والے اس ملک کے ہر نگر اور قریے میں موجود ہیں۔ بہت سے ایسے افراد ہیں جو اردو زبان سیکھنا چاہتے ہیں مگر انھیں سیکھنے کی سہولت میسر نہیں ہے۔ کہیں وسائل کی کمی ہے تو کچھ علاقوں تک ہم بھی پہنچنے میں ناکام ہیں۔ جہاں جہاں تک اردو زبان کا قافلہ پہنچ رہا ہے وہاں اس کا شاندار خیر مقدم ہورہا ہے۔ گذشتہ دنوں قومی اردو کونسل برائے فروغ اردو زبان (نئی دہلی) نے صنعتی شہر بھیونڈی (مہاراشٹر) میں کتاب میلے کا انعقاد کیا تھا وہاں جس طرح اس میلے کی پذیرائی ہوئی، اخبارات اور رسائل میں جس طرح کی رپورٹیں شائع ہوئیں اس سے اندازہ لگانا چنداں دشوار نہیں ہے کہ اگر اردو کو نگر نگر پہنچانے کی کوشش کی جائے تو کامیابی ضرور ملے گی۔ بھیونڈی میلے میں جس طرح اردو کتابوں کی خریداری ہوئی اس سے یہ بھرم بھی ٹوٹا کہ اردو سے قاری کا رشتہ ٹوٹ گیا ہے۔ میلے نے یہ ثابت کیا کہ ہمارے معاشرے کا کتابوں سے تعلق قائم ہے اور یہ تعلق کبھی کمزور نہیں ہوگا۔ اس حوالے سے اردو کے قدیم ترین رسالہ 'شاعر' ممبئی کے مدیر افتخار امام صدیقی نے اپنے اداریے میں بڑی اہم باتیں لکھی ہیں۔ وہ اداریہ اردو دنیا میں ماہنامہ 'شاعر' کے شکریے کے ساتھ شائع کیا جارہا ہے۔ قارئین وہ اداریہ پڑھیں اور یہ بتائیں کہ کیا اردو کا قاری زندہ ہے یا مر چکا ہے!

'اردو دنیا' میں جو نئے سلسلے شروع کیے گئے ہیں قارئین نے ان سلسلوں کی کافی پذیرائی کی ہے۔ آئندہ اردو دنیا میں قومی اردو کونسل کی طرف سے شائع ہونے والے علمی اور تحقیقی مجلہ 'فکر و تحقیق' کا توضیحی اشاریہ بھی شائع کیا جائے گا۔

پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

آپ کی بات

اردو دنیا فروری 2017 کے شمارے میں 'ہماری بات' کے تحت مدیرِ محترم پروفیسر ارتضیٰ کریم نے الفاظ، کتاب اور علم کی اہمیت کو بڑے دل آویز اور روشن پیرائے میں واضح کیا ہے۔ موصوف کے قلم سے جو شعاعیں پھوٹیں، وہ دلوں میں اتر گئیں۔ بحیثیت ڈائرکٹر این سی پی یو ایل آپ کا حوصلہ دیکھ کر پروفیسر خلیل الرحمان اعظمی کا یہ شعر بے ساختہ زبان پر آ گیا:

چھو سکے گی اب نہ میرے ہاتھ طوفانی ہوا
جس دیے کو میں جلا دوں گا، وہ جلتا جائے گا

شعیب رضا فاطمی کی 'روداد کتاب میلہ' کا لفظ لفظ میرے اس احساس کا غماز ہے۔ کتاب میلے کی اس روداد میں کہانی کا مزہ آیا۔

عبدالحی نے شاہراہِ اردو کے ایک سبک رو مسافر کیول دھیر سے گویا بالمشافہ ملاقات کروادی۔

تبصرہ و تعارف کے تحت مبصرین نے اپنا اپنا فریضہ بحسن و خوبی انجام دیا ہے۔ اردو کتابوں کی فروخت کے اعتبار سے کتاب میلے کا ارتقائی سفر کافی فرحت بخش رہا۔

❖ **متین اچل پوری**: مسجد اکبری چوک، بیابانی، اچل پور

'اردو دنیا' جنوری 2017 کے اداریہ 'ہماری بات' میں پروفیسر ارتضیٰ کریم نے نئے سال کی مبارکباد دیتے ہوئے نئی صبح نئے خواب اور نئی امیدوں کے ساتھ شروع ہونے والے نئے سال سے جڑے ہوئے سوالات اور گذشتہ سال ماضی کا تذکرہ کیا ہے۔ نئے سال کا استقبال بے شک بڑے جوش و ولولے کے ساتھ شروع کیا جا رہا ہے لیکن گزرے سال کے تلخ و ترش تجربے اور تجربے کا احساس بھی ہمارے ساتھ چپٹا ہوا ہے ہم انھیں کسی بھی صورت دامن بچا کر خود سے الگ نہیں کر سکتے۔

زیرِ نظر شمارے میں شمس الرحمٰن فاروقی کا مضمون قابلِ توجہ ہے جس میں موصوف نے شعر و ادب کے تحقیقاتی امور میں ماضی کے شعرا کے تعلق سے صرف بصیرت افروز تحقیق ہی نہیں کی بلکہ ان کے اشعار کی نئے نقطۂ نظر سے تشریح بھی کی ہے جیسے غالب کے ایک شعر میں..... ظرفِ تنگنائے غزل کے تعلق سے اپنی دیدہ ور

تشریحی صراحت کا ثبوت دیا ہے آگے چل کر دکن سے ولی دکنی کا دہلی کی طرف کوچ کرنا اور وہاں کی معتبر فارسی و عربی کے فکر و فن اور دکنی لب و لہجے کا شمالی ادب کے شعرا کے مد مقابل متعارف کروانا صرف تعارف کی حد تک ہی نہیں بلکہ اس دکنی بولی کی نو یلی و ان سنی جہت کو میر و قائم و سودا جیسے استادانِ فکر و فن کو قائل مائل کروانا یقیناً ولی دکنی کے سر اس کا سہرا بندھتا ہے اور فاروقی صاحب نے مضمون میں ایک قابلِ فکر اور چونکا دینے والی یہ بات کہی ہے کہ آج ہماری زبان پر کڑوا وقت اس لیے آ پڑا ہے کیونکہ ہماری یونیورسٹیوں میں ایک ہی موضوع کو مختلف صورتوں میں تحقیقی مقالات کا نام دیا جا رہا ہے جس کا خلاصہ فاروقی صاحب نے خواتین کے ادبی و فنی کارنامے کے مختلف عنوانات کے تانے بانے، ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں میں تمثیلی کردار اور اس طرح قرۃ العین حیدر کے ناولوں میں نسوانی کرداروں پر لکھے گئے تحقیقی مقالوں کو چبائے ہوئے نوالے اور چچوڑی ہوئی ہڈیوں سے تعبیر کر کے یونیورسٹیوں میں روگراں مقالات پر بٹنے والی ڈگریاں (ٹھیکریاں) کا ذکر کر کے ان عبرتناک حقائق سے پردہ اٹھایا ہے اور بقول فاروقی صاحب کوئی بھی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ ہماری یونیورسٹیوں میں تحقیق کی یہ صورتِ حال طلبا اور طالبات کی اپنی صلاحیتوں کو مسخ و مفقود کر رہی ہیں جس کی طرف سے ہمارے اساتذہ اور اربابِ حل و عقد ان سے واقف ہو کر بھی انجان بنے بیٹھے ہیں مجھے اس عبرتناک نتیجے کے پیشِ نظر ایک شعر یاد آ رہا ہے۔

یہی انداز تجارت ہے تو کل کا تاجر
برف کا باٹ لیے دھوپ میں بیٹھا ہوگا

مضمون بعنوان 'گیتادت ۔ وقت نے کیا کیا حسیں ستم' میں محمد علیم نے گیتادت کے تعلق سے دل کو چھو لینے والی اور متاثر کرنے والی باتیں کہی ہیں۔

مضمون 'آتساہت بیکل' میں امتیاز رومی نے بیکل صاحب کی شعری اور شعوری زندگی پر امتیازی نظر ڈالی ہے اور انھیں 'اتساہت بیکل' سے تعبیر کیا ہے۔ اتساہی خطاب کو ان کی نظم 'کسان بہادر' پیش کرنے کے عوض میں نہرو جی نے متاثر ہو کر کہا تھا کہ یہ ہمارا اتساہی شاعر ہے ― راقم کو اچھی طرح یاد ہے۔ 1959 میں بیکل اُتساہی ایک گیت لے کر حاضر ہوئے تھے:

اے مری جانِ غزل جانِ غزل، جانِ غزل
میرے گیتوں کو تو انداز ترنم دے دے

موصوف کا یہ اندازِ ترنم اور گیت رس کے تلاطم نے مدراس کے سامعین کے دلوں کو موہ لیا تھا اور اس مشاعرے میں شریک تمام کلاسیکی ادب کے شعرا ابھی دم بخود رہ گئے۔

مضمون 'جنوبی ہند کا موجودہ ادبی منظرنامہ' میں ڈاکٹر آفاق عالم صدیقی نے جنوبی ہند کے لگ بھگ سارے ادبا و شعرا کو اپنے مضمون میں یکجا کر دیا ہے اور ساتھ ہی دکنی اردو کا شمالی اردو ادب پر اثر انگیزی کا بھرپور احاطہ کرتے ہوئے اس کا سہرا ولی دکنی کے سر باندھا ہے جو برحق ہے۔

❖ **علیم صبا نویدی**: رائس منڈی اسٹریٹ، چینئی، تمل ناڈو

آپ کا موقر رسالہ اردو دنیا افسانے شائع نہیں کرتا۔ یہ افسوس ناک ہے۔ ایسی صورت میں معروف افسانہ نگار محمد بشیر مالیرکوٹلوی کا انٹرویو شائع کرنا ہوا کا خوشگوار جھونکا جیسا لگا (ادھر سردی بہت ہو رہی ہے اس لیے ہوا کا خوشگوار جھونکا غالباً غلط وقت پر استعمال کر رہا ہوں۔ لیکن نیت ٹھیک ہے) میں خود افسانے لکھتا ہوں اس لیے صرف بشیر صاحب کے حوالے سے ہی بات کروں گا۔ محمد بشیر مالیرکوٹلوی بڑے افسانہ نگار ہیں۔ چار دہائیوں سے افسانے لکھ رہے

ہیں اور پنجاب کی افسانہ دوستی کی فضا کو قائم رکھنے کی جدوجہد کر رہے ہیں گو کہ وہ تنہا ہوتے چلے جا رہے ہیں پنجاب کا بڑا نام بنتے جا رہے ہیں۔ ایسے میں بشیر صاحب بہت غنیمت ہیں موصوف نے افسانے کے حوالے سے چند اہم باتیں ضرور کہیں اور سب سے دلچسپ بات انھوں نے یہ کہی کہ عالمی معیار پر اردو افسانوں کو وہی لوگ پرکھتے ہیں جو عالمی زبان کے افسانوں سے بے خبر تو ہوتے ہی ہیں عصری افسانوں کا مطالعہ بھی نہیں کرتے۔ ہمارے بیشتر نقاد جانتے ہی نہیں کہ اکیسویں صدی میں کیا لکھا جا رہا ہے اور افسانہ نگاروں کا مقام کیا ہے۔ تقریباً یہ سب تیس سال قبل کے چینگ اوور سے جو جوجھ رہے ہیں اور ان کے ذہنوں میں وہی دس بارہ لوگ گھسے ہوئے ہیں جو اب فرسودہ ہو چکے ہیں اور ان کے خود اپنے معیار پر سوالیہ نشان لگ چکا ہے۔ یہ لوگ کیسے طے کریں گے کہ اردو افسانے کا معیار کیا ہے۔

افسانہ ہی کیا ہر ادب میں احتجاج ہونا چاہیے۔ ظلم اور ناانصافی کے خلاف بولنا اور اصلاح معاشرہ کے لیے آواز اُٹھانا ہر قلم کار کا فرض ہے۔ بشیر صاحب نے احتجاجی افسانہ نگاری کو صحیح ٹھہرایا ہے میں ان کی تائید کرتا ہوں۔ بشیر صاحب نے افسانوں کے فروغ کے لیے مالیر کوٹلہ میں ایک ادارہ قائم کیا ہے۔ یہ ان کا بڑا کارنامہ ہے۔

مجھے خوشی ہوتی اگر بشیر صاحب اردو کو محبوبہ نہ کہتے۔ انھیں کے دیار کے ایک صاحب نے پنجابی کو بیوی اور اردو کو محبوبہ بنایا تھا۔ ان کے اس رویہ سے اردو سے جائز تعلق رکھنے والوں کے منھ کا ذائقہ آج تک بگڑا ہوا ہے۔ شاید فیشن میں انھوں نے وہی گندہ جملہ دہرا دیا۔

بشیر صاحب کا یہ انٹرویو کئی معنوں میں تشنہ ہے۔ ان سے سوال پوچھنا چاہیے تھا کہ آج کل کیسے افسانے لکھے جا رہے ہیں۔ ایسے افسانہ نگار جو نصف صدی سے افسانے لکھ رہے ہیں کیا وہ موجودہ مطالبات کے ساتھ انصاف کر رہے ہیں ان کے افسانوں میں عصری مسائل کی گونج ہے کہ نہیں۔ اس کے علاوہ افسانچوں کے بارے میں انھیں تفصیل سے روشنی ڈالنی چاہیے تھی۔ اس سوال کو وہ ٹال گئے کہ افسانچوں کا مستقبل کیا ہے۔ بہر حال مختصر ہی سہی انھوں نے کئی اہم باتوں پر اچھی روشنی ڈالی ہے۔

سید ظفر ہاشمی: ایڈیٹر 'گلبن'، لکھنؤ، یوپی

'اردو دنیا' جنوری 2017 دیکھا۔ پرانی آن بان نمایاں ہے۔ مراسلات کا کالم خوب ہے۔ جنوری 2017 ختم ہوتے ہوتے آپ کو دو باتوں کی وجہ سے مراسلہ بھیجنا پڑا ہے۔ ایک جناب مرحوم ہاشم قدوائی کی غیر موجوگی جو آخر وقت تک لگ بھگ ہر رسالے کی زینت بنے رہے اور دوسرے

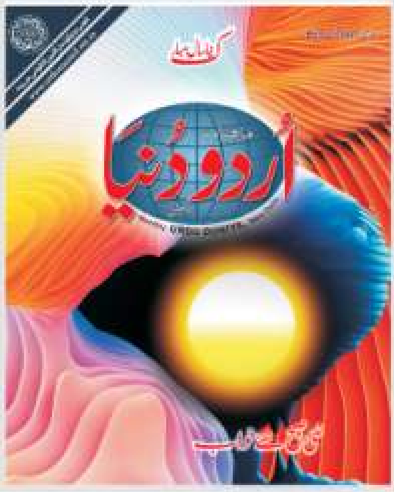

جناب کرشن بھاوک کی ایک غلطی جو جنوری 'اردو دنیا' کے شمارے میں در آئی ہے۔ بھائی کرشن جی پچاسوں رسالے ہر ماہ پڑھتے ہیں۔ غلطیاں بھی پکڑتے ہیں اور ڈکشنری میں ڈھونڈ کر گراں بار اور ثقیل الفاظ کے ذخیروں سے اپنے مراسلات سجاتے ہیں اور تحریر کو بوجھل کر دینے کے عادی ہی۔

بھائی کرشن جی ملک زادہ مرحوم پر لکھے مضمون بقلم پی پی سریواستو رند کے حوالے سے ایک شعر:

یہ کالی کالی گھٹا جو برسنے والی ہے
مزہ تو جب ہے کسی پارسا کو لے ڈوبے

دراصل یہ شعر ملک زادہ مرحوم کا نہیں ہے بلکہ شاہجہاں بانو یاد دہلوی کا ہے آپ سے سہو ہو گیا ہے۔ ملک زادہ منظور صاحب کی ایک کتاب 'شہر سخن' ہے جس میں ایک مضمون یاد دہلوی پر بھی ہے۔ اسی مضمون سے یہ شعر اخذ کیا گیا ہے اسی ایک شعر نے یاد دہلوی کو بام عروج تک پہنچا دیا اور مشاعروں میں ان کی مانگ بڑھ گئی۔ مرحومہ کا جب پہلا دیوان چھپا تو خادم کے غریب خانے پر پروگرام رکھا گیا۔ اس میں دیوان کی رونمائی ہوئی۔ مرحوم ملک زادہ منظور صاحب خادم کے غریب خانے پر آتے رہتے تھے۔ ہر سال 'آم اور غالب' کا پروگرام لگ بھگ 37 سال سے ہوتا آ رہا ہے۔ مرحوم بھی اس میں شرکت کرتے تھے اور یاد دہلوی مرحومہ بھی اکثر پیدل چل کر ملاقات کے لیے آتی تھیں۔

چودھری شرف الدین: نعمت اللہ بلڈنگ، امین آباد، لکھنؤ

اس شمارے میں 'اپنی بات' کے تحت مدیر نے یہ صد فی صد صحیح فرمایا ہے کہ ادب، زبان اور ثقافت کے صیغے میں نئے تجربوں اور علاقوں کی تلاش کا فقدان محسوس کیا جاتا ہے، کیونکہ شاید یہ ہماری ترجیحی فہرست میں شامل نہیں ہوتے ہیں۔ لہٰذا ہمارے لیے اپنی سمتوں و جہات میں تبدیلی کرنا دور حاضر کا ایک اہم تقاضا ہے۔

گذشتہ ماہ میں ہی 3 دسمبر کو فوت ہو جانے والے عوامی عظیم شاعر جناب بیکل اتساہی کی شاعری پر مبنی اقتیاز رومی صاحب کا مضمون ایک جامع و موقر مقالہ ہے۔ اس میں ان کی شاعری سے متعلق حوالوں کی ضرور کمی رہی ہے، البتہ موصوف کی عوامی نوعیت کی غزلوں، نظموں و گیتوں میں اردو کے ساتھ ہندی زبان، بالخصوص عوامی لفظیات کا استعمال قابل صد ستائش ہے۔ حیدر علی صاحب نے علی گڑھ میں کبھی چائے کی ایک دوکان، بعد میں کینٹین چلانے والے کمال کے شاعر جاوید کمال کی شاعری کے متعدد اوصاف شمار کیے ہیں۔

موقر جریدے 'آجکل' کے سابق مدیر راج نرائن راز کے ساتھ خورشید اکرم صاحب نے ایک طویل مضمون میں اپنے ذاتی کھٹے میٹھے مشاہدات کا حقیقی بیان کیا ہے۔

صفحہ 33 پر 'تعینات' لفظ (حالانکہ یہ غلط تصرف ہی اردو ادب میں رائج ہو چکا ہے) کی صحیح صورت بتاتے ہوئے جناب سید بدرالحسن نے قومی کونسل سے شائع اپنی مفید لسانی کتاب 'صحتِ الفاظ' میں یہ درج کیا ہے: 'تعینات'۔ یہ لفظ غلط ہے۔ صحیح 'متعیّن' ہے، یعنی 'مقرر'۔ ایک لفظ 'تعیُّنات' ہے، جو کہ 'تعیّن' کی جمع ہے''۔ (قومی کونسل برائے فروغ... ، نئی دہلی۔ چوتھی طباعت، صفحہ 142)۔ دیگر اغلاط یہ ہیں صفحہ 36 پر کہانی (کہانیاں) رکھتے کیا (کہا) پارکھ (پارکھی) وغیرہ۔ ویسے اس مصنف نے مکمل ذہانت کے ساتھ سوانحی انداز میں ایک ناول نگار کی تمام تر صلاحیت سے مملو مضمون تحریر کیا ہے۔

جناب محمد علیم نے بھی عظیم گلوکار و گیتاوت کے سوانحی کوائف و گیتوں سے مملو ایک وقیع مقالہ پیش کیا ہے، فقط گیتوں کے مشہور بولوں کے حوالوں کا فقدان ضرور رہا ہے۔

اس بار بموجب مدیر 'نیا آسماں نئے ستارے' عنوان کے تحت جو مواد پیش ہوا ہے، وہ لائق صد ستائش و خیر مقدم ٹھہرتا ہے۔ اول بار سعد مشتاق حمیری صاحب نے اپنے مضمون میں بالخصوص مولانا حالی، علامہ شبلی نعمانی اور امداد امام اثر ان تینوں علما و فضلا کی تنقید کے تین زاویوں کا جو شاندار موازنہ کیا ہے، وہ بھی قابل مدح ہے۔

کرشن بھاوک: کوٹھی نمبر A-201، گورونانک نگر، پٹیالہ، پنجاب

'اردو دنیا' جنوری 2016 کا شمارہ موصول ہوا۔ 'ہماری بات' کے تحت جناب پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم) نے نوجوان تخلیق کاروں کو سامنے لانے کے لیے 'نیا آسماں، نئے ستارے' جیسا سلسلہ شروع کرنے کی نوید دی ہے، قابل ستائش ہے۔ امید ہے کہ اگر اس طرح نئے لکھنے والوں کی سرپرستی کی گئی تو اردو کا چمن مہک اٹھے گا۔ اپنے مضمون 'ادبی تحقیق کے تقاضے' میں شمس الرحمٰن فاروقی کا

ولی محمد ملک الشعرا کی دہلی آمد کے متعلق موقف مضبوط دکھائی دیتا ہے اور ان کا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ ''آج ہماری زبان پر کڑا وقت ہے اور اس کی وجہ سیاسی یا سماجی نہیں بلکہ خود ہم لوگوں کی سہل انگاری اور ہم میں غور و فکر کی کمی ہے۔ پرویز اشرفی نے جس طرح بشیر مالیر کوٹلوی سے اپنے مضمون میں تعارف کرایا اس سے ان کی تخلیقات پڑھنے کا اشتیاق پیدا ہوا۔ یہ سلسلہ بہت اچھا ہے اور اس طرح کے ادیبوں کو سامنے لایا جانا چاہیے۔ ہمانشو شیکھر نے ظفر پیامی کے ناول 'فرار' کے کرداروں کا جس باریک بینی سے پوسٹ مارٹم کیا ہے وہ ناول نگاری میں ظفر پیامی کے حد درجہ حساس اور غیر مصلحت پسند رویے کی نشاندہی کرتا ہے۔ محقق و ادیب دانشور مولانا عبدالسلام خان پر ابوزر عبدالاحد فرقانی کا مضمون بے حد معلوماتی رہا اور اقبال و رومی کے حوالے سے کئی نئی باتوں کی خبر لایا۔ راج نرائن راز کی شخصیت اور 'آجکل' سے ان کے تعلق کے حوالے سے خورشید اکرم کے مضمون میں راج نرائن راز سے منسوب ہندو مسلم یگانگت و یکجہتی اور گنگا جمنی تہذیب و ثقافت کی بات کی گئی ہے اسے فروغ دینے کی آج بھی اشد ضرورت ہے۔ 'صحافتی زبان کے مسائل' پر سلیم شہزاد نے جس طرح قلم اٹھایا اور مسائل کی نشاندہی کی ہے وہ قابل توجہ ہے اور میرے خیال میں اردو صحافت سے منسلک احباب کو اس طرف توجہ دینی چاہیے۔ انھوں نے ظ انصاری کے اداریے کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ ''بی بی سی لندن والے ہندی کو ہندوستان سے اور اردو کو پاکستان سے نتھی کیے بغیر نہیں جانتے۔'' ظ انصاری کا یہ کہنا بجا ہے لیکن بی بی سی والوں کو کون سمجھائے کہ بھائی فورٹ ولیم کالج کی متعصب لسانی سیاست کو اب ختم ہونا چاہیے۔ 'کتاب نما' کے خواجہ احمد فاروقی نمبر پر غلام نبی کمار کا تبصرہ بڑا جامع اور مدلل ہونے کی وجہ سے 'اردو دنیا' کے اس متذکرہ شمارے میں اہمیت رکھتا ہے اور اس طرح 'اردو تنقید سہ زاویے' اور 'جنوبی ہند کا موجودہ ادبی منظرنامہ' دونوں ہی بہت معلوماتی مضامین ہیں۔ اردو کی نئی کتابوں پر تبصرے ان کتابوں اور ان کے مصنفین کو متعارف کرانے کا بہترین ذریعہ ہیں اور اس سے اردو کے حلقے کی وسعت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے اور یہ دیکھا جا سکتا ہے کہ سماج میں کن موضوعات کو کیسے سامنے لایا جا رہا ہے۔ یہ صورت حال اردو کی نئی بستیوں اور اردو زبان و ادب کے حوالے ہندوستانی علاقائی و عالمی سرگرمیوں کے متعلق خبروں کی اشاعت سے سامنے آتی ہے۔ الغرض کہ یہ شمارہ اپنے اندر وہ سبھی مواد رکھتا ہے جو عین عصری تقاضوں کے تحت قارئین کو میسر ہونا چاہیے۔

نصیر ملک : کوپن ہیگن، ڈنمارک

'اردو دنیا' کا تازہ شمارہ اپنے نئے رنگ و روپ میں زیادہ خوبصورت اور بامعنی لگا۔ مشمولات میں اردو کی جدید نسل کا نمائندہ نقاد و محقق آفاق عالم صدیقی کا مضمون 'جنوبی ہند میں اردو ادب کا منظرنامہ' خاص اہمیت کا حامل ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے جنوبی ہندوستان کی تمام ریاستوں میں اردو شعر و ادب کی صورت حال کا محاسبہ و محاکمہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس طرح کے موضوعات پر مضامین قلم بند کرنے کے لیے سب سے پہلے مضمون نگار کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ اپنے موضوع کی حدود متعین کرے پھر مواد کی مناسبت سے درجہ بندی ضروری ہوتی ہے۔ اس سے قاری تک مواد کی واضح انداز میں ترسیل کے امکانات زیادہ روشن ہوتے ہیں اور موضوع سے متعلق اہم مواد کے شامل نہیں ہونے پر احتمال بھی کم رہتا ہے۔ ڈاکٹر آفاق عالم کے اس مضمون میں قلم کاروں کے اسمائے گرامی، ان کی کتابوں اور شہروں کے ناموں کا اتنا بکھراؤ ہے کہ پتہ ہی نہیں چل پاتا کہ کس ریاست سے یا پھر کس صنف سے ان کا تعلق ہے۔ کم از کم ایسا کیا جا سکتا تھا کہ ہر ریاست کے قلم کاروں کا ذکر الگ الگ کیا جاتا یا پھر اصناف کے اعتبار سے ان ریاستوں کے قلم کاروں کی خدمات کا جائزہ لیا جا سکتا تھا۔ لیکن آفاق عالم صدیقی نے اپنی یادداشت میں موجود ادبا و شعرا سے متعلق آدھی ادھوری معلومات کو نہایت بے ترتیبی سے مضمون کی شکل میں پیش کیا ہے۔ جس کے نتیجے میں مذکورہ مضمون میں، مضمون کے لیے درکار جامعیت اور سلیقگی کا شدید فقدان نظر آتا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس مختصر سے مضمون میں جہاں کئی قلم کاروں کا ذکر ایک سے زائد بار کیا گیا ہے وہیں ان ریاستوں کے کئی اہم قلم کاروں کے نام شامل ہونے سے رہ گئے ہیں۔ حتیٰ کہ کئی واقعاتی غلطیاں بھی مضمون میں در آئی ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ہر مضمون نگار کی اپنی پسند ناپسند اور اپنی ترجیحات ہوتی ہیں۔ لیکن ادبی دیانت داری بھی ضروری ہے۔

کم از کم ان قلم کاروں کا احاطہ کیا جاتا جن کی قومی سطح پر شناخت قائم ہے، تو بات پھر بھی قابل قبول ہوتی۔ ایسے ناموں میں چند نام جو ذہن میں فی الحال آ رہے ہیں ان میں یوسف رحیم میر بیدری، ڈاکٹر داؤد محسن، حامد اکمل، نورالدین نور، مظہر محی الدین وغیرہ اہم ہیں۔ یہ تمام نہ صرف صاحب تصنیف قلم کار ہیں بلکہ مختلف اصناف میں اپنی پہچان رکھتے ہیں۔ اس طرح کے تسامح مضمون کے اعتبار کو ختم کرتے ہیں۔

قاضی انور: مقابل رحیم مسجد، مکہ کالونی محبوب نگر، گلبرگہ، کرناٹک

قومی کونسل کی طرف سے ماہنامہ 'اردو دنیا' اور 'بچوں کی دنیا' ہر ماہ مل رہے ہیں۔ اس لیے آپ کا شکر گزار ہیں۔ ان دونوں رسالوں کے مضامین معیاری ہوتے ہیں جس سے ہمیں بہت فائدہ ہو رہا ہے۔

محمد غلام ربانی: پروفیسر، شعبہ اردو ڈھاکہ یونیورسٹی، بنگلہ دیش

پروفیسر ارتضیٰ کریم صاحب بڑے ہی حوصلہ و عزم کا مظاہرہ کرتے ہوئے برابر نئے کالم کا آغاز کرتے رہتے ہیں۔ اس ماہ جنوری 2017 سے 'نیا آسماں نئے ستارے' نئے کالم کا آغاز کیا ہے جس میں اردو کی تنقید نگاری کے اہم پہلوؤں کو جناب سعد مشتاق حصیری نے اپنے مضمون 'اردو تنقید سہ زاویے' میں حالی کی تنقید کا اصل محور تخیل، مطالعۂ کائنات، غزلوں کی اصلاح، قصیدے و مرثیے کی توضیح، مثنوی کی خوبیوں کی نشاندہی کی ہے جو قابل ستائش ہے۔

اسی جنوری 2017 کے شمارہ میں بیکل اتساہی کی رحلت کی خبر سے کاروان اردو ادب کا ایک اور قندیل گل ہو گیا، امتیاز رومی نے اپنے مضمون 'اتساہت بیکل' کے ذریعے خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا، یہ عظیم شاعر اپنے کلام کو ہزار ہا خوشبوؤں سے معطر کرنے والا اپنی تخلیق کردہ غزلوں، نظموں و گیتوں کے ذریعے ہمیشہ زندہ رہے گا۔ اس طرح تحقیقی و معلوماتی مضامین کے ذریعے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان ماہنامہ 'اردو دنیا' اردو ادب کی خدمت کر رہی ہے۔

کشور حنا حسینی گوڑا، اسٹریٹ نمبر 8، حیدرآباد

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی جانب سے رئیس ہائی اسکول بھیونڈی مہاراشٹر کے وسیع و عریض میدان میں اردو کتاب میلہ نے بے مثال تاریخ رقم کی ہے جس کی پذیرائی اردو حلقے میں خوب ہو رہی ہے۔ راقم الحروف اپنی ساس کے کینسر کے علاج کے سلسلے میں ممبئی گیا ہوا تھا۔ میرے دوست 'چترکاریتا کوش' کے ایڈیٹر اور نامور صحافی آفتاب عالم نے دوران گفتگو بھیونڈی کتاب میلہ کا ذکر کیا۔ مجھے بے حد خوشی ہوئی اور میں نے اسی وقت فیصلہ کیا کہ میں ضرور اس میلہ میں شرکت کروں گا۔ علاج میں مصروف ہونے کے باوجود بھی وقت نکال کر گورے گاؤں سے بھیونڈی پہنچا۔ میلہ کا نظارہ دیکھ مجھے احساس ہونے لگا کہ اردو زبان واقعی زندہ زبان ہے اس کی شیرینی واقعی سر چڑھ کر بول رہی ہے۔ اردو کتاب میلہ میں ادب، سائنس، کمپیوٹر، اسلامیات کے علاوہ دیگر شعبہ کی نادر و نایاب کتابیں اسٹال پر دستیاب تھیں، تمام اسٹال پر لوگوں کا جم غفیر تھا، خواتین برقعہ میں بڑی تعداد میں کتابیں خریداری کرتی ہوئی نظر آئیں۔ دیکھ کر ظاہر ہوا کہ مہاراشٹر اردو کی ترویج و اشاعت کا مسکن ہے اور بے حد خوشی کی بات یہ ہے کہ یہاں کے اردو کتاب میلے میں ایک کروڑ بارہ لاکھ کی اردو کتابیں فروخت ہوئیں۔

قمر احسان: کاشانہ امان، غنی چک، بھاگلپور سٹی، بہار

افتخار امام صدیقی

قاری اب بھی زندہ ہے

گفتگو اگر مستعار تھیوریز، ترقی پسندی، جدیدیت، مابعد جدیدیت کے حوالے سے کی جائے تو شاید غلط نہ ہوگا کہ وہ قاری جو کہ ترقی پسند ادب سے وابستہ تھا، جدیدیوں نے مسترد کر دیا اور اعلان کر دیا کہ ہمارا قاری مر چکا ہے۔ لیکن قاری پھر بھی زندہ رہا اس کا ثبوت 17 دسمبر 2016 تا 25 دسمبر کو بھیونڈی کے اردو کتاب میلے میں خوش آئند مناظر میں اپنی نوعیت کا یہ انوکھا کتاب میلہ تھا کہ جوق در جوق قارئین نے اپنی پسندیدہ کتابیں خریدیں۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق اس کتاب میلے میں ایک کروڑ 18 لاکھ روپے کی کتابیں فروخت ہوئیں۔ یہ کتاب میلہ کوکن مسلم ایجوکیشن سوسائٹی کے صدر اسلم فقیہ اور پرنسپل ضیاء الرحمٰن انصاری کی بھرپور دلچسپی اور کتاب میلے کے کنوینر امتیاز خلیل 0932004081 کی انتھک کوششوں کا ثمرہ ہے۔

اس کتاب میلے میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر ارتضیٰ کریم 0991007493 نے بھی اپنا عملی تعاون دیا۔ شروع سے آخر تک کامیابی سے ہم کنار کتاب میلے میں روزانہ ثقافتی پروگرام قارئین کی دلچسپی کا سبب ہوئے بالخصوص مشاعرہ جس میں کثیر تعداد طلبہ وطالبات کی تھی۔

کتاب میلے کے منتظمین کی اسٹال کے کتب فروشوں نے کھل کر تعریف کی۔ خاص کر انتظامیہ کی کرنسی کے اس بحرانی دور میں انھوں نے کھلے پیسوں کا ہر اسٹال کے لیے خاطر خواہ انتظام کیا۔ ہم بلا مبالغہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ بھیونڈی میں ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس جو ہمیشہ یاد کی جاتی ہے کہ یہ کتاب میلہ دوسرا اہم واقعہ ہے۔ جو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ جس طرح، واضح رہے کہ دو، تین سال قبل ماہنامہ 'شاعر' نے ہر شمارے میں کتاب بازار کا ایک باب شروع کیا تھا جس میں نئے کتب ورسائل کی مربوط معلومات دی جاتی تھیں۔ یہ کتاب بازار اس طرح مقبول ہوا کہ اب دیگر ادبی رسائل بھی شاعر کی نقل کر رہے ہیں۔ اس کتاب بازار کی اشاعت سے کتب ورسائل کی فروخت میں افزوں اضافہ ہوا۔ بھیونڈی نے کتاب میلہ کے لیے جو فضابندی کی اس کے لیے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں کہ دس روز تک صنعتی شہر بھیونڈی کتاب میلہ میں رچ بس گیا تھا کسی کے وہم وگمان میں نہیں تھا کہ اس بحرانی دور میں یہ میلہ اتنا کامیاب ہوگا۔ وسوسوں اندیشوں کے درمیان منعقد ہونے والے کتاب میلے کے انعقاد کے لیے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر کی مساعی جمیلہ کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ اس کتاب میلے میں ادبی رسائل کا ایک بھی اسٹال نہیں تھا۔ ویسے سبھوں کو مدعو کیا گیا تھا۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر سے ادارۂ شاعر کی چند ایک تجاویز بھی ہیں کہ کل ہند سطح کی اردو اکادمیاں ادبی رسائل میلہ منعقد کریں اور اس تحریک کو اس طرح فعال کریں کہ اس سے ادبی رسائل کو بقا حاصل ہو سکے بالخصوص جو ذاتی نوعیت کے ہیں۔

یہاں یہ ذکر ضروری ہوگا کہ کیا قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے ادبی رسائل کے لیے کوئی جامع پیش رفت کی ہے یا کوئی منظم لائحہ عمل ترتیب دیا ہے۔ ادبی رسائل کی 100 کاپیاں خرید لینے سے اور سال میں ایک دو اشتہار دے دینے سے ادبی رسائل کے مسائل حل نہیں ہوتے (کئی سال سے شاعر کو ایک بھی اشتہار نہیں دیا گیا ہے)۔

آج ادبی رسائل کی چہل پہل ہے۔ ماہنامے، دو ماہی، سہ ماہی، کتابی سلسلے ہر گلی کوچے سے شائع ہو رہے ہیں۔ ان کے قاری نامعلوم، ان کی تعداد اشاعت نامعلوم۔ قدیم اور معتبر جرائد اپنے مسائل سے جوجھ رہے ہیں۔ اپنے رسائل کو زندہ رکھنے کے لیے مثبت اور اچھے طریقے ڈھونڈ رہے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ قاری ہے کہاں؟ روز وشب رنگ بدلتی دنیا، جدید ٹیکنالوجی کے بڑھتے اثرات، ٹی وی، انٹرنیٹ ویب سائٹ، موبائل، فیس بک، اتنا سب کچھ ہوتے ہوئے قاری کے پاس وقت ہے کہاں؟ دنیا سمٹ کر انگلی پر آ گئی ہے، وہی ادبی وہی تخلیق کار، ماضی میں اردو طلبا وطالبات کی تربیت کے طور طریقے کچھ اور ہی ہوا کرتے تھے۔ اساتذہ اپنے طلبا کو مطالعے کی طرف راغب کرتے تھے۔ ادبی رسائل سے متعارف کرواتے تھے اور انھیں خریدنے یا خریدار بننے کی ترغیب دیتے تھے۔ ہمارے علم میں ہے کہ ماضی کے اساتذہ کالج اور یونیورسٹی کی سطح پر پڑھانے اور تربیت دینے کے ساتھ ساتھ ادبی رسائل کی خریداری کی شرط بھی لگا دیتے تھے۔ ان ہی اساتذہ کی تربیت سے آج اردو ادب میں سیکڑوں چاند ستارے جگمگا رہے ہیں۔ کیا آج یہ ممکن نہیں ہو سکتا۔ خود ہمارے اردو کے اساتذہ اردو کے رسائل کا مطالعہ نہیں کرتے۔ وہ کیا اپنے طلبا کو مطالعے کی ترغیب دیں گے؟ آج اساتذہ ادبی رسائل کی بقا میں اہم رول ادا کر سکتے ہیں۔ بس پہل کی ضرورت ہے۔

'قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان' کے ڈائرکٹر ارتضیٰ کریم سے ہماری درخواست ہے کہ جو ادبی رسائل 50-40 سال سے نکل رہے ہیں جن کی سانسیں اکھڑنے لگی ہیں ان کے لیے بھی کوئی جامع منصوبہ ترتیب دے کر ان کی زندگی کو ایک نئی روح عطا کریں کہ خود ان کا راست تعلق اردو ادب واردو رسائل سے ہے۔

بھیونڈی کا کتاب میلہ گواہی دے رہا ہے کہ اردو کا قاری ابھی مرا نہیں ہے پھر بھی آیئے آپ اور ہم مل کر اردو قارئین تلاش کریں۔

بشکریہ ماہنامہ 'شاعر' دسمبر 2016

آج اردو انتہائی دشواریوں کے باوجود زندہ ہے اور ترقی کی راہ پر گامزن ہے

نند کشور وکرم

محمد عارف اقبال

راولپنڈی (موجودہ پاکستان) سے تعلق رکھنے والے معروف افسانہ و ناول نگار، صحافی و ادیب جناب نند کشور وکرم (پ: 17 ستمبر 1929) کا تخلیقی دور تقریباً 6 دہائیوں کو محیط ہے۔ پنجاب یونیورسٹی سے اردو میں اور دہلی یونیورسٹی سے فارسی میں ایم اے کی ڈگریاں حاصل کیں۔ پبلی کیشنز ڈویژن (حکومت ہند) کے تاریخی ادبی ماہنامہ 'آج کل' کی ادارت سے تقریباً 15 سال وابستہ رہنے کے بعد پریس انفارمیشن بیورو (P.I.B.) سے 1987 میں سبکدوش ہوئے۔ صحافت سے 1949 ہی میں وابستہ ہوئے جبکہ پنڈت میلارام کی ادارت میں شائع ہونے والے اخبارات 'قومی اخبار' اور 'امرت' سے پیشہ ورانہ طور پر منسلک ہوگئے۔ پہلا افسانہ تقسیم ہند کے چند ماہ بعد ہی 'ادیب' کے عنوان سے ماہنامہ 'نرالا' نئی دہلی میں شائع ہوا تھا۔ انہوں نے اپنا پہلا ناول 'یادوں کا کھنڈر' 1954 میں لکھا تھا۔ نندکشور وکرم نے دو درجن سے زائد اردو ادیبوں کی تخلیقات کو ہندی و دیگر زبانوں میں منتقل کیا جن میں غالب، علی سردار جعفری، علی عباس حسینی، کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، غلام عباس، احمد ندیم قاسمی، قرۃ العین حیدر، حبیب جالب، ساحر لدھیانوی وغیرہ شامل ہیں۔ 'عالمی اردو ادب' کے مدیر اعلیٰ نند کشور وکرم نے ہند و پاک کی اہم ادبی شخصیات پر وقیع نمبر کی اشاعت کی۔ ان کی اہم کتابوں میں یادوں کے کھنڈر (ہندی، اردو ناول)، غالب: حیات و شاعری، محمد حسین آزاد، آوارہ گرد (افسانوں کا مجموعہ)، آدھا سچ (افسانوں کا مجموعہ)، انیسواں ادھیائے (تجزیاتی ناول) خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ فرانس، برطانیہ، امریکہ، کناڈا، نیپال اور متحدہ عرب امارات کی سیاحت کرنے والے نندکشور وکرم کو ملک کی مختلف اکادمیوں سے ایوارڈز و اعزازات کے علاوہ حال ہی میں دوحہ (قطر) کے اردو مرکز کی طرف سے ڈیڑھ لاکھ کے ایوارڈ سے نوازہ گیا۔ پیش ہیں ان سے لیے گئے انٹرویو کے اقتباسات:

محمد عارف اقبال: آپ کا شمار اردو کے عاشقوں میں ہوتا ہے اور آپ کی ادبی خدمات کے حوالے سے ایک پاکستانی مجلہ 'چہارسُو' کا خصوصی نمبر بھی شائع ہوا۔ کیا آپ محسوس کرتے ہیں کہ ہندوستان میں اردو اب صرف مسلمانوں کی زبان بن کر رہ گئی ہے؟

نند کشور وکرم: مجھے اُردو کے عاشقوں میں شمار کرنے کا شکریہ۔ میں نے اُردو میں لکھنے لکھانے کی شروعات بٹوارے کے فوراً بعد کی اور میری پہلی مختصر کہانی 'ادیب' نرالا نئی دہلی میں شائع ہوئی تھی اور اب مجھے اس میدان میں ستر سال کے قریب ہوگئے ہیں۔ لیکن مجھ پر صرف پاکستانی مجلہ 'چہارسُو' نے ہی خاص گوشہ شائع نہیں کیا بلکہ کراچی سے شائع ہونے والے سہ ماہی رسالہ 'روشنائی' نے بھی خصوصی گوشہ چھاپا تھا۔ علاوہ ازیں ہندوستان میں بھوپال کے معروف سہ ماہی 'کاروانِ ادب' نے بھی ایک مختصر سا گوشہ شائع کیا تھا نیز دہلی سے مرحوم بشیر احمد کے زیرِ ادارت شائع ہونے والے ماہنامہ 'مکالمات' کا پورا شمارہ میری ادبی خدمات کے لیے وقف کیا گیا تھا۔

اس میں کوئی شک کی بات نہیں کہ دھیرے دھیرے اُردو مسلمانوں تک محدود ہو کر رہ گئی ہے اور اس کی کئی وجوہ ہیں۔ سب سے پہلی یہ کہ بٹوارے کے ساتھ ہی پاکستان نے اُردو کو سرکاری زبان بنانے کا اعلان کردیا اور ہندوستان نے ہندی کو۔ اس سے ہندوستان کے عام طبقے نے اسے پاکستانی زبان سمجھ لیا۔ اُن دنوں ہم اُردو میں لکھتے ضرور تھے مگر ہمیں اس کا مستقبل مخدوش نظر آتا تھا اور سبھی اردو والوں کا خیال تھا کہ یہ زبان بس پندرہ بیس سال ہی چل پائے گی مگر خوشی کی بات ہے کہ ساری پیشین گوئیاں غلط ثابت ہوئیں اور آج اردو اپنے بل بوتے پر انتہائی دشواریوں کے باوجود زندہ ہے اور ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔ تقسیم سے پیشتر اُردو میں کوئی نوے (90) کے قریب اُردو اخبار نکلتے تھے جن میں اس علاقے کے اخبار بھی شامل تھے جو اب ''مملکتِ خداداد پاکستان کہلاتا'' ہے۔ لیکن آج ہندوستان میں اخبارات ورسائل کی تعداد دس گنا زیادہ ہوگئی ہے۔ رجسٹرار آف نیوز پیپرز آف انڈیا کی 15-2014 کی رپورٹ کے مطابق اس

وقت ملک میں 1121 روزنامے شائع ہورہے ہیں اور اخبارات و رسائل کی مجموعی تعداد 1661 ہے (جس میں سہ روزہ۔ ایک، ہفتہ وار۔ 394، پندرہ روزہ۔ 82، ماہنامے۔ 52، سہ ماہی۔ 9 اور دیگر 2 رسالے شامل ہیں) اور سرکولیشن 3,32,55696 تک پہنچ گئی ہے۔ ملک کی لگ بھگ 80 کے قریب یونیورسٹیوں میں اُردو پڑھائی جاتی ہے۔ تقسیم سے پیشتر چند حضرات ہی اُردو میں پی ایچ ڈی تھے جبکہ آج ان کی تعداد پانچ ہزار سے زائد ہی ہوگی۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ان میں ہندوؤں کی تعداد کم ہوتی جارہی ہے اور اس وقت کوئی تین درجن کے قریب ہندو ادبا و شعرا باقی رہ گئے ہیں جو آئندہ دس برس میں شاید نہیں رہیں گے اور پھر رہی سہی کسر بھی پوری ہوجائے گی اور اگر اسی طرح معاملہ چلتا رہا تو اُردو صرف مسلمانوں کی زبان بن کر رہ جائے گی اور اگر کوئی اُردو والا ہندو، شعر و ادب میں وارد ہوگا تو اس میں بھی زیادہ تر کا تعلق جموں و کشمیر سے ہوگا کیونکہ وہاں کی سرکاری زبان اُردو ہے۔

م ع ا: آپ کی جائے پیدائش راولپنڈی (موجودہ پاکستان) ہے۔ اپنی 'جنم بھومی' کو چھوڑ کر کن حالات میں ہندوستان آئے؟

نند کشور وکرم: مجبوری میں۔ اور یہ کہانی تو برصغیر کے لاکھوں افراد کی ہے جنھیں عالمِ مجبوری میں اپنی جنم بھومی سے نکلنا پڑا۔ یہ وہ دَور تھا جب برصغیر میں خون کی ایسی ہولی کھیلی جارہی تھی کہ لوگ محفوظ جگہ پناہ چاہتے تھے۔ مگر شاید آپ کو یہ معلوم نہ ہو کہ اہلِ پنجاب نے ہجرت نہیں کی بلکہ پنجاب میں تقسیم کے بعد تبادلۂ آبادی ہوا تھا، بڑی باقاعدگی سے۔ مغربی پنجاب کے ہندوؤں کو مشرقی پنجاب میں منتقل کیا گیا اور مشرقی پنجاب کے مسلمانوں کو مغربی پنجاب میں۔ اور تبادلہ آبادی کے تحت انھیں باقاعدہ ضلعے اور تحصیلیں اور شہر تک الاٹ کیے گئے اور اس فیصلے کے تحت کسی کو اپنے مولد، اپنے وطن، اپنی جنم بھومی میں نہیں رہنے دیا گیا بلکہ زبردستی انھیں پولیس اور فوج کی مدد سے اپنے گھروں سے لاریوں ٹرکوں میں بھر کر رخصت کیا گیا۔ اور پنجاب کے دونوں حصوں کی اقلیت کو کوچ کرنا پڑا۔

ہمارے ضلع راولپنڈی کے لوگوں کو ضلع انبالہ الاٹ ہوا تھا۔ اس کے تحت میرے والد نے جو کہ ڈی سی آفس میں ملازم تھے، وہاں سے آتے ہی انبالہ کے ڈی سی آفس میں ڈیوٹی جوائن کرلی تھی۔ ہمیں زمینیں بھی انبالہ کی تحصیل جگادھری میں الاٹ ہوئی تھیں۔

م ع ا: اردو زبان سے آپ کا گھرانہ کس طرح متاثر ہوا؟ کیا آپ کے والدین (شری رام لال دت، شری متی گومتی دت) 'حسینی برہمن' تھے؟ اس کی حقیقت کیا ہے؟

نند کشور وکرم: تقسیم سے پیشتر سارا کام اُردو میں ہی ہوتا تھا۔ لہٰذا روزگار سے وابستہ ہونے کے کارن اس کی تعلیم لازمی تھی۔ پنجاب کے تمام ڈسٹرکٹ بورڈ اسکولوں میں صرف اُردو ہی پڑھائی جاتی تھی۔ ہاں شہروں اور بڑے قصبوں میں سناتن دھرم اسکول، ڈی اے وی اسکول اور خالصہ اسکول پائے جاتے تھے جہاں ہندی اور گورمکھی پڑھائی جاتی تھی۔ اس لیے اُردو سے متاثر ہونا لازمی بات تھی۔ میرے والد نے سناتن دھرم ہائی اسکول

سے 1922 میں میٹرک پاس کی تھی اور اس وقت تک وہ صرف ہندی ہی جانتے تھے، بعدازاں جب انھیں کچہری میں ملازمت کرنی پڑی تو انھوں نے مجبوراً اُردو سیکھی۔ اور ایسی سیکھی کہ ہندی کو بھول ہی گئے اور صرف اُردو میں خط وکتابت کرتے رہے اور انھوں نے اپنی ڈائری بھی اُردو میں ہی لکھی تھی۔ باقی رہا میرا سوال۔ مَیں نے بھی پہلی جماعت کی ابتدا ہندی سے کی تھی مگر پھر میرے والد کا تبادلہ گوجرخان ہوگیا اور وہاں سناتن اسکول میں داخلہ لینا پڑا لیکن عجیب بات ہے کہ سناتن دھرم اسکول ہونے کے باوجود وہاں ہندی نہیں بلکہ اُردو پڑھائی جاتی تھی۔ لہٰذا مجھے اُردو سے شروعات کرنے کے لیے پہلی جماعت میں داخلہ لینا پڑا اور اس کے بعد مَیں نے اُردو اور فارسی ہی پڑھی۔

جہاں تک ہمارے حسینی برہمن ہونے کا سوال ہے، ہم ہی نہیں سبھی ''دت'' برادری کے افراد یعنی سنیل دت، صابر دت وغیرہ سبھی حسینی برہمن کہلاتے تھے۔ دراصل ہم لوگ موہیال براہمن ہیں جو دت، بالی، چھبر، موہن وید، لو اور بھمبوال سات ذیلی ذاتوں پر مشتمل ہیں۔

ہماری گھٹی میں یہ بات ڈالی جاتی ہے کہ ہم 'حسینی برہمن' ہیں اور یہ کہ ہم نے کربلا کے میدان میں حضرت حسین کا ساتھ دیا تھا جس کی وجہ سے ہمیں عرب ممالک سے نکال دیا گیا، یا ہم خود اسے الوداع کہہ کر افغانستان اور پنجاب، کشمیر میں آبسے۔ اس بارے میں بہت سے مسلم پنجابی شاعروں نے حوالے بھی دیے ہیں اور اس بارے میں کئی مضامین بھی لکھے گئے ہیں۔ لیکن یہ روایات تک ہی محدود ہے اس کی تاریخی حیثیت کیا ہے، مَیں وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ تاریخی طور پر یہ تحقیق طلب معاملہ ہے۔

م ع ا: اردو ذریعہ تعلیم رہی لیکن مادری زبان پنجابی (پوٹھواری) ہوتے ہوئے آپ نے اردو میں کیا کشش محسوس کی کہ اپنی تخلیقات کے لیے اسے ہی پسند کیا؟

نند کشور وکرم: جیسا کہ مَیں پہلے کہہ چکا ہوں متحدہ پنجاب میں سارا سرکاری اور غیر سرکاری کام اُردو میں ہوتا تھا۔ مقامی زبانیں اپنے علاقے تک ہی محدود تھیں۔ پنجابی اور ہندی میں کچھ رسائل و جرائد ضرور شائع ہوتے تھے مگر اُردو کے مقابلے میں ان کی تعداد بہت کم تھی۔ مَیں تو شروع سے ہی اُردو سے جڑا رہا اور ابتدا سے ہی اُردو رسائل و جرائد کا مطالعہ کرتا رہا۔ لہٰذا اسی زبان میں لکھنا بھی شروع کیا۔

م ع ا: تخلیقی ادب میں آپ کا سفر افسانہ نگاری سے شروع ہوا جو تقریباً سات دہائیوں کو محیط ہے۔ 1960 میں آپ نے اپنا پہلا ناول 'یادوں کے کھنڈر' لکھا۔ ایسا لگتا ہے کہ فکشن آپ کا محبوب موضوع ہے۔ آپ نے اپنی زندگی میں فکشن کو اتنی اہمیت کیوں دی؟

نند کشور وکرم: مَیں نے پہلا ناول 'یادوں کے کھنڈر' بٹوارے کے کچھ سال بعد لکھا تھا اور اس کی دو تین قسطیں میرے ماہنامہ 'نئی کہانی' میں بھی شائع ہوئی تھیں۔ لیکن افسوس یہ اُردو میں شائع نہ ہوسکا۔ لہٰذا مَیں نے اس کا ہندی میں ترجمہ کیا تو 1961 کے قریب اے تو یگ پرکاشن بنگلورو دہلی نے اپنے ادارے سے چھاپ دیا۔ بعدازاں کوئی بیس سال بعد 1980 میں کسی اُردو ناشر نے نہیں بلکہ مَیں نے ہی اپنے اشاعتی ادارے ''پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز'' کے تحت اسے شائع کیا۔

ابتدائی دور میں مَیں نے بھی کہانی نویسی کے ساتھ ساتھ شاعری کی۔ مگر بعد میں شاعری ترک کردی گو کہ اب بھی کبھی کبھار کوئی شعر وارد ہو جاتا ہے لیکن کبھی باقاعدہ شاعری نہیں کی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں

آپ اپنے خیالات وجذبات کی صحیح ترجمانی نہیں کر سکتے جبکہ فکشن میں یہ بڑا آسان ہے، اور ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مجھے عروض وبحور سے بھی زیادہ واقفیت نہیں تھی۔

م ع ا: اردو کے تقریباً دو درجن ادیبوں کو آپ نے ہندی زبان میں منتقل کیا۔ قرۃ العین حیدر کے شاہ کار ناول 'آگ کا دریا' کو ہندی میں منتقل کرنے کا محرک کیا تھا؟

نندکشور وکرم: میں نے ہندی میں ایک 'اردو کہانی کار سلسلہ' کے تحت تقریباً بیس کے قریب اردو افسانہ نویسوں کو ہندی سے متعارف کرایا جس میں علی عباس حسینی، حیات اللہ انصاری، غلام عباس، احمد ندیم قاسمی، کرشن چندر، منٹو، بیدی، انتظار حسین وغیرہ شامل تھے۔ اس میں ہر کہانی نویس سے متعلق ایک مختصر مضمون، کہانی نویس کے حالات زندگی اور کچھ اُن سے متعلق مضامین کے علاوہ اُن کی ایک درجن کے قریب منتخب کہانیاں بھی شامل کی تھیں۔ پھر منٹو کے خاکوں سے متعلق ایک کتاب 'تصویریں' مرتب کی تھی۔ قرۃ العین حیدر کے ناول 'آگ کا دریا' کو ترجمہ کرنے کی دو وجوہ تھیں ایک تو یہ کہ یہ اُردو زبان کا سب سے زیادہ مشہور اور چرچت ناول ہے اور ہندی والے اسے پڑھنا چاہتے تھے۔ دوسرے اس لیے کہ اگرچہ اس ناول کے مارکیٹ میں کئی ہندی تراجم موجود تھے مگر نامکمل۔ ان میں کسی میں کچھ باب ندارد تھے تو کسی میں کچھ اضافہ کر دیا گیا تھا۔ لہٰذا میں نے قرۃ العین حیدر کے ناول کے مستند نسخے سے ترجمہ کرنے کی کوشش کی تاکہ قاری صحیح ٹیکسٹ سے محظوظ ہو سکیں اور اس کی صحیح قدر وقیمت آنک سکیں۔

م ع ا: آپ ابتدا ہی سے اشتراکی وترقی پسند فکر کے حامل رہے باوجود اس کے کہ آپ سناتن دھرم میں پیدا ہوئے۔ عمر کے اس پڑاؤ (تقریباً 87 سال) میں کیا اب بھی اسی فکر کے اسیر ہیں؟

نندکشور وکرم: دیکھیے میں کوئی اٹھارہ اُنیس سال کی عمر سے اشتراکیت اور ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہا ہوں۔ اور اب بھی میں انہی ترقی پسند اور اشتراکی نظریات کا حامل ہوں لیکن میں کسی سیاسی پارٹی کا ممبر نہیں ہوں۔ میرا سناتن دھرمی خاندان میں پیدا ہونا ایک اتفاق ہے کیونکہ اس میں میرا کوئی ہاتھ نہیں۔ میں کسی اچھوت، مسلمان یا عیسائی گھر میں بھی پیدا ہو سکتا تھا۔ اس لیے پیدائش کے لحاظ سے میرا جنم ایک سناتن دھرمی خاندان میں ہوا۔ دس سال کی عمر تک میں بھی عام بچوں کی طرح پوجا پاٹھ اور دھارمک کتابیں پڑھتا رہا۔ مگر جب میں دس سال کا تھا تو میری ماں کو دق کا مرض لاحق ہو گیا۔ میری نانی بہت ہی پکی دھارمک خیالات کی خاتون تھیں۔ وہ سمجھتی تھیں کہ پوجا پاٹھ اور ایشور کی عبادت سے سب کچھ ٹھیک ہو جاتا ہے۔ سو اُن کے کہنے پر ماں کے روبصحت ہونے کی آرزو میں میں بھی پوجا پاٹھ کرتا اور گیتا رامائن پڑھتا رہا مگر ایک سال بعد میری ماں کا انتقال ہو گیا۔ تو میں سمجھ گیا کہ پوجا پاٹھ اور عبادت سے کچھ نہیں ہوتا اور ساتھ ہی میرے ذہن میں خدا کی حیثیت پر ایک سوالیہ نشان لگ گیا اور میں ناستک بن گیا۔ اور تب سے میں کسی خدا یا ایشور کو نہیں مانتا اور میرا ایمان وایقان ہے کہ انسان نے فطری نظام کو نہ سمجھ کر خدا ایشور بھگوان کی تخلیق کی جو اس کے خیال میں اس نظام کو چلاتا ہے۔ میرے خیال میں فطرت ہی ہر تعمیر وتخریب کا منبع ہے۔

م ع ا: آپ کے پیشہ ورانہ کریئر کا آغاز صحافت سے ہوا اور تقریباً پندرہ سال ماہنامہ 'آج کل' کی ادارت سے وابستہ رہے۔ ملک میں آپ کے نزدیک اس وقت اردو ناشرین، اخبارات ورسائل کا مستقبل کیا ہے؟

نندکشور وکرم: اُردو صحافت سے میری وابستگی 1949 میں ہوئی جبکہ میں اور معروف نقاد اور افسانہ نگار دیویندر اسر نے پنجاب کے ممتاز صحافی اور ایڈیٹر میلا رام وفا کی زیر ادارت کانپور سے چھپنے والے روزناموں 'قومی اخبار' اور 'امرت' جوائن کیا اور کچھ مدت اس سے وابستہ رہے۔ مگر بعدازاں ہم نے اس سے کنارہ کشی اختیار کر لی کیونکہ وفا صاحب تنخواہ دینے میں ٹال مٹول کرتے تھے۔ تاہم ہمیں اس بات کا فخر ہے کہ ہم نے پنجاب کے نامور شاعر وصحافی میلا رام کے زیر سرپرستی صحافت کے میدان میں قدم رکھا۔ بعدازاں نومبر 1953 میں میں نے کانپور سے ماہنامہ 'نئی کہانی' نکالا جس کے پانچ چھ شمارے ہی شائع ہوئے۔ اس کے بعد میں دہلی منتقل ہو گیا اور 64 تا 1979 آجکل سے وابستہ رہا۔ پھر 1985 میں عالمی اُردو ادب کی شروعات کی اور اب تک اس کے 41 شمارے شائع ہو چکے ہیں۔

اُردو اخبارات ورسائل کا جہاں تک تعلق ہے یہ بڑی تیزی سے ترقی کی جانب رواں دواں ہیں اور شاہراہ ترقی پر گامزن ہیں مگر جہاں تک ناشرین اور کتابوں کی اشاعت کا سوال ہے، معاملہ بہت تشویشناک ہے کیونکہ اب انفرادی خریدار ختم ہو گئے ہیں اور ناشرین کا دارومدار سرکاری خریداری پر منحصر ہے۔ کسی زمانے میں کتابیں پانچ سو سے ایک ہزار تک چھپتی تھیں مگر اب ناشر دو سو اڑھائی سو کا ایڈیشن چھاپتے ہیں اور وہ بھی تمام کتابیں بیچ نہیں پاتے۔ علاوہ ازیں زیادہ تر ناشر معاوضہ بالکل نہیں دیتے بلکہ زیادہ تر ادیب اور شاعر ناشر کو اپنے پلے سے رقم دے کر اپنی کتابیں چھپواتے ہیں۔

م ع ا: پریس انفارمیشن بیورو (.P.I.B) میں سروس کرتے ہوئے آپ نے ایک مجلّہ 'عالمی اردو ادب' کا اجرا کیا جس کے کئی وقیع نمبر شائع ہوئے۔ اس کی اشاعت کرتے ہوئے اردو والوں کی طرف سے آپ کن دشواریوں کا سامنا کر رہے ہیں؟

نندکشور وکرم: پی آئی بی میں ملازمت کے دوران میں نے اس رسالے کی شروعات 'اُردو 1982' کے نام سے کی تھی مگر بعدازاں مجھے اس کا ڈیکلریشن نہیں ملا۔ لہٰذا میں نے 1985 میں عالمی اُردو ادب کا پہلا شمارہ نکالا اور مجھے اس میں کسی قسم کی مشکلات کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ لیکن اسے نکالنے سے پہلے میں اکثر رسائل کو دم توڑتے دیکھ چکا تھا خود میرا ادبی ماہنامہ 'نئی کہانی' بھی اس کا شکار ہو چکا تھا۔ لہٰذا میں نے اپنے ابتدائیہ 'پیش لفظ' میں عہد کیا تھا کہ جب تک میرا جسم اور دماغ تندرست وتوانا رہیں گے میں کسی قیمت پر اسے بند نہیں ہونے دوں گا اور اسی جذبے کے تحت اب تک 41 شمارے شائع کر چکا ہوں اور 42 واں زیر ترتیب ہے۔ اس میں میری، اُردو والوں نے اپنے شاعرانہ مزاج کے مطابق زبانی ہمت افزائی بھی

اُردو صحافت سے میری وابستگی 1949 میں ہوئی جبکہ میں اور معروف نقاد اور افسانہ نگار دیویندر اسر نے پنجاب کے ممتاز صحافی اور ایڈیٹر میلا رام وفا کی زیر ادارت کانپور سے چھپنے والے روزناموں 'قومی اخبار' اور 'امرت' جوائن کیا اور کچھ مدت اس سے وابستہ رہے۔ مگر بعدازاں ہم نے اس سے کنارہ کشی اختیار کر لی کیونکہ وفا صاحب تنخواہ دینے میں ٹال مٹول کرتے تھے۔ تاہم ہمیں اس بات کا فخر ہے کہ ہم نے پنجاب کے نامور شاعر و صحافی میلا رام کے زیر سرپرستی صحافت کے میدان میں قدم رکھا۔ بعد ازاں نومبر 1953 میں میں نے کانپور سے ماہنامہ 'نئی کہانی' نکالا جس کے پانچ چھ شمارے ہی شائع ہوئے۔ اس کے بعد میں دہلی منتقل ہو گیا اور 64 تا 1979 آجکل سے وابستہ رہا پھر 1985 میں عالمی اُردو ادب کی شروعات کی اور اب تک اس کے 41 شمارے شائع ہو چکے ہیں۔

کی ہے لیکن رسالہ خریدنے کی زحمت نہیں کی۔ ہاں ہر کوئی مفت میں رسالہ حاصل کرنے کا متمنی ضرور رہتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک بار عالمی اُردو کی صرف 37 جلدیں بکیں مگر مَیں نے پھر بھی ہمت نہیں ہاری اور اس کا چھاپنا جاری رکھا۔ ہاں مجھے ابتدا میں 'ماہنامہ شمع' کے یونس دہلوی صاحب نے تین چار شماروں میں شمع کا اشتہار بھی دیا تھا حالانکہ شمع کو ایڈورٹائزمنٹ کی کوئی ضرورت نہیں تھی اور نہ انھوں نے کبھی کسی رسالے کو ایڈورٹائزمنٹ دی تھی۔

ویسے یہ مجلّہ نکالنے سے پہلے مَیں نے بہت غور و خوض کیا کہ کیسے اسے دوسرے رسائل سے الگ تھلگ رکھا جائے۔ اُس وقت پبلی کیشنز ڈویژن سے انگریزی اور ہندی میں چھپنے والا 'انڈیا' میرے ذہن میں تھا جو ہر سال ملک کی ترقی و فروغ سے متعلق معلومات فراہم کرتا ہے۔ لہٰذا میں نے اسی طرح کا ادبی حوالہ جاتی مجلّہ نکالنے کا پروگرام بنایا اور اس میں عام رسائل سے ہٹ کر روش اختیار کی۔ سب سے پہلے تو مَیں نے اسے مجلد شکل میں پیش کیا تاکہ مجلد کتابی صورت میں ہونے کی وجہ سے لائبریریوں میں محفوظ رکھا جا سکے۔ پھر مَیں نے اس میں ادبا و شعرا کو فہرست میں حروف تہجی کے لحاظ سے جگہ دی تاکہ چھوٹے بڑے کی تخصیص ختم ہو جائے کیونکہ مَیں نے اپنے تجربے سے محسوس کیا تھا کہ اکثر شاعر اور ادیب ایڈیٹر سے ناراض ہو جاتے ہیں کہ انھیں فلاں ادیب سے بعد میں جگہ کیوں دی گئی ہے حالانکہ اُن کا ادبی مقام اُس سے بہت اُونچا ہے۔ پھر مَیں نے 1982 میں پہلی بار قارئین کو 'وفیات' کے سلسلے سے متعارف کرایا۔ اس سے پہلے کوئی رسالہ وفیات نہیں چھاپتا تھا۔ اسی طرح سال بھر میں شائع کتابوں کی فہرست پیش کی جو اس سے پہلے کسی رسالے میں شائع نہیں ہوتی تھی۔ پھر سال بھر کی ادبی سرگرمیوں اور ادبی رفتار سے بھی قارئین کو واقف کرانے کے علاوہ سال کا منتخب ادب بھی پیش کیا۔

> **اُردو کی ترقی و فروغ میں ان انجمنوں اور اداروں نے اپنے فہم و ادراک کے مطابق قابل تعریف خدمات انجام دی ہیں۔ باقی کوئی ادارہ یا انجمن ہر ایک کو مطمئن نہیں کر سکتی۔ اگر دس تعریف کریں گے تو پانچ مخالفت کرنے والے بھی مل جائیں گے اور کچھ اس سے 'فیضیاب' نہ ہونے کی وجہ سے بھی اُن کے مخالف ہوجاتے ہیں۔**

م ع ا: ہندوستان میں اردو کے فروغ کی جتنی بھی سرکاری اکادمیاں اور انجمنیں ہیں، کیا آپ ان کی کارکردگی سے مطمئن ہیں؟ کیا انھیں اردو کی حقیقی ترقی کا ادراک ہے؟

نندکشور وکرم: میرا ماننا ہے کہ اُردو کی ترقی و فروغ میں ان انجمنوں اور اداروں نے اپنے فہم و ادراک کے مطابق قابل تعریف خدمات انجام دی ہیں۔ باقی کوئی ادارہ یا انجمن ہر ایک کو مطمئن نہیں کر سکتی۔ اگر دس تعریف کریں گے تو پانچ مخالفت کرنے والے بھی مل جائیں گے اور کچھ اس سے 'فیضیاب' نہ ہونے کی وجہ سے بھی اُن کے مخالف ہو جاتے ہیں۔

م ع ا: اردو کی حقیقی ترقی میں بالخصوص گزشتہ 70 برسوں سے مقبول عام ادب کا اہم کردار رہا ہے۔ آپ نے حال ہی میں اس موضوع پر 'عالمی اردو ادب' کا ایک وقیع نمبر بھی شائع کیا ہے۔ کیا اسباب ہیں کہ اردو کے بیشتر نقاد مقبول عام ادب کو اب بھی قابل اعتنا نہیں سمجھتے؟ کیا 'ادب عالیہ' اور 'مقبول عام ادب' کی بحث اب بھی مناسب ہے؟

نندکشور وکرم: میرا خیال ہے کہ یہ بحث ختم ہونے والی نہیں اور مقبول عام ادب اور ادب عالیہ کے درمیان حد فاصل کھینچنا بھی بڑا دشوار کام ہے۔ جب میں نے عالمی اُردو ادب نکالا تو اس میں ایسی کوئی تخصیص نہیں کی۔ افسوس تب ہوا جب دت بھارتی ایسے مشہور و معروف فکشن نگار کی وفات پر کسی نے اداریہ تو کیا خبر تک نہیں چھاپی۔ تب مَیں ڈھونڈ ڈھانڈ کے دت بھارتی کے گھر قرول باغ گیا تھا اور اُن سے متعلق مواد اکٹھا کر کے مَیں نے 'عالمی اُردو ادب' میں اُن پر ایک ادارتی نوٹ لکھا۔ اسی طرح تیرتھ رام فیروزپوری ایسے مترجم ناول نگار کی تاریخ وفات کا تو اُردو والوں کو آج تک پتہ ہی نہیں چل سکا۔ ویسے دیویندر ستیارتھی ایسی معروف ہستی کے سانحہ ارتحال کے بارے میں بھی کوئی خبر نہیں چھپی تھی۔

م ع ا: کیا آپ محسوس کرتے ہیں کہ زبان و ادب کا خاص تعلق اسکول کی بنیادی تعلیم سے ہے؟ پرائمری سے سکنڈری کی سطح تک اردو کی تعلیم کے بغیر کیا اردو کی حقیقی ترقی ممکن ہے؟

نندکشور وکرم: میرے خیال میں بنیادی تعلیم بہت ضروری ہے۔ اگر پرائمری سے سکنڈری کی سطح تک اردو کی تعلیم نہیں دی جاتی تو بنیاد کمزور رہ جاتی ہے جیسے اکثر پی ایچ ڈی کے ڈگری یافتہ بھی انتہائی فحش املا کی غلطیاں کر جاتے ہیں۔

> **پیغام دینا بڑے آدمیوں کا کام ہے۔ میری تو نجی رائے یہ ہے کہ ادیب ،شاعر ،نقاد بغیر کسی انعام و اعزاز کی خواہش کے اپنی استعداد کے مطابق اُردو زبان و ادب کی خدمت میں لگے رہیں۔اگر انہوں نے کوئی بڑا کام کیا تو اس کا فیصلہ وقت کرے گا ،مجھے اس سے بھی کوئی انکار نہیں کہ انعامات و اعزازات میں خویش پروری اور دوست نوازی کو زیادہ مد نظر رکھا جاتا ہے اور بعض اوقات حقدار نظر انداز کردیا جاتا ہے۔**

م ع ا: ایک خوددار اور اصول پسند تخلیق کار اور دانشور کی حیثیت سے اردو کے ادیبوں، شاعروں اور نقادوں کو کیا پیغام دینا چاہیں گے؟

نندکشور وکرم: پیغام دینا بڑے آدمیوں کا کام ہے۔ میری تو نجی رائے یہ ہے کہ ادیب ،شاعر، نقاد بغیر کسی انعام و اعزاز کی خواہش کے اپنی استعداد کے مطابق اُردو زبان و ادب کی خدمت میں لگے رہیں۔ اگر انھوں نے کوئی بڑا کام کیا تو اس کا فیصلہ وقت کرے گا، مجھے اس سے بھی کوئی انکار نہیں کہ انعامات و اعزازات میں خویش پروری اور دوست نوازی کو زیادہ مد نظر رکھا جاتا ہے اور بعض اوقات حقدار نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔

■

Mohd Arif Iqbal, Editor 'Urdu Book Review'
1739/3 (Basement), New Kohinoor Hotel
Pataudi House, Darya Ganj
New Delhi - 110002
Mob.: 9953630788

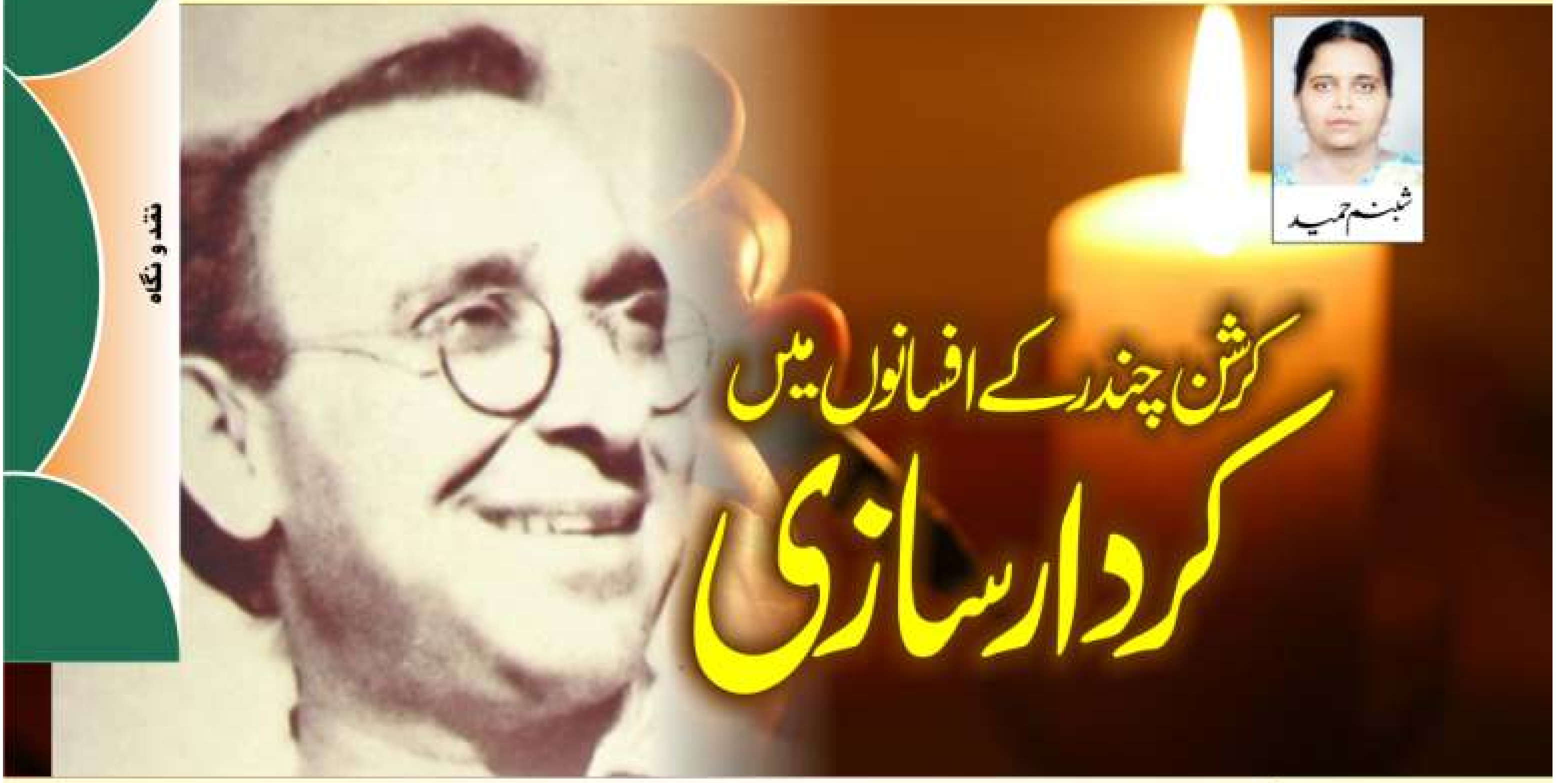

کرشن چندر کے افسانوں میں کردار سازی

شبنم حمید

کرشن چندر اردو فکشن میں ایک ایسا نام ہے جس کے تذکرے کے بغیر تاریخ افسانہ مکمل ہی نہیں ہو سکتی۔ کرشن چندر نثری ادب میں وہ ادیب ہیں جنھوں نے ناول، افسانہ، انشائیے، مزاحیہ وطنزیہ مضامین، تنقیدی مضامین، خطبات، ڈرامے، رپورتاژ، تمثیلیں اور شخصی خاکے لکھے۔ نثری ادب کی کوئی ایسی صنف نہیں جسے انھوں نے اپنے جذبات کا وسیلہ اظہار نہ بنایا ہو کرشن چندر کے افسانوں کے تراجم 65 زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ ان کی مشہور شخصیت کے پس منظر میں ان کا فن ہے یہ وہ فن ہے جس کی بنیاد میں ہندوستانی تہذیب کی اعلی ترین روایات شامل ہیں یعنی انسان دوستی اور شخصی عقیدے کا احترام۔ انھوں نے اپنے افسانوں کے لیے کشمیر کا پس منظر یقیناً منتخب کیا اور ان کی بیشتر کہانیاں خصوصاً نظارے میں شامل کہانیاں کشمیر سے ہی متعلق ہیں۔ والد کی ملازمت کے سبب کشمیر سے زیادہ وابستگی رہی ایک وجہ سے بھی کہ جب وہ لکھ رہے تھے تو اس وقت کشمیر راجا ہری سنگھ کے زیر اقتدار تھا اور وہاں کے عوام جاگیرداری نظام کے خلاف جدوجہد کر رہے تھے۔ لیکن انھوں نے پھر اس کے بعد بیش تر کہانیوں میں شہری تمدنی زندگی کا پس منظر رکھا ہے چاہے وہ دو فرلانگ لمبی سڑک یا تین غنڈے یا اسی قبیل کے دوسرے افسانے۔ ان کے کردار مثالی نہیں ہوتے جسے تنقیدی اصطلاح میں عینیت پرستی سے تعبیر کیا جا سکے۔ وہ بے شک اشتراکی نظریات کے علمبردار ہیں۔

کرشن چندر کی کردار سازی کا نقش اول ان کا طنزیہ مضمون ہے۔ جس کو انھوں نے فارسی کے استاد ماسٹر بلاقی رام کے خلاف لکھا تھا جس کا عنوان پروفیسر بلیکی رکھا۔ ان دنوں کرشن چندر دسویں جماعت میں تھے۔ رسالہ ریاست میں دیوان سنگھ مفتون جو ایڈیٹر تھے اسے شائع کر دیا۔ والد ناراض ہوئے اور پھر انھوں نے ایم اے کی تعلیم تک کچھ نہیں لکھا۔

کرشن چندر کا پہلا افسانہ یرقان 1936 میں شائع ہوا جس میں خود کو شائد کردار تصور کیا کیونکہ ایک بار ان کو یرقان ہوا تھا۔ ان کے کردار تخیلی نہیں ہوتے بلکہ خود پر آزمائے ہوئے ہوتے ہیں۔ ان کا فن رمزیت، ایمائیت اور علامت کا فن ہے۔ مثلاً جب وہ جہلم ناؤ پر افسانہ لکھتے ہیں اس افسانے میں جس دور کا نظام حیات تھا اس کی علامت تحصیل دار اور تھانیدار وغیرہ وغیرہ ہیں اور دوسری طرف وہ طبقہ ہے جو استحصال کا شکار ہے۔ بعد کے افسانوں میں یہ رنگ زیادہ واضح ہے۔ پہلا افسانہ جہلم ناؤ پر ایک سفر کی کہانی ہے۔ کرشن چندر نے لاہور اور کشمیر کے درمیان کا سفر کیا یہی سفر ان کے ابتدائی افسانوں کا موضوع خاص بنا۔ ان کے کردار ان کی طرح ہی سفر کرتے ہیں۔ پہلے لاری میں سفر کرتے ہیں۔ چاہے تحصیل دار ہوں یا تھانیدار یا بوڑھی یا وہ ادھیڑ عورتیں ہوں۔ کبھی کو اپنے ساتھ سفر میں شامل کرتے ہیں۔ کرشن چندر اس افسانے میں متوسط طبقے کے کرداروں کی کہانی سناتے ہیں۔ دوسرا سفر ناؤ کا ہے۔ یہاں خوبصورت تعلیم یافتہ لڑکی ہے۔ اس کا بھائی مانجھی ہے۔ ایک بوڑھا باریش آدمی ہے۔ کرشن چندر ایک مصور کی طرح نظر آتے ہیں جو کردار کی مناسبت سے منظر اور فضا کی کی تخلیق کرتے ہیں۔ کرشن چندر اپنے کرداروں کا حسن بیان کرنے میں تشبیہات کا سہارا لینے کے بجائے جذبوں سے ان رنگوں کو اجاگر کرتے ہیں جنھوں نے لڑکی کو خوبصورت بنایا ہے۔ افسانے کی یہ سطریں دیکھیے:

''وہ کشمیر کے حسن صبیح کا ایک نادر نمونہ تھی دلکش خدو خال سرو قد دلآویز رنگت لیکن جس چیز نے مجھے زیادہ متاثر کیا وہ اس کی ظاہری خوب صورتی سے بھی بڑھ کر اس کی نگاہوں کو حزن وملال تھا جسے میں ایک جھلک ہی میں پا گیا اف، وہ المناک گہرائیاں اس ایک لمحہ میں مجھے 76 ایسا محسوس ہوا کہ بجلی کی سی سرعت کے ساتھ کسی گہرے سمندر میں ڈوبا جا رہا ہوں''

آنگی ان کا دوسرا اہم افسانہ ہے۔ آنگی پہاڑی گاؤں کی ان پڑھ سیدھی سادی معصوم لڑکی ہے۔ ایک مسافر کو دل دے بیٹھتی ہے اور مسافر اس معصوم کو بغیر اطلاع دیے چلا جاتا ہے۔ آنگی کا کردار کرشن چندر کے رومانوی افسانوں کا پیش رو ہے۔ افسانہ مجھے کتے کاٹا میں ہمارا سامنا ڈاکٹر سے ہوتا ہے جو کسان کو بھیک مانگنے

کے لیے چھوڑ دیتا ہے۔ 'تالاب کی حسینہ میں' گوگی کمہاری ہے جو بے حد حسین ہے۔ صرف ایک آنہ' کا سروش ہے جو مسلسل بھوک اور بے روزگاری سے تنگ آکر بھکاریوں میں شامل ہو جاتا ہے۔ 'گوما' کی گومتی ہے، نورحسن ہے۔ جس نے تھانیدار کو اس کی مٹھی گرم کی تھی۔ 'مصور کی محبت' میں بگی ہے جو گوالن ہے۔ درج بالا کرداروں کا بغور مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کرشن چندر کا حساس دل اپنے گرد و پیش سے متاثر ہوا ہوگا، دکھا ہوگا اور جھنجھلا کر کچھ حل نکالنے کی کوشش بھی کی ہوگی۔ یہ انتہائی بصیرت کا نتیجہ ہے کہ کرشن چندر نے کہیں افسانہ میں خود کو رکھا کہیں اپنے ساتھی کو رکھا، کہیں اپنے علاقہ کو رکھا، کہیں اپنے شہر کو رکھا اور کہیں انسانیت کے دائرے کو رکھا۔ کردار سازی کے لیے کسی مخصوص دور میں جانے کی ضرورت نہیں محسوس کی۔ کسی مخصوص طبقہ کا مطالعہ نہیں کیا۔ کسی مخصوص انسان کو اپنے افسانے کے دربار میں زینت نہیں بخشی۔ بلکہ زندگی کے سفر میں چلتے جا رہے ہیں اور جو بھی مل رہا ہے اس کا ذکر اپنی زندگی کی ڈائری میں کرتے جا رہے ہیں۔

کرشن چندر کی انسان دوستی اور فرقہ پرستی کے خلاف جہاد کا نمونہ 'ہم وحشی ہیں' کی کہانیوں میں لال باغ، پیشاور ایکسپریس وغیرہ ہیں۔ لیکن ان کہانیوں میں کردار سازی اور کردار نگاری دونوں کا پہلو پیشاور ایکسپریس میں دکھائی دیتا ہے.....

مہالکشمی کے پل میں واضح طور پر زندگی کی دو تصویریں پیش کرتے ہیں ایک جو پل کے داہنی طرف کی ہے جو زندگی میں آرام ہے سہولتیں ہیں تعیش ہے لیکن ان کرداروں میں انسانیت کے دل کی دھڑکن نہیں ہے۔ اس کے برعکس مہالکشمی کے پل کے بائیں طرف کی زندگی میں گالیاں ہیں۔ آپس میں لڑائی جھگڑا ہے۔ لڑیا ہے جو پریم چندر کے کردار دھنیا کی طرح گالیاں بھی کھاتی رہتی ہے۔ تو تا بھی ہے جو گالیاں سن سن کر اتنا پختہ ہو جاتا ہے کہ خود بھی نے نے گالیاں بکتا رہتا ہے۔ یہی کرشن چندر کے فن کا سب سے اہم پہلو ہے کہ وہ کردار سازی میں ضمنی کردار کے ذریعہ بنیادی کرداروں کی خصوصیات کو ابھارتے اور جلا دیتے ہیں۔ نظارے میں کرشن چندر کا ہی نہیں اردو ادب کا اہم افسانہ دو فرلانگ لمبی سڑک شامل ہے، کرشن چندر کا یہ افسانہ 1938 میں شائع ہوا۔ اس افسانے میں کرشن چندر نے تکنیک کی خوبصورت عکاسی کی ہے۔ ممتاز شیریں لکھتی ہیں:

''اس زمانے میں جب کرشن چندر نے پہلے پہل لکھنا شروع کیا تھا اور جو ہمارے نئے ادب اور افسانے کا ابتدائی زمانہ تھا۔ کرشن چندر نے مغربی افسانے سے متاثر ہو کر کئی ایک نئے تجربے کیے بلکہ ان کا ہر افسانہ ایک نیا تجربہ تھا............کرشن چندر کے پاس ذہانت تھی کسی چیز کا فوری اثر قبول کر لینے والا مزاج ایک زود نویس، تیز رفتار قلم، چلتی ہوئی، رنگین زبان جس سے انھیں اظہار میں کوئی مشکل نہ ہوتی تھی لہٰذا وہ جس مغربی افسانے سے بھی متاثر ہوئے۔ اسی طرز کے افسانے کو فوراً اردو میں منتقل کیا۔ اس سے میرا مطلب یہ نہیں کہ کرشن چندر کے افسانوں کے چربے ہوتے تھے بلکہ یہ ان میں یہ صلاحیت تھی کہ مختلف طرز کے مغربی افسانوں سے بیک وقت اثر قبول کریں اور فوری طور پر انھیں اردو میں تخلیق کریں۔''

کرشن چندر نے دو فرلانگ لمبی سڑک روایتی انداز سے ہٹ کر لکھا ہے اس کو اردو کا پہلا علامتی افسانہ ہونے کا شرف بھی حاصل ہے۔ کرشن چندر بھی دوسری جنگ عظیم کے سانحہ سے اثر انداز ہوئے۔ وہ ایک ذہین اور حساس فنکار تھے ان کا مشاہدہ تیز نگاہ عمیق زبان میں تلخی اور طنز بھی تیز دھار بن کر ان کے فن میں شامل ہو گیا۔ دو فرلانگ لمبی سڑک کچہری سے لا کالج تک جانے والی معمولی سڑک ہے۔ جو ہندوستان کے اس وقت کے حالات کی ترجمانی کرتی ہے۔ بقول صلاح الدین حیدر:

''بظاہر یہ ایک معمولی سڑک کا بیان ہے۔ مگر فن کار کی دور اندیشی اس ایک جھلک سے سارے افسانے کی فضا تیار کر لیتی ہے، بلکہ میری ناچیز رائے میں ہر ٹکڑا اپنے اندر زندگی کی وہ ساری تلخی اور سیاہی اور ہمارے معاشرے کی وہ سنگدلانہ ناہمواری اور ہمارے نظام مجلسی کی وہ بے رحمانہ تپش اور کرختگی رکھتا ہے جس کے خلاف اس افسانے کے مختلف مناظر میں احتجاج کیا گیا ہے۔''

اس افسانے میں دو فرلانگ لمبی سڑک پر چلنے والے لوگ کرشن چندر کی کردار سازی کے منتظر رہتے ہیں۔ اس سڑک پر معاشرے کی کئی تصویریں نظر آتی ہیں یہاں گداگری ہے کوئی اندھا کوئی لنجا، کسی کی ٹانگ پر خطرناک زخم، افسانہ نگار نے کتنی گہرائی اور گیرائی سے

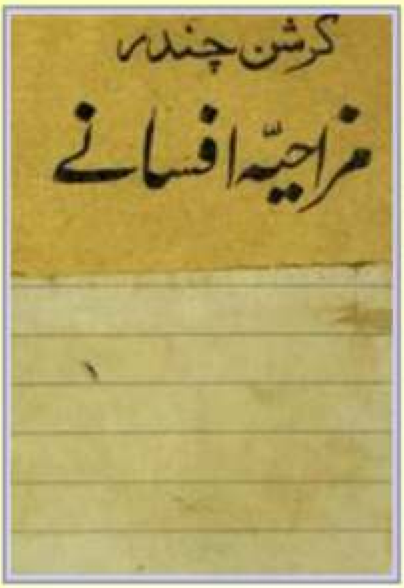

ٹانگ کے زخم کا کرب محسوس کیا۔ کوئی عورت دو تین بچے گود میں لیے مسرت سے راہ گیروں کی طرف دیکھ رہی ہے یہ کتنا بڑا طنز ہے۔ یہ نئے نظام کا احتجاج ہے۔ یہ گداگیری اس کاہل قوم کی علامت ہے جس کے احساس مٹ چکے ہیں۔ جن کے ہاتھ کٹ گئے ہیں جن کے پیر میں زخم ہے۔ جن کی عورتوں کی گود میں بچے ہیں یہ وہ قوم ہے جو محنت نہیں کرنا چاہتی دوسروں کے ٹکڑوں پر پلنا چاہتی ہے۔ دوسروں سے مدد کی طلبگار ہے۔ کرشن چندر کے یہاں عصری مسائل سے واقفیت بھی ہے اور مستقبل کے اشارے بھی ہیں۔ وہ اپنے ایسے کرداروں سے جھنجھلا جاتے ہیں۔ طنز کرتے ہیں اور جملے ہی جملے میں چوٹ کرتے ہیں۔ مثلاً ایک بوڑھا آدمی شاندار فٹن میں، ایک بھکارن، ایک کتا اس کا کچلنا، پھر خوبصورت عورت کا سامنے آنا، حریص بوڑھا علامت ہے سرمایہ داری کا۔ دو فرلانگ لمبی سڑک میں شعور کی رو کی تکنیک کو استعمال کیا ہے اور اپنے مفہوم کے اعتبار سے زندگی کی تضاد و تصادم اور زندگی کے ارتقائی تصور کا آئینہ ہے۔ زندگی سفر ہے، سڑک پر یہ سفر طے ہوتا ہے یہ زندگی دو نفس کی اور سڑک دو فرلانگ کی کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔

کرشن چندر کی انسان دوستی اور فرقہ پرستی کے خلاف جہاد کا نمونہ 'ہم وحشی ہیں' کی کہانیوں میں لال باغ، پیشاور ایکسپریس وغیرہ ہیں۔ لیکن ان کہانیوں میں کردار سازی اور کردار نگاری دونوں کا پہلو پیشاور ایکسپریس میں دکھائی دیتا ہے.....

'تین غنڈے' عبدالصمد رحمٰن اور سکھ کسان کا افسانہ ہے کرشن چندر اپنے کرداروں کے ذریعہ موجودہ نظام کو

جی بھر کر کھری کھوٹی سناتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ وہ اپنے سرخ نظریات کی تبلیغ بھی کرتے ہیں۔ افسانے کا یہ حصہ دیکھیں:

''اس کے ہاتھ میں کانگریس اور لیگ دونوں کے جھنڈے تھے اور جب دو گولیاں کھا مر جاتا ہے تو اس کے خون سے لیگ کا سبز جھنڈا اور کانگریس کا سفید سبز زعفرانی جھنڈا دونوں اس کے خون سے ایسے سرخ ہو گئے تھے کہ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ کون سا جھنڈا کس کا ہے۔''

کرشن چندر کا دل مساوات اور انسان دوستی کے لیے دھڑکتا ہے۔ پیشاور ایکسپریس میں وہ ایکسپریس کے ذریعے کہانی سناتے ہیں۔ ٹرین سے لوگ ہجرت کر کے دوسرے ملک جا رہے ہیں۔ راستے میں فساد ہوتا ہے۔ کرشن چندر اس خوں ریزی پر تیکھا طنز کرتے ہیں۔

''پندرہ آدمی فائر سے گر گئے۔ یہ تکشیلا کا اسٹیشن تھا۔ بیس اور آدمی گر گئے۔ یہاں ایشیاء کی سب سے بڑی یونیورسٹی تھی اور لاکھوں طالب علم اس تہذیب و تمدن سے کسب فیض کرتے تھے۔

کرشن چندر کا دل مساوات اور انسان دوستی کے لیے دھڑکتا ہے۔ پیشاور ایکسپریس میں وہ ایکسپریس کے ذریعے کہانی سناتے ہیں۔ ٹرین سے لوگ ہجرت کر کے دوسرے ملک جا رہے ہیں۔ راستے میں فساد ہوتا ہے۔ کرشن چندر اس خوں ریزی پر تیکھا طنز کرتے ہیں۔

پچاس اور مارے گئے۔

تکشیلا نے عجائب گھر میں اتنے خوبصورت بت تھے اتنے سنگ تراشی کے نادر نمونے، قدیم تہذیب کے جھلملاتے ہو چراغ...''

کرشن چندر کے کرداروں نے اشتراکیت کے گیت گائے ہیں۔ 'پھول سرخ ہیں' ایک اندھے لڑکے کی کہانی ہے۔ وہ مزدور کا بیٹا ہے۔ سنیما کے گیتوں کی کتاب بیچتا ہے۔ اور جب مل کے مزدوروں کی ہڑتال ہوتی ہے اور وہ مزدوروں کے ہڑتال میں شامل ہو جاتا ہے۔ کردار سازی میں کرشن چندر کمال فن پر نظر آتے ہیں۔ چاہے 'بت جاگے ہیں، ہو، ایک گرجا ایک خندق، انجیر اور 'بارود اور چیری کے پھول' ہو کردار سازی اس میں دیکھی جا سکتی ہے۔ کرشن چندر کے کردار اپنی کمزوریوں کے ساتھ دکھائی دیتے ہیں۔ نیکی اور برائی دونوں ان میں ہے۔ وہ اس دنیا کے گوشت پوشت کے انسان معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً چال کے تمام مزدور کا دروازہ بند کرنا اور بڑھیا (ستیو کی ماں) کا گولی لگنا نظر آتا ہے۔ جس سے کردار کی کمی نظر آتی ہے۔

کرشن چندر کا دردمند دل ان معصوم کرداروں کی پریشانی سے دکھتا ہے۔ وہ جھلاہٹ میں گالی نہیں دیتے بلکہ آب دیدہ ہو جاتے ہیں۔ افسانہ شہتوت کے درخت میں ملاحظہ ہو:

''یہ ہولے ہولے چلتے ہوئے مایوس اداس قدم جو اپنی محنت سے سونا اگلتے ہیں۔ وہ کھیت بوتے ہیں جوتتے ہیں اور کائنات کی بسیط برفیلی فضا میں بہار کا پیغام لاتے ہیں کیا سچ مچ انھیں کبھی ڈولی نہ ملے گی۔ کبھی جھولا نہ ملے گا۔ کبھی حنا کی لکیر میسر نہ ہوگی۔ مندروں سے لے کر مسجدوں تک یوں ہی گزر جانے والے قدم کیا ہمیشہ یوں ہی چلتے رہیں گے بے سواری بے آسرا۔''

اس طرح کی مثالیں ہم کو پچھلی چال، ایک عورت ہزار دیوانے، شمع کے سامنے، میں مل جائیں گے۔ کرشن چندر کے پاس ایک نئے سماج کے تعمیر و تشکیل کا تصور اور بدلتی زندگی کا احساس آخر تک پایا جاتا ہے۔ 1955 کے بعد حقیقت نگاری کا اثر ختم سا ہو گیا۔ لیکن سماج کو بدلنے کا احساس ابھی کارفرما ہے۔ مرد کرداروں پر جو افسانے اہمیت کے حامل ہیں ان میں کالو بھنگی، ڈوڈو، دو عشق، دلیپ کمار کی نانی، سپنوں کا قیدی، مس نینی تال، سو روپے، گلشن گلشن ڈھونڈا، دانی، قیدی، مکئی کے دانے، چور، گلنار، چندرو کی دنیا شامل ہے۔

کالو بھنگی کردار نگاری کی ایک عمدہ مثال ہے۔ کرشن چندر پر یہ الزام ہے کہ ان کے کردار جیتے جاگتے نہیں ہوتے لیکن تائی ایسری کی طرح کالو بھنگی ایک ایسا کردار ہے جو کردار نگاری کے خلا کو پر کرتا ہے۔ مصنف کا بار بار یہ کہنا کہ میں اس پر لکھنا نہیں چاہتا، لیکن یہ میرا پیچھا نہیں چھوڑتا اس بات کا اشارہ ہے کہ وہ اس کردار کو اتنے قریب سے جانتے ہیں۔ شاید ذاتی طور پر بھی اس کردار سے بہت بار ملے ہوں گے۔ کیونکہ اپنی بیٹی کی بیماری کے سلسلے میں ان کو ان حالات سے بار بار گذرنا پڑا تھا۔ کرشن چندر کالو بھنگی کو غیر اہم قرار دے کر اس کی اہمیت کو اور واضح کرتے ہیں۔ کالو بھنگی میں اپنے ساتھ اس کا موجود رہنا اور ایک لمحہ کے لیے بھی ساتھ نہ چھوڑنا اس بات کی تائید کرتا ہے کہ وہ سماج کے ان کرداروں کی طرف کتنا جھکاؤ محسوس کرتے ہیں۔ سماج کی انھیں طبقے سے کردار کا انتخاب کرتے ہیں۔ افسانے میں خود کو کردار کے قریب دکھاتے ہیں۔ کالو بھنگی کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

کرشن چندر اپنے کرداروں کے ذریعہ خود بولتے ہیں کبھی کبھی تو یہ لگتا ہے کہ جو انکی فسادات کے موضوع کی کہانیاں ہیں اس کا کردار کوئی دوسرا نہیں ہے خود کرشن چندر ہیں وہ بمبئی والا جسے مار کر کوٹا پورا کر دیا جاتا ہے وہاں یہ احساس ہو جاتا ہے کہ کوئی اور نہیں کرشن چندر ہی فساد کا شکار ہو گئے ہیں کرشن چندر کردار میں جیتے ہیں۔

''جب میں نے آنگی کے افسانے میں چاندی کی کلیاں سجائی تھیں اور رقانیت کے رومانی نظریے سے دنیا کو دیکھا تھا اس وقت بھی یہ وہیں کھڑا تھا جب میں نے رومانیت سے آگے سفر اختیار کیا۔ حسن و حیوان کی بوقلموں کیفیتیں دیکھتا ہوا ٹوٹے ہوئے تاروں کو چھونے لگا۔ اس وقت بھی یہ وہیں تھا جب میں نے بالکونی سے جھانک کر ان داتاؤں کی غیرت دیکھی اور پنجاب کی سرزمین پر خون کی ندیاں بہتی دیکھ کر اپنے وحشی ہونے کا علم حاصل کیا اس وقت بھی یہ وہیں میرے ذہن کے دروازے پر کھڑا تھا صم بکم۔''

کرشن چندر اپنے کرداروں کے ذریعہ خود بولتے ہیں کبھی کبھی تو یہ لگتا ہے کہ جو انکی فسادات کے موضوع کی کہانیاں ہیں اس کا کردار کوئی دوسرا نہیں ہے خود کرشن چندر ہیں وہ بمبئی والا جسے مار کر کوٹا پورا کر دیا جاتا ہے وہاں یہ احساس ہو جاتا ہے کہ کوئی اور نہیں کرشن چندر ہی فساد کا شکار ہو گئے ہیں کرشن چندر کردار میں جیتے ہیں۔ فسادات پر لکھی گئی ان کی کہانیاں اس کے کردار انسان دوستی فرقہ وارانہ تصادم اور ہندوستان کی وحدت کے لیے ایک بہترین پیغام ہیں وہ اس طرح اپنے آرٹ کو اور موضوعات کے آہنگ کو سامنے لاتے ہیں کہ قاری میں انسانی اقدار حیات کے لیے جو تصادم کشمکش جدوجہد ہے کرشن چندر کا ہم نوا ہو جاتا ہے ان کے افسانوں میں بالکل عام انسان ملتے ہیں کالو بھنگی ہو یا مہالکشمی کا تو تایا دادر پل کے بچے کا بھگوان۔

■

Prof. Shabnam Hameed
Head of Dept. Dept. of Urdu
Allahabad University
Allahabad - 211002 (UP)

منیر نیازی کی غزل کے فکری و فنی سروکار

ظفرالمتقی

منیر نیازی کی شعری کائنات میں نظموں کو بنیادی اہمیت حاصل ہے تاہم ان کی غزلیں بھی اپنے منفرد اور علامتی اسلوب اور تازہ فکر کے حوالے سے بار بار قرأت پر اصرار کرتی ہیں۔ منیر نیازی کی غزل کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ انھوں نے خود اپنی سوچ اور اظہار کے سانچے وضع کیے۔ ان کی شاعری تقسیم کے بعد پورے عہد کے طرز احساس اور بدلتے ہوئے رویوں کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ اسی لیے ان کے یہاں ایک طرح کی معصومیت، حیرت و استعجاب کی کیفیت اور ماضی کے گم شدہ تجربوں کی بازیافت ہوتا کچھ ایسے شعری رویے ہیں جو اس عہد کے دوسرے شاعروں کے یہاں کم نظر آتے ہیں۔ منیر نیازی کی شاعری اپنے معاصرین سے اس لیے بھی مختلف ہے کہ انھوں نے اپنی شاعری میں علامتوں کے ذریعے گہرے اور پیچیدہ معانی و مفاہیم پیدا کیے ہیں۔ ان کی شاعری میں مرکزی علامتوں کے طور پر سفر، شہر، ہوا، شام، جنگل، مکان، چاند سورج، پانی، شجر، آئینہ اور خواب وغیرہ ہیں۔ انھوں نے ان علامتوں اور استعاروں کے ذریعے فطرت، انسانی رویوں، معاشرے اور شہری زندگی کے تصادم کو پیش کیا ہے۔

جنگلوں میں کوئی پیچھے سے بلائے تو منیر
مڑ کے رستے میں کبھی اس کی طرف مت دیکھنا

نہ جا کہ اس سے پرے دشت مرگ ہو شاید
پلٹنا چاہیں وہاں سے تو راستہ ہی نہ ہو

خوف دیتا ہے یہاں ابر میں تنہا ہونا
شہر در بند میں دیواروں کی کثرت دیکھو

سویا ہوا تھا شہر کسی سانپ کی طرح
میں دیکھتا ہی رہ گیا اور چاند ڈھل گیا

ان شعروں میں جس طرح جنگل، رستہ، پیچھے مڑ کر مت دیکھنا، دشت مرگ، شہر در بند، شہر کا سانپ کی طرح سونا اور چاند کا ڈھلنا جیسی لفظیات و تراکیب سے مخصوص طرح کی امیجری تخلیق کی گئی ہے اور ان مخصوص پیکروں کی مدد سے جو ایک پُر اسرار داستانوی فضا کی تشکیل کی گئی ہے وہ منیر نیازی سے مخصوص ہے۔ یہ فضا سازی اور منظر کی تعمیر ان کے علامتی مزاج کی زائیدہ ہے۔ ان کی غزلوں میں جنگل اتنے روپ بدل کر آتا ہے کہ یہ سارے جنگل آفت زدہ شہر کو محیط ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ منیر نیازی کے عہد کا شہر بنیادی طور پر مادی ترقی اور تمام طرح کی آسائش و آرام کی فراہمی کے باوجود ڈپریشن، ذہنی دباؤ، اجنبیت اور تنہائی کی دہشت سے عبارت ہے۔ شہر منیر نیازی کو دشمن کی طرح پریشان کرتا ہے کیونکہ اس کی بنیاد نظام زر پر رکھی گئی ہے اور یہ نظام زر شہری زندگی پر اس قدر حاوی ہے کہ اس سے فرد کے اندر بے گانگی کے جذبے سر ابھارتے ہیں جو پوری شہری زندگی کو زوال کی طرف لے جاتے ہیں۔ اور در حقیقت یہ زوال ہماری اجتماعی زندگی کے توسط سے معاشرے کا حصہ بن کر فرد کے وجود کے زوال کا المیہ بن جاتا ہے۔ اسی لیے بہ قول انتظار حسین ''منیر نیازی عہد کی شاعری کرنے والوں سے زیادہ عہد کا شاعر نظر آتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس نے اپنے اندر رہ کر 'آفت زدہ شہر' دریافت کیا ہے۔''

منیر نیازی کی شاعری اس لیے بھی اہم بن جاتی ہے کہ ان کے یہاں لفظوں کی معنویت کے ساتھ ساتھ فضا سازی کو بھی بہت اہمیت حاصل ہے۔ یہ اپنے شعروں میں جس طرح کی صورتِ حال کو پیش کرتے ہیں، اس کے نتیجے میں ایک مختلف طرح کی فضا آفرینی کی تعمیر و تشکیل ہوتی ہے اور یہ ایسی فضا ہے جو دہشت ناک ہونے کے ساتھ خوابناک اور پُر اسرار بھی ہے۔ دراصل منیر نیازی اس فضا آفرینی کے لیے مکان اور اس کے لوازم کا خاص خیال رکھتے ہیں اور ان لوازم کے بیان کے ذریعے ایک خاص طرح کی فضا تخلیق کرتے ہیں۔ ان کے یہاں مکان اور اس کے لوازم اپنی مکمل تخلیقی قوت کے ساتھ پہلی بار دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اسی خوبی کا جائزہ لیتے ہوئے پروفیسر انیس اشفاق نے لکھا ہے کہ:

''...... اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ منیر نے 'مکان' کے لوازم کو پہلی بار مکمل قوت کے ساتھ پیش کیا۔ اس پیش کش میں گزشتہ زمانوں کی یاد، ان زمانوں کے آثار اور ان کی نوحہ خوانی موجود ہے۔''

منیر نیازی اپنی شاعری میں علامتوں اور استعاروں کے ذریعے مکان اور اس کے لوازم سے تعمیر منظر کچھ اس طرح کرتے ہیں کہ اس میں آفت زدہ شہر کا عکس مکمل طور سے ابھر آتا ہے۔ اسی لیے موجودہ بستی کی ویرانی قدیم بستیوں کو مزید ویران اور دہشت ناک بنا دیتی ہے:

رات اک اجڑے مکاں پہ جا کے اک آواز دی
گونج اٹھے بام و در میری صدا کے سامنے

اس شعر میں رات، اجڑے مکان اور بام و در ایک بصری پیکر پیش کرتے ہیں اور آواز سماعی پیکر۔ وہیں اجڑے مکان میں شاعر کی آواز گونجنے سے شعر کے تمام پیکر حرکی پیکر میں تبدیل ہو جاتے ہیں اور شعر میں جامد صورتِ حال متحرک نظر آنے لگتی ہے۔ اور وہ صورتِ حال جس میں وقت رات میں تبدیل ہو چکا ہے، مکان اجڑ چکے ہیں اور بام و در شکستہ ہو چکے ہیں لیکن شاعر ابھی اطراف و جوانب کے ماحول سے بے خبر نہیں ہے بلکہ اپنے درون کی آواز پر آواز دے رہا ہے۔ اس کی آواز کا اثر اجڑی ہوئی صورتِ حال کو بھی متحرک بنا دیتا ہے اور مکان کے کھنڈرات بھی شاعر کی آواز کے ساتھ گونجنے لگتے ہیں:

اک آسیب زر ان مکانوں میں ہے
مکیں اس جگہ کے سفر پر گئے

آزادی کے بعد ہماری تاریخ دو ہجرتوں سے عبادت ہے۔ پہلی ہجرت پاکستان کے وجود کے بعد کی ہے اور دوسری ہجرت بیسویں صدی کی چھٹی اور ساتویں دہائیوں میں ہوئی۔ لیکن دونوں میں ایک بنیادی فرق ہے۔ پہلی ہجرت اپنی جان اور عزت و ناموس کے تحفظ کے لیے تھی اور ہجرت اپنے آرام و آسائش اور دولت و زر کے وسائل کی فراہمی کے لیے مغربی ممالک کی طرف تھی۔ منیر نیازی کا درجہ بالا شعر دوسری ہجرت کے منظر نامے کو پیش کرتا

ہے کہ اب مکان عالیشان ہوگئے ہیں تاہم مکان اپنے مکینوں سے خالی ہیں اور مکان کی یہی ویرانی در اصل آسیب زدہ ہے۔ دوسرے مصرعے کی ساخت پر غور کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابھی تک مکان کے مکین واپس نہیں آئے ہیں۔ اس میں آسیب سے جو فضا مرتب ہوتی ہے وہ غیر انسانی اور داستانی فضا ہے کیوں کہ آسیب کے ساتھ ویرانی اور خوف کا تصور وابستہ ہے:

آیا وہ بام پر تو کچھ ایسا لگا منیر
جیسے فلک پہ رنگ کا بازار کھل گیا

اس شعر میں مکانی لوازم اپنی بھرپور رعایتوں کے ساتھ موجود ہیں۔ چنانچہ بام اپنے مکان اور مکان اپنے مکین کے وجود کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ اس شعر میں تشبیہ اپنی جدت اور ندرت کے اعتبار سے بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ ''رنگ کا بازار'' کی ترکیب ایک ایسا بصری پیکر پیش کرتی ہے، جس میں گہما گہمی اور حرکت ہے، محبوب خوب صورت ہے اس کے بام پر آنے سے آسمان پر رنگوں کا بازار کھل گیا۔ رنگوں کے بازار سے ذہن اس طرف منتقل ہوتا ہے کہ جو آسمان پر رنگوں کا بازار کھلا ہے اس میں محبوب کے چہرے، اس کی آنکھوں، اس کے گلابی لبوں، اس کے سیمیں بدن اور اس کے تبسم، سبھی کے رنگ شامل ہیں اور یہاں رنگ کا بازار کھلنا محبوب کے سراپا کی رنگارنگی کو ظاہر کرتا ہے۔ سراپا کی اسی رنگارنگی نے اسے عاشق کی نظروں میں دلآویز بنا دیا ہے:

اک چیل ایک ممٹی پر بیٹھی ہے دھوپ میں
گلیاں اجڑ گئی ہیں مگر پاسباں تو ہے

اس شعر میں دھوپ میں ممٹی پر بیٹھی ہوئی چیل کو اجڑی ہوئی گلیوں کا پاسباں کہہ کر ویرانی کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ اس کے لیے بھی منیر نیازی نے اپنے محبوب شعری حربے مکان اور اس کے لوازم سے کام لیا ہے۔ یہ گلیاں اس شہر کی ہیں جو منیر نیازی کے دل میں بستا ہے جسے وہ 1947 کے بعد چھوڑ آئے تھے۔ منیر نیازی کے یہاں آفت زدہ شہر کبھی ساتھ نہیں چھوڑتا ہے۔ وہ شہر اور اس شہر کی وہ حویلی جو آباء واجداد کی نشانی تھی، وہ منیر نیازی کی زندگی کا ایک ناگزیر حصہ بن چکی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غم والم کی شدت کے باعث اس شعر میں طنز کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے کہ گلیوں کے اجڑنے کے بعد چیل پاسبانی کا کام انجام دے رہی ہے جب کہ دھوپ اور چیل ویرانی کی ہولناکیوں اور اجڑی ہوئی بستیوں کی دہشت کو نمایاں کر رہے ہیں۔ منیر نیازی شہر کی ہولناکی اور اس دہشت کو نمایاں کرنے کے لیے مختلف صورتیں پیدا کرتے ہیں:

سویا ہوا تھا شہر کسی سانپ کی طرح
میں دیکھتا ہی رہ گیا اور چاند ڈھل گیا

شہر کا کسی سانپ کی طرح سونا اور چاند کا ڈھل جانا، در اصل شہر کی دہشت ناکی اور ہولناکی کو بیان کرتا ہے۔

ماضی کی روایتوں سے عدم وابستگی کی بنیاد پر تہذیبی بحران پیدا ہوگیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ مشینی عہد نے انسان کی معصومانہ فطرت کو ختم کر دیا ہے۔ اسی لیے منیر نیازی مادی چمک دمک میں گم ہو جانے والے انسان کو اپنے اصل جوہر سے محرومی کا افسوس کرتے ہیں اور اس کو کسی آسیب کا سایہ بتاتے ہیں۔ منیر نیازی کا درج ذیل اسی پس منظر میں ہے۔

منیر اس ملک پہ آسیب کا سایہ ہے یا کیا ہے
کہ حرکت تیز تر ہے اور سفر آہستہ آہستہ

ظاہری اور مادی چمک دمک کے باوجود انسان اخلاقی اور روحانی اعتبار سے روبہ زوال ہے اسی لیے منیر نیازی اپنے ملک کو آسیب زدہ بتاتے ہیں۔ اگر غور کیا جائے تو آسیب کا لفظ غیر انسانی فضا کی تشکیل کرتا ہے کیونکہ یہ انسان مائل بہ ارتقا تو ہے لیکن یہ کیسا ارتقا ہے جس سے ایک مشینی اور جذبات واحساسات سے عاری معاشرے کی تعمیر ہو رہی ہے۔ اس شعر میں 'حرکت' لفظ جہاں ایک بے معنی اور بے مقصد حرکت کا اشاریہ ہے وہیں 'سفر' ایک بامقصد اور بامعنی متحرک کا علامیہ ہے۔ اس شعر میں دنیا کے اخلاقی اور روحانی اقدار سے خالی ہو جانے کا نوحہ ہے یعنی انسان کی مادی ارتقاء کے باوجود روحانی اور اخلاقی اعتبار سے قعر مذلت میں گر چکا ہے۔ اور تہذیبی، ثقافتی اور انسانی اقدار کی عمارت کو مادیت کے فروغ نے مسمار کر دیا ہے۔

کس کو فکر گنبد قصر حباب
آب جو پیہم چلے، پیہم چلے

'گنبد قصر حباب' کی ترکیب بصری پیکر کا منظر نامہ تشکیل دیتی ہے وہیں یہ ترکیب ہماری سماعی دنیا کو بھلی اور مانوس لگتی ہے۔ یہاں 'گنبد قصر حباب' اور 'آب جو' استعارہ نہ رہ کر علامتی نوعیت کے حامل ہوگئے ہیں۔ یہاں گنبد کا لفظ ایک مکمل تہذیبی مظاہر کی طرف اشارہ کر رہا ہے جس میں نہ جانے کتنے افراد کا خون جگر شامل ہے۔ لیکن 'آب جو' یعنی وقت جو اپنی روانی اور رفتار سے اس بلند اور مکمل تہذیبی مظاہر کو مسمار کرتا ہوا گزر رہا ہے۔ اس شعر میں 'گنبد قصر حباب' کی ترکیب سے ایک عظیم الشان عہد کے زوال کی مکمل تصویر نگاہوں میں پھر جاتی ہے اور یہی اس شعر کو المیاتی شعر بناتی ہے۔ اس شعر کی معنوی جہتیں اور نمایاں ہوں گی اگر ہم گنبد اور حباب کی صوری مناسبت پر غور کریں۔ یعنی صدیوں میں پروان چڑھی ہوئی تہذیب حباب کی طرح ختم ہوگئی اور اس کا کوئی نشان باقی نہیں رہا۔ یہ شعر انسان اور اس کے عدم ثبات کا نوحہ ہے۔ اس تہذیبی عمارت کے مٹ جانے کا زیاں اور فزوں ہو جاتا ہے جب اس صنعتی اور مشینی عہد میں انسان اخلاق اور روحانی اقدار سے عاری ہو کر صرف جسمانی آرام وآسائش کے لیے سب کچھ تعمیر کر رہا ہو۔

منیر نیازی کی غزلوں میں ہجرت کا تجربہ بھی ملتا ہے۔ اپنے عہد کے اہم شاعر ناصر کاظمی کی طرح خود بھی ہجرت کے تجربے سے دوچار ہوئے تھے اس لیے ماضی کے حوالے سے اپنی مٹی، اپنا گھر، اپنی زمین، اپنے لوگ، اپنا خاندان، اپنا بچپن اور اپنا دیار ان کے دل کی بستی میں پہلے جیسا ہی تھا اسی لیے وہ ان میں تبدیلیوں سے خوف زدہ تھے۔ ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ہجرت کا تجربہ ان کے لیے ایک بھید بھی ہے اور ان کے تخلیقی عمل کو تحریک دینے والا سب سے طاقتور محرک بھی۔ اسی باعث ان کی شاعری میں پرانی بستی میں موجود گھروں، گلیوں اور راستوں کے نشان ملتے ہیں۔ منیر نیازی نے خصوصیت کے ساتھ ہجرت سے متعلق انوکھے تجربات کا اظہار کیا ہے۔

ہجرتوں کا خوف تھا یا پُرکشش کہنہ مقام
کیا تھا جس کو ہم نے خود دیوار جادہ کر دیا

حیرت میں ہوں منیر میں شہر خیال دیکھ کر
گلیوں میں گھر نئے نئے، ان میں بشر نئے نئے

واپس نہ جا وہاں کہ ترے شہر میں منیر
جو جس جگہ پہ تھا وہ وہاں پر نہیں رہا

منیر نیازی کے یہاں ہجرت کا تجربہ، اپنے اندر ہجرت کے نتائج، دوستوں کے بچھڑ جانے اور زندگی اور تہذیب کے ایک پورے عہد کے گم ہو جانے کا احساس رکھتا ہے۔

منیر نیازی کی غزلوں میں وحشت ودہشت کی کیفیت ہو یا ماضی کی بازیافت کا انداز، گم شدہ زمانوں کے متعلق اشخاص اور احباب کا بچھڑ جانا ہو یا ان کی ہجرت کا تجربہ یہ سب کچھ زمانہ حال میں آکر بالکل ایک نیا پس منظر اختیار کر لیتا ہے۔ ان کے انداز بیان اور پراسرار کیفیت نے ہر صورت حال میں ان کی غزل کو فنی سرّیت اور رمزیہ اسلوب سے آشنا کیا ہے۔ اس اسلوب کی تشکیل میں ان کے سادہ انداز بیان کے اندر موجود علامتوں نے بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔

■

Zafrun Naqi
H.No.: 164/4, Jamalpur
Aligarh - 202002 (UP)
Mob.: 9639205647
Email.: drznaqi@gmail.com

اکرم پرویز

مائی تھوز کا ہندوستانی سوندریہ

متھ/اسطوری کلامیہ کے داخلی نظام کی تفہیم و تعبیر یا اسطوری بیانیہ کی پڑھت کے سیاق میں جو اولین حربہ استعمال میں لایا جاتا ہے وہ اس کی لغوی تحلیل اور اشتقاقی نیچر کی وضاحت سے سروکار رکھتا ہے:

اسطور یا متھ یونانی زبان کے لفظ مائی تھوس [Mythos] سے ماخوذ ہے جس کا لغوی مفہوم ہے ــــ وہ بات جو زبان سے ادا کی جائے، یعنی کوئی قصہ یا کہانی۔ ابتداً اسطور کا یہی تصور رائج تھا لیکن بعد ازاں کہانی کی تخصیص کر دی گئی ــــ یوں کہ اسطور اس کہانی کا نام پایا جو دیوتاؤں کے کارنامے سے متعلق تھی یا ان شخصیتوں کی مہمات کو بیان کرتی تھی جو زمین پر دیوتاؤں کی نمائندہ تھیں۔

(وزیر آغا: تخلیقی عمل، علی گڑھ: علی گڑھ بک ڈپو، 1975، ص:39)

لیکن Barry Powell نے اس تصور پر سوالیہ نشان تب قائم کر دیا جب اس نے یہ مفروضہ تشکیل دیا کہ اسطور یعنی Myth کا ابتدائی فارم جسے عموماً Mythos کہا جاتا ہے کہ Etymology نامعلوم ہے اور اس کے متعلق وثوق سے کچھ بھی کہنا ممکن نہیں۔ یوں اسطور کا اشتقاقی منبع خلا میں ہے۔ اس نے Mythos کے بجائے Muthos لفظ کا استعمال کیا ہے۔ مسئلہ یہ نہیں کہ موضوعی سطح پر اسطور کا دائرہ کار اور معنویت کیا ہے اور اس میں متعدد و مختلف نوع کے افکار و خیالات منور کیوں کر ہوتے ہیں بلکہ اس کا بنیادی سروکار محض لفظ Muthos کے داخلی کوائف کو اجاگر کرنے سے متعلق ہے۔ Barry Powell نے واضح کیا ہے کہ اس لفظ کو پہلی بار آٹھ سو عیسوی قبل میں ہومر نے اپنے رزمیہ ایلیڈ اور اوڈیسی میں استعمال کیا ہے۔ ہومر کے نزدیک اس لفظ کا مفہوم یہ ہے:

Muthos seems to refer to an emphatic utterance or command, usually when a person in power is speaking in public, at length, and with emotional force: Such is a muthos .

[Barry Powell: A Short Introduction to Classical Myth, New Jersey: Upper Saddle River, 2002, p:2]

اس تناظر میں دیکھا جائے تو اسطور کا نیچر خطیبانہ اور آمرانہ نظر آتا ہے۔ اس کے ساتھ اس نے یہ بھی وضاحت فراہم کی ہے کہ اس کا استعمال وہی شخص کر سکتا تھا جو کہیں نہ کہیں Aristocracy سے جڑا ہوا ہو۔ بیانیہ نیچر اور کہانی کے طور پر اس کی تخصیص کے حوالے سے اس نے لکھا ہے کہ:

Sometimes the speaker recounts things that happened in the past to underline the importance of the command or exhortation, so that from the beginning muthos refers to a kind of story, or at least a narration. [ibid, p:2]

یوں اسطور اپنے ابتدائی فارم میں بھی انسان کے تخلیقی، تخئیلی، وجدانی، رومانی، جمالیاتی اور تشکیلی ذہن کا غماز نظر آتا ہے اور اس کے سہارے انسان کی مذہبی، اخلاقی، سیاسی فکریات کو مطیع بنانے کا رجحان بھی نظر آتا ہے۔ آج کی Political Rhetorics میں تو اس بات سے انکار کفر کا موجب ہوگا کہ انتہاپسندانہ سیاست Euhemerian طرز پر اپنی اپنی اسطورہ کو تاریخی طور پر درست اور صحیح قرار دینے میں مسلسل مصروف ہے اور اس

کے احیا اور تجدد کے توسط سے ثقافتی/ وجودیاتی تشخص کی نئی کہانی گڑھ رہی ہے۔ یوں بھی اسطور اپنے ابتدائی فارم میں منفی تصورات کی ترویج اور ایک خاص نوع کی Rhetorics کے ساتھ ظہور میں آتا ہے۔ ہمارے لیے یہاں یہ بات ہی کافی ہے کہ 'طاقتور حکمران اپنے اقتدار کی بحالی کے لیے عوام کو جذباتی طور پر اپنا حلیف بناتا ہے'۔ بعد میں اپنی سیاسی خطابت کو شدید کرنے کے لیے کہانی یعنی بیانیہ کو بطور اوزار کے استعمال میں لاتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ رفتہ رفتہ اسطور کے ساتھ ایک خاص نوع کا خطیبانہ اور ناصحانہ بیانیہ جڑ گیا اور ایک ایسا سیاسی ڈسکورس قائم ہوا جس میں اسطور کو بیانیہ کے متبادل کے طور پر ہی دیکھا جانے لگا۔ اس کے بنا اسطور کی کوئی وقعت نظر نہیں آتی۔ Georges Sorel اور Eduard Bernstein کے حوالے سے کہا جا سکتا ہے کہ اسطور اپنی فطرت میں ایک سیاسی موقف ہے اور عموماً اس کا استعمال بھی اسی تناظر میں کیا گیا ہے۔ موجودہ دور کے سیاق میں بھی یہ بات اتنی ہی سچی ہے جتنی اپنے اشتقاقی فارم میں نظر آتی ہے:

The muthos is not just a statement, but a kind of action creating an effect. The sheer power of muthos, in ancient times and today, has always been part of its nature. [ibid, p:2]

دراصل بنی نوع انسان کی اجتماعی سائیکی دیومالا/ متھ/ اسطور کی ساخت میں ہی اپنے اکتسابی، اکتشافی ومعنیاتی جمال کی تعمیر وتشکیل کرتی ہے اور اسی تناظر میں اس کی مادی وشعوری فکریات اور مابعد الطبیعیاتی وضع منور ہوتی ہے۔ عمومی طور پر دیکھا جائے تو انسان کے اجتماعی حافظے میں متھ کا وہی پیٹرن آج بھی سب سے زیادہ نمایاں اور روشن ہے جس کی تاریخی یا حقیقی جہات نہایت مدھم یا سرے سے ناقابل فہم ہوتی ہیں۔ ایسا ممکن نہیں کہ متھ یعنی اسطور کی فلسفیانہ، نفسیاتی، مابعد الطبیعیاتی، سماجی، بشریاتی، معاشی، سیاسی، ثقافتی اور معاشرتی تعبیرات ہی اس کی اصل اور بنیادی سچائی ہوں بلکہ اس کے غیاب میں انسانی جبلت کی تخریبی، تعمیری اور تخلیقی قوت کے امتیازات واکتشافات اپنے مکمل جمالیاتی آہنگ کے ساتھ منقش ہوتے ہیں۔ یوں بھی انسان کا تخیلی استغراق اور تخلیقی اعماق زندگی کے بنیادی رنگوں کو فنون لطیفہ کے فارم میں مسخر کرنے کی مساعی میں مسلسل کوشاں نظر آتا ہے لیکن اسے تخلیقی تجربہ اور تخیلی قوت کا عرفان تب ہوتا ہے جب وہ عام معاشرتی روش سے معریٰ وماوریٰ ہوکر متھ اور کائنات کے اشتراکات، انسلاکات وامتیازات کو گرفت میں لینے کا متمنی ہوتا ہے۔ مرور ایام کے ساتھ ساتھ تخیلی قوت اور تخلیقی شعور میں انضمام پیدا ہوتا ہے۔ جس کی بنا پر متعدد علمیاتی، فکریاتی و جمالیاتی ڈھانچے/ ادارے تشکیل پاتے ہیں جو معاشرے کی اجتماعی بے حسی کی تعدیم کے کارگر وسائل اور انسان کے وجودی دکھوں پر روحانی پھاہے فراہم کرتے ہیں۔ چونکہ ہمعصر معاشرے کا المیہ یہ ہے کہ متھ کے ساتھ اس کا تخلیقی رابطہ منقطع ہو چکا ہے اسی لیے جدید، مابعد جدید اور بعد مابعد جدید معاشرتی کیڑا خوف کی سائیکی اور اجتماعی بے حسی کے احساس میں پوری طرح گرفتار ہو چکا ہے۔ دراصل عام معاشرتی روش سدا سے ہی لغوی اور سطحی معنوں میں اسطور سے معاملہ کرتی ہے لہٰذا اسطور محض پروپیگنڈا بن کر رہ جاتا ہے لیکن اسطور کا حقیقی عرفان جس نوع کے روحانی تجربات تعمیر کرتا ہے اس کی اساس پر رفتہ رفتہ عمومی سائیکی کے اندرون میں کائنات کے بھید کا گہرا شعور جھکنے لگتا ہے۔ جب اس کا داخل اسطور کے باطن سے دامن گیر ہوتا ہے تو کائنات کے اسرار اس پر کھلنے لگتے ہیں۔ یوں متھ کی تفہیم وتعبیر کی یہی سطح ادب میں سب سے اہم اور قابل قبول بن جاتی ہے کہ متھ اسی خاص سطح اور مخصوص نہج پر پہنچ کر کائنات سے اس کی علامتی، تمثیلی اور استعاراتی ساخت میں معاملہ کرنے لگتی ہے۔ اسطوری بیانیہ کی پرمعنت کا یہ اسلوب ہم پر متھ کے اسرار وجوہر کو کھولتا ہے۔ اس سے اسطور کے متناقضانہ نیچر کا بھی انکشاف ہوتا ہے کہ یہ حضرت انسان کی فطرت وجبلت سے علاحدہ نہیں جہاں وہ ہر چیز کے انتشار وتخریب [سنہار کی یہ منطق شو شکتی اور تانڈو کے تخلیقی وجمالیاتی سیاق میں ہی بامعنی اور روشن نظر آتی ہے] میں اس کی تعمیری جمالیات سے روبرو ہوتا ہے۔

اپنی اصل کے اعتبار سے یونان میں Myth کے لیے Muthos مستعمل تھا۔ مندرجہ بالا سطور میں اس کی وضاحت کی جا چکی ہے لیکن اسطور کے ساتھ باطل اور لغو کا مفہوم یعنی 'متھیا شبد' تو ہندوستانی ثقافت میں بھی نظر آتا ہے۔ یوں بھی ہومر اگر آٹھ سو صدی قبل مسیح کا کوئی شخص ہے بھی تو تاریخی طور پر اس کی صداقت ایک تحقیق طلب مسئلہ ہے بلکہ اس کی حیثیت ایک مفروضے کی سی ہے۔ لہٰذا اسطور کے حوالے سے Muthos کی قواعد کو آخری سچائی تسلیم نہیں کیا جا سکتا ہے۔ ہندوستانی ثقافت میں متھ کا تعلق پُرانوں کے ساتھ تسلیم کیا جاتا ہے۔ پُران وید اور اُپنشدوں کے متوازن ہی اپنی کتھا پرمپرا کو تھامے ہوئے ہیں۔ رگ وید میں متعدد کہانیاں بیان ہوئی ہیں جو بنیادی طور پر پُرانوں سے ہی مستعار ہیں۔ فلسفیانہ طور پر پُران رگ وید سے کافی قریب ہیں۔ علاوہ ازیں اُپنشد کال میں پرانوں کو ویدوں کے مانند ہی علم کا منبع مانا جاتا تھا۔ اسے پانچواں وید بھی کہا گیا ہے۔ اسے تاریخ بھی کہا جاتا ہے کہ اس میں بیت چکے واقعات کا بیان اور اس کی اساس پر تعمیر ہونے والے آدرشوں کا اظہار ہوتا ہے اور ہندوستان کی خالص علمیات میں تاریخ کا مفہوم بھی اسی سے اخذ کردہ ہے۔ تاریخ کے اسی ہندوستانی تصور کو نوآبادیاتی عہد کی تاریخ نویسی اپنی ثقافتی برتری کے زعم میں منسوخ کرتی ہے۔

ہندوستانی ثقافت میں متھ کا تعلق پُرانوں کے ساتھ تسلیم کیا جاتا ہے۔ پُران وید اور اُپنشدوں کے متوازن ہی اپنی کتھا پرمپرا کو تھامے ہوئے ہیں۔ رگ وید میں متعدد کہانیاں بیان ہوئی ہیں جو بنیادی طور پر پُرانوں سے ہی مستعار ہیں۔ فلسفیانہ طور پر پُران رگ وید سے کافی قریب ہیں۔ علاوہ ازیں اُپنشد کال میں پرانوں کو ویدوں کے مانند ہی علم کا منبع مانا جاتا تھا۔ اسے پانچواں وید بھی کہاگیا ہے۔ اسے تاریخ بھی کہا جاتا ہے کہ اس میں بیت چکے واقعات کا بیان اور اس کی اساس پر تعمیر ہونے والے آدرشوں کا اظہار ہوتا ہے اور ہندوستان کی خالص علمیات میں تاریخ کا مفہوم بھی اسی سے اخذ کردہ ہے۔ تاریخ کے اسی ہندوستانی تصور کو نوآبادیاتی عہد کی تاریخ نویسی اپنی ثقافتی برتری کے زعم میں منسوخ کرتی ہے۔

اسطور/ دیومالا/ متھ کی متعدد تعریفات وتشریحات کی گئی ہیں۔ مختلف طرز فکر کے حامل اشخاص اور دانشوروں نے اسطور کے نیچر کی وضاحت اپنے ثقافتی، سیاسی، اخلاقی اور معاشرتی میلان طبع کے تطابق اور مخصوص مذہبی فکریات کے تفاہم میں کیا ہے:

A myth is an account of the deeds

of a god or a supernatural being, usually expressed in terms of primitive thought. It is an attempt to explain the relations of man to the universe, and it has for those who recount it a predominantly relegious value; or it may have arisen to 'explain' the existence of some social organization, a custom, or the peculiarities of an environment.

(Lewis Spence: An Introduction To Mythology, New York:Moffat Yard and Company, 1921,p: 12)

یوں اسطور میں واقعے کا بیان ہوتا ہے۔عموماً یہ واقعات دیوی دیوتاؤں سے مخصوص ہوتے ہیں۔کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ اس میں 'کسی مخصوص کلچر کے ہیرو کی مہمات' [کیمپ بیل نے اسے مونومتھ سے موسوم کیا ہے]

پران ہندوستانی دیومالا اور اساطیر کے قدیم ترین مجموعے ہیں۔ ہندوستانی ذہن ومزاج کی ،آریائی اور دراوڑی عقائد اور نظریات کے ادغام کی،نیز قدیم ترین قبل تاریخ زمانے کی جیسی ترجمانی پرانوں کے ذریعے سے ہوتی ہے،کسی اور ذریعے سے ممکن نہیں۔یہ الہامی کتابوں سے زیادہ مقبول اورہر دلعزیز ہیں... پران کے معنی ہیں پرانا، پراچین، قدیم۔جس طرح ہندو مذہب کا رسوماتی پہلوویدوں (یعنی براہمنوں اور آرن یکوں) میں درج ہے،اور فلسفیانہ اور عالمانہ پہلو اپنشدوں میں،اسی طرح عوامی پہلو پرانوں میں سامنے آتا ہے۔

بھی بیان ہوتی ہے۔پس اسطور،بیانیہ یا بیانیے ہیں جو کہ ثقافتی دیوتاؤں یا ہیروز کے معمولات وانسلاکات کی تفصیل بیان کرتے ہیں۔اس کی تفصیلات میں زندگی اور کائنات سے جڑی ہوئی کہی اَن کہی داستانیں شامل ہوتی ہیں۔ واقعات کی تعمیر وتشکیل میں انسان کا تخلیقی اعماق اور تخیلی وجدان مدد کرتا ہے اور اسی لیے اسطور کو انسانی ذہن کا کارنامہ بھی قرار دیا جاتا ہے۔مذہبی،اخلاقی،ثقافتی اور سیاسی فکریاتی تخالف تب قائم ہوتا ہے جب اسطور کے بنیادی رمز کو گرفت میں لینے کی سعی کی جاتی ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ اسطور کی ساخت کو کلی طور پر گرفت میں لینا ممکن ہی نہیں۔شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ اسطور میں جن واقعات وکردار کی ترجمانی اور نمائندگی ہوتی ہے اور اس میں جس نوع کے محسوسات وادراکات کا اظہار کیا جاتا ہے وہ انسان کی مابعد الطبیعیاتی روح/سائیکی سے مربوط نظر آتا ہے۔اسی لیے کسی بھی نامعلوم خطے کی اسطور سے انسانی ذہن مطابقت بٹھالیتا ہے اور وہ اس کی سائیکی کا حصہ اسی طرح سے بن جاتی ہے جیسے وہ اس کی ثقافت کا ہی ایک مظہر ہو۔اگر اسے اسطور کی سب سے اہم صفت قرار دیا جائے تو غیر اغلب نہ ہوگا۔اسے پُران کے حوالے سے یوں سمجھا جائے کہ پُران سنانے کی چیز تھے/ ہیں جو ہندوستانی شعریات کے جمالیاتی احساس واظہار کو مزید قوی،توانا اور مستحکم کرتے ہیں۔ہندکی دیو مالائی روایت میں لوک گاتھاؤں کا جو تسلسل وامتیاز قائم ہے وہ کہنے اور سننے کے تفاعل میں زیادہ سرگرم دکھائی دیتا ہے۔بعد کی ادبی روایت میں جب داستان/ رومانس جیسی ادبی صنف کا ورود ہوتا ہے تو یہی تفاعل اس کا بنیادی رمز بن جاتا ہے۔اور غالبًا اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ داستان جس دھرتی سے اُگتی ہے وہاں کی اجتماعی سائیکی میں پُران ایک آرکی ٹائپل موٹف کی حیثیت سے منور نظر آتا ہے۔ یوں اسطوری کلچر کی وضاحت میں ہندوستانی رسمیات وثقافت کے امتیازات واکتشافات کو بریکٹ کرنا اس کی خالص شعریات کے تفاہم میں کارآمد ومعاون نظر آتا ہے۔

ہندی میں اسطور کے لیے 'میتھک' مستعمل ہے اور یہ شبد 'متھیا' سے کافی قریب ہے۔'متھیا' سنسکرت میں اسطور کا نعم البدل ہے۔یہاں بھی یہ خاص طور پر جھوٹ اور لغو کے طور پر استعمال میں لایا جاتا ہے۔ پران کے حوالے سے یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ یہ دراوڑی کلچر سے ہم آہنگ تھا۔آریوں کی ہندوستان آمد سے قبل بھی اس کے کافی مستحکم نشانات ملتے ہیں۔آریوں کا ہندوستان میں ورود تقریباً 1500 قبل مسیح مانا جاتا ہے اور دراوڑ تو اس سے پہلے سے یہاں موجود تھے ہی اگر پرانوں کے ساتھ اسطور کا تعلق آریوں کی آمد کے بعد بھی مانا جائے تو بھی ہندوستان میں اسطور یعنی 'متھیا' کی تاریخ یونان سے قدیم ہے۔ لہٰذا Myth کی اصل یعنی Muthos کے بجائے 'متھیا' کو کیوں نہیں مانا جاسکتا ہے:

پران ہندوستانی دیومالا اور اساطیر کے قدیم ترین مجموعے ہیں۔ہندوستانی ذہن ومزاج کی ،آریائی اور دراوڑی عقائد اور نظریات کے ادغام کی،نیز قدیم ترین قبل تاریخ زمانے کی جیسی ترجمانی پرانوں کے ذریعے سے ہوتی ہے،کسی اور ذریعے سے ممکن نہیں۔یہ الہامی کتابوں سے زیادہ مقبول اور ہر دلعزیز ہیں... پران کے معنی ہیں پرانا، پراچین، قدیم۔جس طرح ہندو مذہب کا رسوماتی پہلو ویدوں (یعنی براہمنوں اور آرن یکوں) میں درج ہے،اور فلسفیانہ اور عالمانہ پہلو اپنشدوں میں،اسی طرح عوامی پہلو پرانوں میں سامنے آتا ہے۔خیال ہوتا ہے کہ جس طرح برہمنوں کی شدھ سنسکرت کے ساتھ ساتھ عوام کی انڈک بولیاں اور پراکرتیں ترقی کرتی رہیں، اسی طرح ویدوں کے ساتھ ساتھ پرانوں کی لوک کتھائیں بھی قدیم ترین زمانے سے رائج رہی ہوں گی۔

(گوپی چند نارنگ، فکشن شعریات، تشکیل وتنقید،دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، 2009،ص: 375)

پُران ہندوستان کی اسطوری کتھاؤں کے ماخذ ہیں۔اس لیے اسطور کی تشریح و تعبیر میں پرانوں کی اہمیت شعوری اور لاشعوری دونوں حوالوں سے معنی خیز ہے کہ ہمارا بدن پُرانک کہانیوں سے بھرا ہوا ہے۔ ہماری ذہنی ساخت کی تشکیل میں اجتماعی لاشعور کی کارکردگی سے کسی کو انکار نہیں ہوگا

پرانوں کی قدامت کسی بھی طرح ایلیڈ اور اوڈیسی سے کم نہیں قرار دی جاسکتی۔سائنٹفک اور تاریخی طور پر تو پران کو ہی زیادہ قدیم مانا جاتا ہے لہٰذا اسطور کے آغاز و ابتدا کے ضمن میں اسے بہرکیف وسیلہ بنانا ہماری مجبوری بن جاتی ہے۔پُران ہندوستان کی اسطوری کتھاؤں کے ماخذ ہیں۔اس لیے اسطور کی تشریح وتعبیر میں پرانوں کی اہمیت شعوری اور لاشعوری دونوں حوالوں سے معنی خیز ہے کہ ہمارا بدن پُرانک کہانیوں سے بھرا ہوا ہے۔ہماری ذہنی ساخت کی تشکیل میں اجتماعی لاشعور کی کارکردگی سے کسی کو انکار نہیں ہوگا اور مجھے یہ کہنے میں بھی عار نہیں کہ مشرقی جمالیاتی شعور پرانک کتھاؤں کی جلو میں ہی تعمیر ہوا ہے۔ یوں جب بھی مشرقی اسطوری روایت وجمال پر مکالمہ قائم کیا جائے گا Myth یا Muthos کے ساتھ ساتھ 'متھیا' اور پُرانوں کے سمبندھ پر بھی گفتگو ہوگی۔ پس مشرقی طرزفکر سے فرار حاصل کر کے کم ازکم دیومالا یعنی اسطور کا کوئی بھی کلامیہ مرتب کرنا تقریباً ناممکن ہے۔

■

Akram Parvez
222-E, Mahanadi Hostel
JNU, New Delhi - 110067

فضائی آلودگی کا مسئلہ اور اردو کے نظم نگار شعرا

سُمی

آلودگی کا زہر پورے کرۂ ارض کو اپنے حصار میں لے چکا ہے۔ اس کی تازہ مثال ملک کی راجدھانی دہلی ہے جہاں گھنے اسموگ (Smog) میں لوگوں کا سانس لینا مشکل ہوگیا ہے۔ اس کی وجہ دیوالی کے موقعہ پر کی جانے والی آتش بازی اور فیکٹریوں سے نکلنے والا دھواں ہے۔ عالمی سطح پر صنعتی انقلاب کو ماحولیاتی آلودگی کا نقطۂ آغاز تسلیم کیا جاتا ہے۔ تب سے آج تک صنعتی اور دیگر ترقیاتی منصوبوں کے لیے بغیر سوچے سمجھے بہت تیزی سے جنگلوں کا صفایا کیا جاتا رہا ہے۔ اس کے نتیجے میں تمام دنیا میں جنگلوں کی شرح میں زبردست کمی آئی ہے۔ ہمارے ملک ہندوستان میں بھی 'چپکو آندولن' اپنا اثر کھو چکا ہے اور بیش قیمت درختوں و جنگلی جانوروں کی تجارت زوروں پر ہے۔ پہاڑوں کو بھی بڑی بے رحمی سے عریاں کیا جا رہا ہے۔ اس ضمن میں عدلیہ کی باز پرس کا بھی کوئی مثبت اثر منظر عام پر نہیں آیا ہے۔ درختوں کی گھٹتی شرح نے فضائی آلودگی کو اس حد تک بڑھا دیا ہے کہ آج پوری دنیا کا حیاتیاتی نظام منفی طور پر متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ آج ہمارے سامنے پوری انسانیت کی بقا کا سوال کھڑا ہو چکا ہے۔ لہٰذا اس کے تحفظ کے لیے جنگلات کو تحفظ دینا اور بڑے پیمانے پر شجر کاری کے لیے عمل پیرا ہونا بے حد ضروری ہے۔ گزشتہ کئی دہائیوں سے ماحولیاتی آلودگی پر ہونے والی گفتگو میں تیزی آئی ہے اور آج بھی یہ موضوع سنجیدہ غور و فکر کا متقاضی ہے۔ ماحولیاتی آلودگی کے انسداد کے لیے قومی اور بین الاقوامی سطح پر کوششیں جاری ہیں۔ مذاکرات اور کانفرنس کا سلسلہ بھی برقرار ہے باوجود اس کے اب تک کوئی مثبت نتیجہ برآمد نہیں ہو سکا ہے۔ اس کی ایک بنیادی وجہ تو یہ ہے کہ ترقیات کی رفتار سے Compromise کرنے کے لیے کوئی بھی ملک تیار نہیں، حتیٰ کہ ترقی یافتہ ممالک بھی نہیں۔ رسا کشی کے اس عالم میں ہمارا ماحولیاتی توازن بے ضابطگی کا شکار ہوگیا ہے۔ اس بے ضابطگی کو دور کرنے کے لیے اجتماعی کوششوں کے متوازی انفرادی سطح کی کوششیں بھی ناگزیر ہیں۔ ہمارے ملک کی حکومت نے بھی انفرادی طور پر اپنی کوششوں کو جاری رکھنے کا عہد لیا ہے۔ یہ تمام عہد و قرار اپنی جگہ ہیں، اس ضمن میں ہر شہری فرداً فرداً اپنے طور پر سعی کر سکتا ہے۔ کوئی طالب علم ہو یا دانشور، کوئی خاتون خانہ ہو یا خود مختار عورت، اپنے دائرے میں ملک کا ہر باشندہ انسداد آلودگی کے لیے قدم اٹھا سکتا ہے۔

ماحولیاتی آلودگی نے انسانی زندگی کو بری طرح متاثر کیا ہے۔ ادبا و شعرا جو عام طور پر بیدار، حساس اور زیادہ باشعور ہوتے ہیں وہ اپنے ماحول سے بے خبر نہیں رہ سکتے۔ لہٰذا انھوں نے بھی اردو شاعری میں ماحولیات اور اس سے وابستہ عوامل کی خوبصورت ترجمانی کی ہے۔ ان عوامل کو ہم قدرت کی منظر نگاری میں بھی تلاش کر سکتے ہیں اور جزیات نگاری میں بھی۔ تشبیہ و استعارے کے توسط سے بھی ان تک ہماری رسائی ممکن ہے۔ اردو شاعری کے ضمن میں یہ سچ ہے کہ اس نے ہر زمانے میں عصری تقاضوں سے خود کو ہم آہنگ کیا ہے۔ اردو نظم کا مزاج بھی تغیر پذیر رہا ہے۔ نظم نگاروں نے بدلتے حالات کے تقاضوں کو پورا کرنا اپنا فریضہ سمجھا لہٰذا اردو نظم نگاری میں بھی زندگی کا حقیقی رنگ نظر آتا ہے۔ نظم نگاروں نے بدلتے ہوئے موسم میں بدلتے ہوئے قدرتی مناظر کی سچی تصویر کشی کی ہے۔ آج ہماری دنیا کی یہ دلکشی زائل ہوتی جا رہی ہے۔ بالفاظ دیگر قدرتی مناظر پر بھی ماحولیاتی آلودگی کا سایہ منڈلانے لگا ہے۔ سبزہ زاروں، کہساروں کی شادابی، جنگلوں کی ہریالی اور ندیوں کی روانی میں کمی واقع ہونے لگی ہے۔ ماحولیاتی آلودگی کے سبب حسین اور دلکش وادیوں میں بھی قدرتی آفت دستک دے چکی ہے۔ خواہ وہ اتراکھنڈ کا واقعہ ہو یا کشمیر کا۔ ماحولیاتی آلودگی خدائی قہر بن کر کبھی باڑھ اور کبھی زلزلے کی شکل میں نمودار ہونے لگی ہے۔ ورنہ وادیٔ کشمیر تو جنت سے مشابہہ تھی (اور اب بھی ہے)۔ جس کے حسن کی تعریف میں شعرانے بھی زور آزمائی کی ہے۔ جنت نشاں کشمیر کے متعلق شاعر پنڈت برج نارائن چکبست کے خیالات سے ان کی محبت، حب الوطنی اور ان کا اعتماد ظاہر ہوتا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

ایسا نہیں قدرت نے کیا فرش کہیں پر

اس رنگ کا سبزہ ہی نہیں روئے زمیں پر
وہ صبح کو کہسار کے پھولوں کا مہکنا
وہ جھاڑیوں کی آڑ میں چڑیوں کا چہکنا
وہ میوہ خوش رنگ وہ سر سبز چمن زار
اک آن میں صحت ہو جو برسوں کا ہو بیمار

شاعر کے الفاظ کی صداقت سے انکار ممکن نہیں۔ لیکن ان دنوں صورتحال میں بہت تیزی سے تبدیلی آئی ہے۔ ان وادیوں کی پاکیزگی اور ماحول کی شفافیت بھی سوال کے دائرے میں آ چکی ہے۔ ہماری طمع، خودغرضی، غیر ذمہ داری اور غیر جواب دہی نے قدرت کی اس خوبصورت سوغات کو بھی نوچ کھسوٹ کر کنگال بنا دیا ہے۔ پہاڑوں کو کھود کھود کر عریاں چھوڑ دینے سے بھی ماحولیاتی آلودگی میں بے حساب اضافہ ہوا ہے۔ اگر ہم ابھی بھی ہوشیار اور سنجیدہ ہو جائیں اور ماحولیات کے تحفظ کو اپنے ساتھ لے کر آگے بڑھیں تو سانس لینے کے لیے تازہ ہوا مل سکتی ہے۔ ورنہ جس بے چینی اور بے اطمینانی کے ماحول میں ہم زندگی گزار رہے ہیں اور جی گھبرانے پر پہاڑوں میں جانے کا پروگرام بناتے ہیں عنقریب وہ آپشن بھی معدوم ہونے والا ہے۔ محمد علوی کی نظم 'مجھے ان جزیروں میں لے جاؤ' سے چند اشعار پیش کرتی ہوں:

مجھے ان جزیروں میں لے جاؤ
جو کانچ جیسے
چمکتے ہوئے پانیوں میں گھرے ہیں
تو ممکن ہے میں
اور کچھ روز جی لوں
کہ شہروں میں اب
میرا دم گھٹ گیا ہے!

اس نظم کی چند سطور سے انسانی معاشرے کا خارجی انتشار، اس کی زندگی اور روح کا کرب ظاہر ہو رہا ہے۔ یہ کرب میٹرو پولیٹن شہروں کا عطیہ ہے۔ جہاں ترقی کے نام پر قدرت کا تمخول اڑایا جاتا ہے اور خارجی دنیا کو نمائشی اور بارونق بنانے کے عوض میں داخلی زندگی کو بے سکونی کے دلدل میں پھنسا دیا جاتا ہے۔ اس روحانی کرب سے نجات پانے کے لیے ہر زندہ دل انسان دور نکل جانا چاہتا ہے جہاں فطرت کی گود میں زندگی سانس لے سکے اور قدرتی مناظر کے دھوپ چھاؤں میں اٹکھیلیاں کر سکے۔ لیکن آج ہمارے سامنے سب سے بڑا سوال قدرت اور فطرت کی خوبصورت وادیوں کو تحفظ عطا کرنے سے متعلق ہے۔

ہم موسم کے بدلتے ہوئے مزاج اور آب و ہوا میں آنے والی زبردست تبدیلیوں کے عینی شاہد ہیں اس لیے ان حقائق کو جھٹلا نہیں سکتے کہ عصر حاضر میں اس دنیا کی جو صورت حال ہے اس کے اصل ذمہ دار ہم خود ہیں۔

صبح و شام، سرد و گرم، بہار و خزاں، جنگل و بیابان اور کوہ و صحرا کے خوشگوار اور مثبت اثرات ناپید ہوتے جا رہے ہیں۔ اسی کے ساتھ جنگلوں، پہاڑوں، ندیوں اور ریگستانوں میں رہنے بسنے والے جانوروں، چرند و پرند کا تناسب بھی بڑی تیزی سے گھٹتا جا رہا ہے۔ جنگل کی کٹائی اور تباہی نے ان کی بقا پر منفی اثر ڈالا ہے۔ کرۂ ارض پر ایکو سسٹم یا ماحولیاتی نظام کا اہم جزو ہوتے ہوئے بھی جانوروں کی سیکڑوں نسلیں معدوم ہو چکی ہیں باقی ماندہ نسلیں بھی ناپید ہونے کے شدید خطرے سے دوچار ہیں۔ غیر متوازن اور غیر منصوبہ بند انسانی سرگرمیوں نے ماحولیاتی توازن کے نظام کو شدید طور پر نقصان پہنچایا ہے۔ لہٰذا گوریے جیسے گھریلو پرندے بھی اب ہمارے صحن اور چھتوں پر دکھائی نہیں دیتے۔ عام طور سے ہمارے گھروں کے آنگنوں اور درختوں پر کھیلنے و چہچہانے والے یہ پرندے ہماری نظروں سے اوجھل ہوتے جا رہے ہیں۔ حالانکہ جنگلی جانور اور تمام طرح کے پرندے ہمارے ماحول میں زندگی کی علامت ہیں۔ اس لیے قطعی طور پر ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ ان کا ناپید ہونا خود ہمارے وجود کے لیے خطرہ ہے۔ اردو کے نظم نگار شعرا نے جس طرح اپنی نظموں میں انھیں شامل کیا ہے اس سے معاشرے میں پرندوں کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے اور اس بات کا بھی علم ہوتا ہے کہ ہم آج پرندوں کو تحفظ دینے کے لیے برڈ سینکچریز بنا رہے ہیں۔ ان کے تحفظ کے لیے لوگوں کو بیدار کر رہے ہیں مگر ہمارے شعرا ہمیشہ سے ہی ان پرندوں کی اہمیت سے واقف تھے اور انھیں انسانی زندگی کا ایک اہم حصہ سمجھتے تھے۔ اسی لیے نظموں میں انھیں کثرت سے جگہ دی گئی ہے۔ نظم 'برسات کی بہاریں' لکھ کر نظیر اکبرآبادی نے حیاتیاتی تنوع کے تحفظ کی ایک بہترین مثال پیش کی ہے۔ اشعار ملاحظہ ہوں:

بولیں بیے، بٹیریں، قمری پکارے کو کو
پی پی کرے پپیہا، بگلے پکارے تو تو
کیا ہدہدوں کی حق حق کیا فاختہ کی ہو ہو
سب رٹ رہے ہیں تجھ کو، کیا پنکھ کیا پکھیرو
کیا کیا مچی ہے یارو برسات کی بہاریں

مختلف عالمی ممالک کی طرح ہمارے ملک میں کئی جھیلیں، ندی، نالے، ساحل اور سمندر بھی اتنے آلودہ ہو چکے ہیں کہ وہاں حیاتیاتی زندگی ناپید ہوتی جا رہی ہے۔ نظیر اکبرآبادی کی طرح الطاف حسین حالی نے بھی انسانوں کی بقا کے لیے ماحولیاتی نظام کی اہمیت کو سمجھا ہے اور حیاتیاتی تنوع کو انسانی زندگی کے ارتقا کے لیے لازمی قرار دیا ہے۔ لہٰذا نظم 'برکھارت' لکھ کر انھوں نے ماحولیاتی نظام کے تعلق سے اپنا موقف کچھ اس انداز میں پیش کیا ہے:

پانی سے بھرے ہوئے ہیں جل تھل
ہے گونج رہا تمام جنگل
کرتے ہیں پپیہے پیہو پیہو
اور مور چنگھاڑتے ہیں ہر سو
کوئل کی ہے کوک جی لبھاتی
گویا کہ ہے دل میں بیٹھی جاتی
مینڈک جو ہیں بولنے پہ آتے
سنسار کو سر پہ ہیں اٹھاتے

کرۂ ارض کو فضائی آلودگی سے پاک کرنے میں جنگل نے

ہمیشہ ہی اہم کردار ادا کیا ہے۔ جنگلوں سے ہمیں نہ صرف حیات بخش تازہ ہوا اور دیگر خوردنی اشیا کی فراہمی ہوتی ہے بلکہ اس سے چشمۂ آب کو بھی تحفظ ملتا ہے، زمین کی زرخیزی میں اضافہ ہوتا ہے اور انواع واقسام کے چرند و پرند کو پناہ ملتی ہے۔ گوکہ جنگل حیاتیاتی تنوع کے لیے ایک زرخیز مسکن ہے۔ انسانوں نے تہذیب کے ارتقائی مراحل میں اس خدائی عطیہ کا سب سے زیادہ استحصال کیا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ اس کا استحصال آج بھی بڑی تیز رفتاری سے جاری ہے۔

جنگل ایک قدرتی دولت ہے جو ماحولیاتی توازن کو برقرار رکھنے کے لیے لازمی ہے۔جنگل، انسان اور حیوان سبھی باہمی طور پر اس طرح جڑے ہوئے ہیں کہ کسی ایک کا خاتمہ دوسرے کے لیے خطرناک ہوسکتا ہے۔ کرۂ ارض کا ہر حصہ(بری اور بحری دونوں) فضائی آلودگی کی زد میں ہے۔جمنا جو کبھی شفاف اور پاکیزہ تھی آج زہریلی ہو چکی ہے۔

شعرائے اردو اس صورتحال سے بخوبی واقف ہیں اس لیے بدلتے حالات نے انھیں بے حد متفکر کر دیا ہے۔ تغیر پذیر ماحولیات کے اثرات کی جھلک جاں نثار اختر کی نظم 'ایک وادی سے گزرتے ہوئے' میں دیکھ سکتے ہیں:

نہ اب نغمے ہیں ڈالوں پر نہ اب خوشبو ہے خاروں میں
بس اک دکھتے ہوئے دل کی صدا ہے آبشاروں میں
یہ وادی کس قدر شاداب تھی اگلے بہاروں میں

جنگل ایک قدرتی دولت ہے جو ماحولیاتی توازن کو برقرار رکھنے کے لیے لازمی ہے۔ جنگل، انسان اور حیوان سبھی باہمی طور پر اس طرح جڑے ہوئے ہیں کہ کسی ایک کا خاتمہ دوسرے کے لیے خطرناک ہوسکتا ہے۔ کرۂ ارض کا ہر حصہ (بری اور بحری دونوں) فضائی آلودگی کی زد میں ہے۔ جمنا جو کبھی شفاف اور پاکیزہ تھی آج زہریلی ہو چکی ہے۔ ساغر نظامی نے نظم 'جمنا' لکھ کر اس ندی کے نہ صرف اعلیٰ ترین ماضی کو پیش کیا ہے بلکہ ''سچ بتا اے میری جمنا کیا وہی جمنا ہے تو'' کا مصرع لگا کر موجودہ 'جمنا' کا خاکہ بھی پیش کر دیا ہے۔ اشعار ملاحظہ ہوں:

ساحلوں پر جس کے صحرائے لق و دق تھا کبھی
جو درندوں اور حیوانوں کا تھا ملجا کبھی
جس کو پانڈوں نے سنوارا کیا وہ دوشیزہ ہے تو
سچ بتا اے میری جمنا کیا وہی جمنا ہے تو
آہ وہ تیرے زمانے اک فسانہ ہو گئے
ناچتے تھے مور جن کنجوں میں وہ کیا ہو گئے
یادگار حشمت تاریخ دیرینہ ہے تو
سچ بتا اے میری جمنا کیا وہی جمنا ہے تو

پیڑ پودے ہوا کی آلودگی کو کم کرنے میں معاون ہوتے ہیں۔ ان دنوں عالم گیر سطح پر بہت تیز رفتاری سے تجدید کاری کا عمل جاری و ساری ہے، کل کارخانے لگائے جا رہے ہیں، ملٹی اسٹوریز عمارتیں بنائی جا رہی ہیں، کان کنی کی جا رہی ہے، یکے بعد دیگرے ایٹمی تجربات ہو رہے ہیں اور نیوکلیر پلانٹ قائم کیے جا رہے ہیں۔

اختر انصاری کی نظم 'دوپہر' سے مثالیں پیش کرتی ہوں:

دھوپ کی تابانیوں کا راج ہے
مہر کی عریانیوں کا راج ہے
مثل بھٹی کے دہکتا ہے جہاں
پھٹ پڑا ہے جیسے اک آتش فشاں
جوکرن ہے مہر آتش بار ہے
دھار ہے جلتی ہوئی تلوار کی
تپ رہے ہیں کوچہ و بازار سب
شعلہ افشاں ہیں در و دیوار سب
سرخ آہن جس طرح دیتا ہے ضو
اٹھ رہی ہے خاک کے ذروں سے لو

بظاہر تو یہ نظم گرمی کا سماں باندھتی ہے مگر اس نظم سے موسم گرما کے بدلے ہوئے مزاج کا بھی پتہ ملتا ہے۔ ذاتی مشاہدات وتجربات کی بنا پر ایک معمر شخص موسم کے مزاج میں آنے والے اس فرق کو بڑی آسانی سے محسوس کر لیتا ہے۔ نئے دور کے موسم گرما میں سورج ڈھلنے کے بعد رات کے شروعاتی حصے میں بھی لو قہر برپا کرتی ہے۔ لہٰذا رات اور دن کے درجہ حرارت کا فرق کم ہوتا جا رہا ہے۔ دوسری جانب نباتات کی شرح میں آنے والی کمی کی وجہ سے ہی پانی کی قلت بڑھ رہی ہے۔ پانی کے ذخیرے خشک ہو رہے ہیں۔ زیر زمین پانی کی سطح میں گراوٹ آ رہی ہے۔ نتیجتاً پینے کے لائق پانی کا ملنا دشوار ہوتا جا رہا ہے۔ ریگستانوں میں توسیع ہو رہی ہے۔ زمین کی پرتیں ڈھیلی ہو رہی ہیں جس کے سبب مٹی کٹاؤ اور زمین کھسکنے کے واقعات تواتر سے پیش آ رہے ہیں۔ زمین کی زرخیزی گھٹ رہی ہے۔ جنگلوں کے بغیر زمین کی زرخیزی بحال نہیں کی جا سکتی۔ بارش میں کمی آنا اور وقت سے بارش نہ ہونا بھی پریشانی کا باعث ہے۔ پانی کی ضرورت بڑھ رہی

اردو کے نظم نگار شعرا نے فضائی آلودگی کے سبب آنے والی ماحولیاتی تبدیلیوں کو بھی پیش کیا ہے اور ان تبدیلیوں سے حیاتیاتی تنوع پر ظاہر ہونے والے منفی اثرات کو بھی موضوع بنایا ہے۔لہٰذا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ شعرا نے بالواسطہ اور بلا واسطہ طور پر فضائی آلودگی کو موضوع بنا کر اردو طبقہ کو ماحولیات کے تئیں ذمہ داریوں کا احساس دلایا ہے تاکہ باہمی اتحاد و اتفاق سے فضائی آلودگی کو دور کرنے کے لیے سنجیدہ کوششوں کو جاری رکھا جا سکے

ہے اور بارش گھٹتی جا رہی ہے۔ روئے زمین کے باشندوں کو پانی کی قلت کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ اکثر و بیشتر ہم اپنے معاشرے میں عوام کو بارش کے انتظار میں دیکھ سکتے ہیں۔ نظم 'برسات' میں عبدالمجید شمس نے ایسا ہی سماں باندھا ہے۔ مثالیں ملاحظہ ہوں:

اساڑھ آیا، بارش نہ آئی مگر
ہر اک کی سوئے آسماں ہے نظر
ہے شدت سے برسات کا انتظار
پریشاں بہت ہے دل کاشت کار
کہ اب نکلے جاتے ہیں کھیتی کے دن
نہ دیکھیں کہیں، خشک سالی کے دن

پانی کی مسلسل اور مستقل موجودگی تمام طرح کی زندگیوں اور ان کی نشو ونما کے لیے از حد ضروری ہے۔ لیکن بڑھتی ہوئی آلودگی نے ذخیرۂ آب پر انحصار کرنے والے جانداروں اور پھلنے پھولنے والے نباتات کو خطرے میں ڈال دیا ہے۔

اردو کے نظم نگار شعرا نے فضائی آلودگی کے سبب آنے والی ماحولیاتی تبدیلیوں کو بھی پیش کیا ہے اور ان تبدیلیوں سے حیاتیاتی تنوع پر ظاہر ہونے والے منفی اثرات کو بھی موضوع بنایا ہے۔ لہٰذا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ شعرا نے بالواسطہ اور بلا واسطہ طور پر فضائی آلودگی کو موضوع بنا کر اردو طبقہ کو ماحولیات کے تئیں ذمہ داریوں کا احساس دلایا ہے تاکہ باہمی اتحاد و اتفاق سے فضائی آلودگی کو دور کرنے کے لیے سنجیدہ کوششوں کو جاری رکھا جا سکے۔

■

Dr. Simmi, C/o Mehar Wafa
226, Chandrabhaga Hostel, JNU
New Delhi - 110067

2016 کا فکشن

اسلم جمشید پوری

لیجیے، یہ سال بھی گزر گیا۔ ایسا لگ رہا ہے گویا ابھی کی بات ہو، جب ہم دسمبر 2015 میں سالِ نو کے منتظر تھے۔ وقت بھی کیا چیز ہے؟ کبھی رکتا نہیں، اپنی رفتار کے ساتھ چلتا ہی رہتا ہے۔ باقی سب چیزیں آتی جاتی رہتی ہیں۔ وقت ہمارے ساتھ چلتا ہے، ہمیں ایک مقام متعین پر پہنچا کر خود آگے بڑھ جاتا ہے۔ وقت ہی دراصل اس دنیا نامی ڈرامے کا مرکزی کردار ہے۔ کردار نہیں اسٹیج ہے۔ ہاں، کردار تو اپنا رول ادا کر کے چلے جاتے ہیں۔ اسٹیج نئے کرداروں کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ لمحے، گھنٹوں، دنوں اور مہ و سال سے صدی اور پھر زمانے کی شکل میں تبدیل ہونے والا وقت ساری دنیا کو چلاتا ہے۔ وقت کا جائزہ لینے والے اور قدر کرنے والے اپنے نقش ثبت کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ جاتے ہوئے سال میں ہمیں احتساب کرنا ہی چاہیے۔ 2016 بھی اپنی بارہ منزلیں پار کر گیا ہے۔ ان بارہ منزلوں میں کون سے قصے گڑھے گئے۔ کس کس کے فسانے عام ہوئے، 'آتشِ رفتہ کا سراغ' لگاتے لگاتے، 'نالۂ شب گیر' بھی سنے اور ابھی کسی نے بتایا تھا کہ 'جس دن سے'، 'چاند ہم سے باتیں کرتا ہے' اور ہم چاند سے باتیں کرنے میں ایسے مگن ہوئے کہ بھول گئے کہ 'گئودان کے بعد' کیا ہوگا۔ 'تخمِ خوں' سے کون سا 'گرداب' اٹھے گا۔ ہم حیران پریشان کھڑے سوچ ہی رہے تھے کہ 'لفظوں کا لہو' پینے اور 'روحزن' سے گذر کر 'قطرے کو گہر ہونے تک' کیا گذری ہوگی کہ 'نیلما' نے راوی (وقت) سے کہا، جلدی چلو...... ورنہ 'آخری سواریاں' بھی گذر جائیں گی۔ ہم نے جلدی سے قدم آگے بڑھائے کہ ہم سید محمد اشرف کی 'آخری سواریاں' کا دیدار ضرور کرنا چاہتے تھے۔ جی ہاں! سید محمد اشرف کے اس ناول نے 2016 کی ابتدا ہی سے خوب شور مچا رکھا تھا۔ 'نمبر دار کا نیلا' کے بعد اشرف کے ناول کا سب کو انتظار تھا۔ شافع قدوائی اور فرحت احساس کے ساتھ ساتھ جب قاضی عبدالستار نے ناول کی تعریف کی تو پھر ناول پڑھے بغیر سکون کہاں تھا۔ جوں جوں ناول آگے بڑھتا گیا، ناول کا قصہ، نادانی کے عہد سے شروع ہونے والی محبت کی زندہ کہانی اپنے بازوؤں میں جکڑتی چلی گئی۔ زمانہ ہوا، اتنا موثر رومان انگیز قصہ پڑھے ہوئے۔

سید محمد اشرف مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے محبت کے پاکیزہ جذبے کے ایک لطیف احساس کو لفظ لفظ گہرائی عطا کی ہے۔ انتہائی خاموشی سے جذبۂ محبت بڑھتے بڑھتے اچانک دائمی ہجر کی سنگلاخ چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتا ہے۔ ناول نگار نے کردار کے ذہن و دل سے تو اسے ہمیشہ کے لیے مٹا دیا اور کہانی کو دوسری سمت موڑ دیا لیکن قاری ہجر کے اس لمحے کا گواہ بنا جامد و ساکت کھڑا رہ جاتا ہے اور بعد کا پورا ناول وہ اسی شوق و تجسس اور تلاش میں پڑھتا ہے کہ چھوٹے میاں سے عمر میں بڑی، جمو ناول میں کہیں اچانک وارد ہو جائے اور محبت اپنی تکمیل کی طرف بڑھے۔ سید محمد اشرف کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے قصے میں اس رنگینی کو یکسر ختم کر کے قاری کو دائمی کسک عطا کر دی۔ لیکن قاری بعد کے ناول میں 'آخری سواریاں' کا انتظار اس لیے کرتا ہے کہ شاید اسے کہیں جمو نظر آ جائے۔ لیکن زندگی کی طرح ناول بھی ایک دوسری دنیا میں داخل ہو جاتا ہے اور سنجیدگی کا مظاہرہ کرتے، تہذیبی شکست و ریخت کا نوحہ پڑھتے ہوئے ایک بڑے تہذیبی و ثقافتی نقصان کی طرف ہلکے ہلکے اشارے کر کے ختم ہو جاتا ہے۔

'کہانی کوئی سناؤ متاشا' والی صادقہ نواب سحر 'جس دن سے...' لے کر حاضر ہوئیں۔ پہلے ناول میں ایک عورت کردار کی زندگی کے پت جھڑ کو کامیابی سے پیش کرنے کے بعد صادقہ نے 'جس دن سے...' میں ایک مرد کردار کی زندگی کی پیچیدگی کو نفسیاتی تحلیل کے ساتھ کامیابی سے پیش کیا ہے۔

کئی سال قبل سلمان عبدالصمد کے نام نے چونکایا تھا۔ سب کی توجہ معروف فکشن نگار عبدالصمد کی طرف گئی کہ ان سے کوئی رشتہ یا تعلق ہوگا مگر ایسا نہیں تھا۔ سلمان عبدالصمد ایک نوجوان قلم کار ہیں۔ فکشن اور فکشن کی تنقید کے حوالے سے جن نئے قلم کاروں نے ادب آسمان میں نئے حوصلوں کے ساتھ اپنے بال و پر پھیلائے ہیں، ان میں ایک جانا پہچانا نام سلمان عبدالصمد کا ہے۔ 'غضنفر کا فکشن' کتاب سے سلمان فکشن تنقید کے میدان میں داخل ہوئے۔ اب ایک ناول 'لفظوں کا لہو' لے کر آئے ہیں۔ واقعی یہ لفظوں کے لہولہان ہونے کا پس منظر اور منظر ہے۔ ایک نوجوان کھوکھلے نعروں۔ ٹی وی پر استعمال ہونے والے بھاری بھرکم لفظوں کی حقیقت سے پردہ اٹھاتا ہے۔ آج یعنی اکیسویں صدی کا یونیورسٹی کے ماحول میں (منظر) پڑھنے والا ایسا نوجوان جو مدارس (پس منظر) سے فارغ ہو کر آیا ہو، وہ دنیا کو دنیا کی خباثت اور رشتوں کی پامالی کو کس نظر سے دیکھتا ہے۔ سلمان نے اچھی کوشش کی ہے۔

صغیر رحمانی اپنے انداز اور اسلوب کے لیے جانے جاتے ہیں۔ ان کا نیا ناول 'تخم خوں' اسی سال شائع ہوا ہے۔ یہ ناول اپنے عہد کے ناولوں میں انفراد رکھتا ہے۔ صغیر رحمانی نے بڑی بے باکی اور ہنر مندی سے ایک ایسے موضوع کو اٹھایا ہے جو واقعی ہمت طلب ہے۔ بہار خصوصاً شمالی بہار اور جھارکھنڈ کے کچھ علاقے کافی عرصے سے ایک مسئلے نکسل واڑ سے جوجھ رہے ہیں۔ صغیر رحمانی نے بڑی ہمت اور حوصلے سے ایسے موضوع کو اٹھایا ہے اور یہی نہیں انھوں نے دلت ڈسکورس میں ناول تحریر کیا ہے اور خوب تحریر کیا ہے۔

رحمٰن عباس ہمارے ناول نگاروں میں اپنی الگ شناخت بنا چکے ہیں۔ ان کے کئی ناول 'خدا کے سائے میں آنکھ مچولی'، 'ایک ممنوعہ محبت کی کہانی' اور 'نخلستان کی تلاش' شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔ اس سال ان کا نیا ناول 'روحزن' شائع ہوا اور اس نے اردو حلقوں میں خاصی دھوم مچائی۔ ناول میں فرد کے اندرون کو عمدگی سے پیش کیا ہے۔ ناول میں بعض حضرات کو جنسی تلذذ بھی نظر آیا۔ لیکن رحمٰن کا کمال یہ ہے کہ وہ جنس جیسے موضوع سے بھی بہت کچھ نکال لاتے ہیں۔

'تین ناولٹ' ژولیاں کے تحریر کردہ ناولٹ ہیں۔ ژولیاں فرانسیسی نژاد ہیں اور پیرس کے نواحی علاقے پرووانس میں مقیم ہیں۔ ژولیاں ریڈ کراس سوسائٹی میں ملازم ہے۔ اسی سلسلے میں وہ ہندوستان بھی قیام کر چکے ہیں۔ اپنے تقریباً آٹھ سالہ قیام کے دوران ژولیاں نے

یوں تو سال گذشتہ میں خاصے افسانے شائع ہوئے۔ تقریباً ہر رسالے اور جریدے میں افسانوں کی اشاعت ہوتی رہی ہے۔ آجکل، ایوان اردو، نیا دور، زبان و ادب، آمد، نیا ورق، اسباق، شاعر، استفسار، ثالث، عالمی انوار تخلیق، صدف، نگینہ وغیرہ رسائل میں معیاری افسانے شائع ہوئے ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ رسائل کی بہتات نے افسانوں کی قلت کا احساس کرایا ہے۔ میں رسائل میں شائع ہونے والے افسانوں کے بجائے اس سال شائع ہونے والے افسانوی مجموعوں کا تذکرہ ضرور کرنا چاہوں گا۔

اردو کے ساتھ ساتھ ہندی بھی سیکھی۔ اردو میں انھوں نے اتنی مہارت حاصل کر لی کہ اپنا مافی الضمیر ادا کرنے لگے۔ ژولیاں نے ان تینوں ناولٹ (ساغر، میراجی کے لیے، منیر جعفری شہید) میں اپنے انداز میں فلسفیانہ اظہار کیا ہے۔ وہ اپنے کرداروں کے ذریعے سماج میں موجودہ نظام عالم کے منفی رویوں کے خلاف باغیانہ تیور پیدا کر رہے ہیں۔ ان کے ان تینوں ناولٹ کے حوالے سے پروفیسر فہیم حنفی لکھتے ہیں:

''میرا خیال ہے کہ موجودہ دور کے اردو فکشن کی روایت میں وہ ایک مختلف، منفرد اور طاقت ور جہت کے افسانے کا ذریعہ بھی بنے ہیں۔ ان کا مشاہدہ حیران کرنے والا ہے۔ بحیثیت ایک ادیب، ان کی انسان دوستی اور بشریت بھی مجھے غیر معمولی محسوس ہوتی ہے۔''

[تین ناولٹ، ژولیاں ص 11]

شموئل احمد نے اپنے افسانوں اور ناولوں سے ایک بار پھر چونکایا ہے۔ ادھر لگتا ہے، ہر سال ان کی کوئی نہ کوئی کتاب ضرور شائع ہو رہی ہے۔ لیکن آج بھی ان کی شہرت 'سنگھار دان' کے حوالے سے ہے۔ اس سال ان کا ناول 'گرداب' منظر عام پر آیا ہے۔ 'گرداب' آج کے سماجی اور سیاسی منظر نامے کے پس منظر اور پیش منظر کا قصہ ہے۔ شموئل احمد نے 'گرداب' کو اپنے انداز اور پیش کش سے کچھ اس طور تحریر کیا ہے کہ اسے پڑھتے ہوئے شموئل کی انفرادیت مترشح ہونے لگتی ہے۔

غزالہ قمر اعجاز نئی نسل خصوصاً اکیسویں صدی میں اپنی شناخت قائم کرنے والی افسانہ نگار ہیں۔ گذشتہ برسوں ان کا پہلا افسانوی مجموعہ 'چاند میرا ہے' شائع ہوا تھا۔ اب ان کا پہلا ناول 'قطرے پہ گہر ہونے تک' شائع ہوا ہے۔ غزالہ کے افسانوں میں بھی سماج کی ایک ایسی عورت نے سر ابھارا تھا جو سماج کے ظلم و ستم کے آگے سپر نہیں ڈالتی بلکہ سینہ سپر ہونے کا جذبہ رکھتی ہے۔ ان کے ناول میں بھی ان کے یہی تیور باقی ہیں۔ ناول کے نسوانی کردار زمانے کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتے ہیں اور اب وہ سماج کے غلط کو نہ صرف غلط سمجھتی ہیں بلکہ ان کے خلاف کھڑی بھی ہو جاتی ہیں۔

2016 میں افسانہ

یوں تو سال گذشتہ میں خاصے افسانے شائع ہوئے۔ تقریباً ہر رسالے اور جریدے میں افسانوں کی اشاعت ہوتی رہی ہے۔ آجکل، ایوان اردو، نیا دور، زبان و ادب، آمد، نیا ورق، اسباق، شاعر، استفسار، ثالث، عالمی انوار تخلیق، صدف، نگینہ وغیرہ رسائل میں معیاری افسانے شائع ہوئے ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ رسائل کی بہتات نے افسانوں کی قلت کا احساس کرایا ہے۔ میں رسائل میں شائع ہونے والے افسانوں کے بجائے اس سال شائع ہونے والے افسانوی مجموعوں کا تذکرہ ضرور کرنا چاہوں گا۔

بزرگ افسانہ نگار مسرور جہاں کا تازہ افسانوی مجموعہ 'خواب در خواب' اسی سال منظر عام پر آیا ہے۔ اس سے قبل ان کے کئی مجموعے خصوصاً 'اللہ تیری قدرت'، 'پل صراط'، 'آج کی سیتا'، 'کہاں ہو تم'، 'ہمیں جینے دو'، شائع ہو چکے ہیں۔ ''خواب در خواب'' میں کل بیس افسانے شامل ہیں۔ مسرور جہاں کا اپنا منفرد انداز ہے۔ وہ سماجی مسائل کو عمدگی سے لفظوں کے سانچے میں ڈھال کر افسانہ کرنے کا ہنر بخوبی جانتی ہیں۔ افسانہ 'جلاوطن' میں انھوں نے روزگار کے لیے خلیجی ممالک کا سفر کرنے والے جوانوں کے درد کو پیش کیا ہے۔ مسرور جہاں نے وطن سے دور اپنوں کی خوشیوں کے لیے مشین بن کر رہ جانے والے شخص کے کرب نے قاری کو اپنی گرفت میں لے لیا ہے۔ ایک اچھا افسانہ ہے۔ مجموعے کے کئی افسانے گڑیا، خواب در خواب، قفس، انتظار کی صدی، دھنک کے سات رنگ، اپنا سورج، اپنا چاند بہت اچھے افسانے ہیں۔

انیس رفیع کا تازہ کار افسانوی مجموعہ 'گداگر سرائے' منظر عام پر آیا ہے۔ انیس رفیع ہمارے کہنہ مشق افسانہ نگار ہیں۔ اس سے قبل ان کے دو مجموعے 'اب وہ اترنے والا ہے' اور 'کرفیو سخت ہے' شائع ہو چکے ہیں۔ 'گداگر سرائے' میں کل 28 افسانے شامل ہیں۔ مجموعے کا ٹائٹل افسانہ اپنی نوعیت کا انوکھا افسانہ ہے۔ یہاں افسانہ نگار نے

تاریخ کو حال میں مدغم کر کے ایک ایسا منظر نامہ ترتیب دیا ہے کہ تہذیب و ثقافت کا پس منظر، منظر سے ٹکرا کے لہولہان ہو رہا ہے۔ انیس رفیع نے علامتوں کا بھی سہارا لیا ہے۔ 'گداگر سرائے' ہمارے موجودہ عہد کا نوحہ ہے جسے انیس رفیع نے فنی مہارت اور دل سوز آواز میں گایا ہے۔

ناول کے لیے مشہور غضنفر نے افسانے بھی خوب لکھے ہیں۔ لیکن ان کی شناخت ناول نگار کے طور پر ہی مستحکم ہے۔ شاید یہی بات غلط ثابت کرنے کو غضنفر نے ادھر افسانوں پر زیادہ توجہ مرکوز کی ہے۔

گذشتہ آٹھ دس برسوں میں اردو فکشن میں جس نام نے تیزی سے اپنی مستحکم شناخت قائم کی ہے وہ شائستہ فاخری ہے۔ 2011 میں ان کا مجموعہ 'اداس لمحوں کی خود کلامی' منظر عام پر آیا۔ پھر 2013 میں ایک ناول 'نادیدہ بہاروں کے نشاں' 2014 میں ناول 'صدائے عندلیب برشاخ شب' اور اب بالکل تازہ تازہ 'وصف پیغمبری نہ مانگ' افسانوی مجموعہ...... بہت زیادہ لکھنا تعریف کی بات نہیں ہے، منتخب، معیاری اور مسلسل لکھتے رہنا کسی بھی تخلیق کار کو نہ صرف مقبولیت عطا کرتا ہے بلکہ اس کی شناخت کو استحکام بھی بخشتا ہے۔ شائستہ فاخری نے اپنی پہچان ایک سنجیدہ فکر رکھنے والی فکشن نگار کے طور پر بنائی ہے۔ ان کے ناولوں اور افسانوں کے کردار وہ کہتے نظر آتے ہیں جو شاید زمانے کے ہر شخص خصوصاً ہر عورت کی آواز ہے مجموعے کے زیادہ تر افسانوں میں (کل چودہ افسانے شامل ہیں) ایک مضطرب فرد کی بے چین روح کی وہی آواز ہے۔ افسانہ نگاری کے تعلق سے مصنفہ کا بیان ملاحظہ کریں:

''افسانہ نگاری آسان فن نہیں ہے، اس عمل میں مٹھی میں انگارے لے کر حقیقت کی زمین اور تخیل کے آسمان کو یکجا کر کے اسے اپنے اندر اتارنا ہوتا ہے اور پھر جو جوالے پھوٹتے ہیں، انھیں فنی آبشار سے ٹھنڈا کر کے افسانے کا خمیر تیار کیا جاتا ہے اور پھر اپنی قلمی صلاحیتوں سے ہم کہانی گھڑتے ہیں۔''

[وصف پیغمبری نہ مانگ، شائستہ فاخری، ص 14]

'خوشبوؤں کا جال' لے کر عشرت ظہیر بھی حاضر ہیں۔ ایک ایسا جال جو بظاہر خوشبوؤں کا ہے۔ لیکن یہ واہمے، وسوسے، خوف، تنہائی اور کائنات کی بے ثباتی پر محیط ہے۔ عشرت ظہیر جدید لب و لہجے کے پختہ کار افسانہ نگار ہیں۔ ان کے افسانوں کا Treatment دوسروں سے الگ ہے۔ ان کے افسانوں کی لفظیات علامت، تشبیہ و استعارے سے پر ہیں۔ مجموعے میں کل بیس افسانے شامل ہیں۔ پہلا اور ٹائٹل افسانہ ہی آپ کو اپنی فسوں طرازی کے جال میں الجھا دے گا۔ آپ نہ چاہتے ہوئے بھی ان کے طرز اظہار میں شامل ہو کر ایک بے کراں درد میں ڈوب جائیں گے۔

''میں اپنے چاروں طرف کمرے میں نگاہیں دوڑاتا ہوں۔ دواؤں کی شیشیوں سے اڑتی بکھرتی اور سارے وجود کو گھیرتی ہوئی، کچھ خوشگوار اور کچھ ناخوشگوار خوشبوؤں کو محسوس کرتا ہوں۔ میں ان دواؤں کی شیشیوں کے خوشبوؤں کے جال میں بری طرح گھر چکا ہوں۔ میں ان خوشبوؤں کے حصار سے ابھرنا چاہتا ہوں، یہ خوشبوئیں مجھے پاگل کیے دے رہی ہیں۔''

(خوشبوؤں کا جال: عشرت ظہیر ص 17-16)

اوب دروازے پر رینو بہل 'دستک' دے رہی ہیں۔ رینو بہل نے گذشتہ دس بارہ برسوں میں اپنی شناخت بطور افسانہ نگار قائم کی ہے۔ ان کے افسانوں میں معمولی واقعات بھی زندگی سے پر نظر آتے ہیں۔ وہ اپنے آس پاس کے مظلوم و مجبور کرداروں کی آواز کو افسانوں میں جگہ دیتی ہیں۔ 'دستک' ان کا تازہ افسانوی مجموعہ ہے جس میں تقریباً بیس افسانے شامل ہیں۔ اس سے قبل بھی ان کے کئی مجموعے اشاعت پذیر ہو گئے ہیں۔ وہ اپنے اندر کے اضطراب کے بارے میں خود لکھتی ہیں:

''کسی کمزور پر جبر، ظلم، تشدد ہوتے دیکھ کر بنا سوچے سمجھے پرائی آگ میں کود پڑتی۔ کبھی کسی معصوم بچے کا درد تو کبھی کسی بزرگ ماں کی تڑپ، کبھی کسی باپ کی مجبوری تو کبھی کسی بیٹی کی بے بسی، کبھی کسی خادم کی ذلت تو کبھی کسی سرمائے دار کی زیادتی، کبھی کسی لڑکی کی رسوائی تو کبھی کسی کی بے وفائی، کبھی کسی رشتے کی پامالی تو کبھی کسی کے اعتماد کا بے رحم قتل غرض یہ کہ اپنے گرد و پیش کی ہر چھوٹی بڑی بات میری طبیعت کو متاثر کیے بنا نہ رہتی اور میری اضطرابی کیفیت بڑھ جاتی۔ اس وقت میرا قلم ساری دنیا کے درد کو سمیٹ کر کہانی کی شکل میں کاغذ پر ایسے بکھر جاتا کہ میری بے قرار روح کو قرار آ جاتا۔''

[دستک، رینو بہل، ص 9]

سلمیٰ صنم کی آمد اس بار 'پانچویں سمت' سے ہوئی ہے۔ اس سے قبل ان کے دو افسانوی مجموعے 'طور پر گیا ہوا شخص' اور 'پت جھڑ کے لوگ' شائع ہو چکے ہیں۔ سلمیٰ صنم کی افسانہ نگاری کی خوبی سائنسی حقائق کو عمدگی سے افسانوں میں ڈھالنا ہے اور عورت کے اندر ظلم کے خلاف طاقت بھرنا ہے۔ اس مجموعے کے کئی افسانے قاری کو اپنی جانب ضرور متوجہ کریں گے خصوصاً سورج کی موت، آرگن بازار، میری، تھکی ہوئی ناری اور پانچویں سمت، آپ کو بہت دنوں تک یاد رہیں گے۔

تنویر اختر رومانی اپنی زندگی بھر کی کمائی 'ببول' کی شکل میں لے کر حاضر ہوئے ہیں۔ تنویر اختر رومانی کے اس پہلے مجموعے 'ببول' کو ان کے اب تک کے افسانوی سفر کا انتخاب بھی سمجھا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ مجموعے میں متعدد خوبصورت، عمدہ اور معیاری کہانیاں ہیں۔ ببول، دنگل، بھروسہ، روٹی مانگتی زندگی، بند مٹھی کا کرب، جس پہ تکیہ تھا، بدولت، چالیسواں سنگ میل، پردھان جی، بڑے لان والا آدمی، تیسرا طوفان وغیرہ اچھی کہانیوں کے زمرے میں آتی ہیں لیکن جہاں تک نمائندہ اور زندہ رہنے والی کہانیوں کی بات ہے تو دنگل، ببول، بھروسہ، چالیسواں سنگِ میل، پردھان جی، روٹی مانگتی زندگی تنویر اختر رومانی کو استحکام بخشیں گی۔

'اشفاق برادر' اپنے 'احساس میں گھلتی برف' سے پریشان ہیں۔ یہ آج انسان کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ اپنے پرکھوں کی نشانیوں کو بے نشان کرنے، ان کے وجود کو مٹانے پر آمادہ ہے۔ اشفاق برادر کا یہ احساس انھیں ایک عجیب کرب میں مبتلا کر دیتا ہے۔ بزرگوں کی حویلی کو دوسرے فروخت کرنے پر تلے ہیں۔ نئے زمانے کی ضرورتیں منہ پھاڑے کھڑی ہیں اور یادیں نئے نئے منظر زندہ کر رہی ہیں۔ ایسے ہی ایک حساس فن کار اپنے کرب کو افسانے کے قالب میں ڈھالنے کے سوا کر بھی کیا سکتا ہے۔ 'احساس میں گھلتی برف' میں تقریباً 39 افسانے شامل ہیں۔ یہ افسانے سماج کی مختلف تصویریں ہیں اور ان سب میں احساس کی برف ہے جو کبھی پگھل کر پانی بن جاتی ہے تو آنکھوں تک سے غائب ہو جاتی ہے اور کبھی مضبوط چٹان بن جاتی ہے اور ہر طوفان سے ٹکرانے کا حوصلہ موجزن کر دیتی ہے۔

'اس کی خوشبو اکثر آتی ہے' ڈاکٹر عامر مصطفےٰ صدیقی کا پہلا افسانوی مجموعہ ضرور ہے، لیکن ان کے قلم میں پختگی ہے۔ دراصل عامر مصطفےٰ صدیقی نے عمر کی چھٹی دہائی میں افسانے لکھنا شروع کیا ہے۔ اس عمر میں تجربے اور مشاہدے تو ہوتے ہی ہیں۔ عامر صاحب نے اس مجموعے میں 32 افسانے اور افسانچے شامل کیے ہیں۔ افسانوں اور افسانچوں کے موضوعات میں بوقلمونی پائی جاتی ہے اور کردار بھی روزمرہ کے جیتے جاگتے انسان ہیں۔

ایم رحمٰن اپنے پہلے افسانوی مجموعے 'صلیب نیم شب' کے ساتھ صلیب زدہ وارد ہوئے ہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ ان افسانوں میں سماج کا نوحہ ہے۔ 'مٹی کے رنگ' میں سالک جمیل نے پنجاب کے رنگ دکھانے کی

کامیاب کوشش کی ہے۔ محمد عمر فاروق کا 'جنون' بھی دیکھنے اور پڑھنے کے لائق ہے۔ ایک نوجوان کا درد و کرب کب غصے اور جنون میں بدل جاتا ہے، یہ ان کے افسانوں میں بخوبی دیکھا جاسکتا ہے۔ محمد طارق کا نیا مجموعہ 'آتش پارے' بھی سماج کے اندر کی آگ کو فنی مہارت سے پیش کرتے ہیں۔ راقم کا افسانوی مجموعہ 'عیدگاہ سے واپسی' جو سال گذشتہ (2015) میں شائع ہوا تھا، اس سال اس کا دوسرا ایڈیشن (پروفیسر حسین الحق، ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی، اور ابرار مجیب کے مضامین کے ساتھ) شائع ہوا۔ شہناز رحمن کا اولین افسانوی مجموعہ 'نیرنگ جنوں' بھی منظر عام پر آیا۔

فکشن تنقید میں اس بار کئی نام نئے ہیں۔ نئی نسل جسے ہم اکیسویں صدی کی نسل بھی کہہ سکتے ہیں۔ فکشن کی تنقید میں ایسے کئی نام شامل ہوئے ہیں جنھوں نے امیدوں کو نئے سرے سے زندہ کیا ہے۔ غالب نشتر کی کتاب 'مظہرالاسلام کا فکشن' شائع ہوئی ہے۔ اس میں انھوں نے مظہرالاسلام کے فکشن پر کھل کر بحث کی ہے اور تقریباً سوا سو صفحات سیاہ کیے ہیں۔ انھوں نے مظہرالاسلام کی نمائندہ کہانیوں کو بھی کتاب میں شامل کیا ہے۔

اس سال اردو فکشن کے کئی معروف ناقدین کی تنقیدی کتب بھی شائع ہوئی ہیں۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم کی معروف تنقیدی کتاب 'اردو فکشن کی تنقید' جو گذشتہ صدی کے آخر میں شائع ہوئی تھی اور ادبی حلقوں میں کافی سراہی گئی تھی، کا ترمیم و اضافہ شدہ ایڈیشن اس سال شائع ہوا ہے۔ تنقید کے تعلق سے بہت سارے ابہام اور اشکال کی عمدہ تشریح و توضیح کرنے والی یہ کتاب ریسرچ اسکالرز کے لیے خاصی مفید ہے۔

پروفیسر ابوالکلام قاسمی کی کتاب 'اردو فکشن کے مضمرات' فکشن پر تحریر کردہ ان کے مختلف مقالے ہیں۔ کتاب کا خاص پہلو مضامین کی ترتیب ہے۔ پہلے حصے میں نذیر احمد، پریم چند، قرۃ العین حیدر، عصمت چغتائی، بیدی، منٹو، پر اور دیگر موضوعات پر مضامین، دوسرے حصے میں کفن (پریم چند)'، آخری آدمی (انتظار حسین)، لکڑبگھا چپ ہوگیا (سید محمد اشرف) اور آگ کے اندر راکھ (عبدالصمد) کے تجزیے اور تیسرے حصے میں فکشن کے اہم کرداروں اور ان کی اہمیت پر بحث شامل ہے۔

پروفیسر علی احمد فاطمی کی کتاب 'ناول کی شعریات' بھی اس سال شائع ہوئی ہے۔ 'ناول کی شعریات' میں پروفیسر علی احمد فاطمی نے متعدد نئے اور پرانے ناول نگاروں اور ناولوں پر نہایت پرمغز مضامین لکھے ہیں۔

سید تحسین علی حق نے 'لہولہان اردو افسانہ' میں تقسیم،

2016 میں متعدد ادبا و شعرا نے ہمارا ساتھ چھوڑ دیا۔ فکشن نگاروں میں کئی اہم نام اب تاریخ کا حصہ بن گئے۔ داستانوی اسلوب کے مالک اردو کے بین الاقوامی شہرت یافتہ فکشن نگار، انتظار حسین رخصت ہوئے۔ 'کتاب' کے ذریعے دھوم مچانے والے معروف افسانہ نگار عابد سہیل بھی داغ مفارقت دے گئے۔ قومی یکجہتی کی علامت اردو کے معروف فکشن نگار جوگندر پال نے بھی ہمیشہ کے لیے منہ پھیر لیا۔ ریوتی سرن شرما بھی روٹھ گئے۔ پیغام آفاقی اور م۔ناگ جیسے نئی نسل کے ناول نگار اور افسانہ نگار بھی ابدی نیند سو گئے۔

دہشت پسندی اور فسادات کے منظر اور پس منظر میں تحریر کردہ افسانوں پر عمدہ مقالہ تحریر کیا ہے۔ انھوں نے ہندوستان میں فسادات اور دہشت پسندی کا اجمالی جائزہ پیش کرتے ہوئے تاریخ مرتب کرنے کی کوشش کی ہے ساتھ ہی 1980 سے قبل اور بعد میں ہوئے فسادات اور دہشت پسندی کے واقعات اور ان کے پس منظر میں لکھے گئے افسانوں کا بخوبی جائزہ لیا ہے۔

ضیاء اللہ نور نے 'شیریں کتھا' میں ممتاز شیریں کے فکشن کا بخوبی جائزہ لیا ہے۔ ڈاکٹر علاؤالدین خاں اپنی کتاب 'ممتاز مفتی: ایک مطالعہ' میں ممتاز مفتی کے افسانوں اور ناولوں کا عمدہ تجزیہ کرتے نظر آتے ہیں۔ 'ہم قلم' میں بشیر مالیر کوٹلوی نے اپنے ہم عصر افسانہ نگاروں کے تعلق سے اپنی بے باک رائے کا اظہار کیا ہے۔

ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی کی مرتبہ کتاب 'صالحہ عابد حسین: فکری و فنی جہات' نے صالحہ عابد حسین کی ناول نگاری، افسانہ نگاری اور حیات کے گوشوں کو مختلف زاویوں اور انداز سے پیش کر کے صالحہ فہمی کی نئی راہیں متعین کی ہیں۔

2016 میں کئی رسالوں نے ناول نمبر شائع کیے۔ اس کی شروعات پٹنہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے سالانہ 'اردو جرنل' کے ہم عصر ناول نمبر سے ہوئی۔ 16-2015 کی مدت کے لیے جاری اس جرنل نے خاصی شہرت حاصل کی۔ اس کے فوراً بعد قومی اردو کونسل برائے فروغ اردو زبان کے تحقیقی رسالے 'فکر و تحقیق' کا ناول نمبر شائع ہوا۔ فکر و تحقیق کے تقریباً سوا چار سو صفحات پر محیط اس نمبر میں اردو ناول خصوصاً نئے ناول پر متعدد مضامین شائع ہوئے۔ ناول کے فن اور ناولوں پر تنقیدی مضامین کے علاوہ ناول تنقید، ہندوستانی جامعات میں ناولوں پر تحقیق اور بہت ہی کارآمد اردو ناولوں کی ایک فہرست، ساتھ ہی ناول پر تنقیدی مضامین کی بھی ایک فہرست شائع کی گئی۔ معروف ناول نگار رتن سنگھ، سید محمد اشرف، حسین الحق، اقبال مجید، نورالحسنین، ترنم ریاض اور صادقہ نواب سحر کے، اپنے ناولوں کے تعلق سے اظہار بھی شامل ہے۔ ایک بے حد کارآمد شمارہ، جسے خاصی مقبولیت حاصل ہوئی۔

'دربھنگہ ٹائمز' نے اپنے نوجوان مدیر ڈاکٹر منصور خوشتر کی نگرانی میں پہلے افسانہ نمبر اور اب ناول نمبر، شائع کر کے ادبی حلقوں خصوصاً فکشن حلقوں میں خاصا شور برپا کیا ہے۔ ناول نمبر میں ناول کے فن پر خاصے وقیع مضامین کے ساتھ ساتھ نئے ناولوں کے تجزیے اور تنقیدی مضامین بھی شامل کیے گئے ہیں۔ چند زیر تخلیق ناولوں کے ابواب، ناول نمبر کی اہمیت و افادیت میں اضافہ کر رہے ہیں۔

مونگیر سے شائع ہونے والے رسالے 'ثالث' نے اپنی منفرد شناخت قائم کی ہے۔ یہ سہ ماہی رسالہ محترم اقبال حسن آزاد کی ادارت میں وقت پر مسلسل شائع ہو رہا ہے۔ ثالث کا فکشن نمبر جو شمارہ 10-9 ہے تقریباً 448 صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ فکشن نمبر میں ناول اور افسانے پر مضامین، افسانوں کا انتخاب، مائکرو فکشن، ناول کا باب اور پیغام آفاقی پر ایک گوشہ شامل ہے۔ ثالث کی خوبی بیرونی ممالک کے تخلیق کاروں کی تخلیقات کی اشاعت ہے۔

2016 میں متعدد ادبا و شعرا نے ہمارا ساتھ چھوڑ دیا۔ فکشن نگاروں میں کئی اہم نام اب تاریخ کا حصہ بن گئے۔ داستانوی اسلوب کے مالک اردو کے بین الاقوامی شہرت یافتہ فکشن نگار، انتظار حسین رخصت ہوئے۔ 'کتاب' کے ذریعے دھوم مچانے والے معروف افسانہ نگار عابد سہیل بھی داغ مفارقت دے گئے۔ قومی یکجہتی کی علامت اردو کے معروف فکشن نگار جوگندر پال نے بھی ہمیشہ کے لیے منہ پھیر لیا۔ ریوتی سرن شرما بھی روٹھ گئے۔ پیغام آفاقی اور م۔ناگ جیسے نئی نسل کے ناول نگار اور افسانہ نگار بھی ابدی نیند سو گئے۔

اس طور کہا جاسکتا ہے کہ 2016 فکشن کے تعلق سے خاصا یادگار سال رہا۔

■

Dr. Aslam Jamshedpuri
HOD, Urdu, CCS University
Meerut- 200005 (UP)
Mob.:9456259850
E-mail.: aslamjamshedpuri@gmail.com

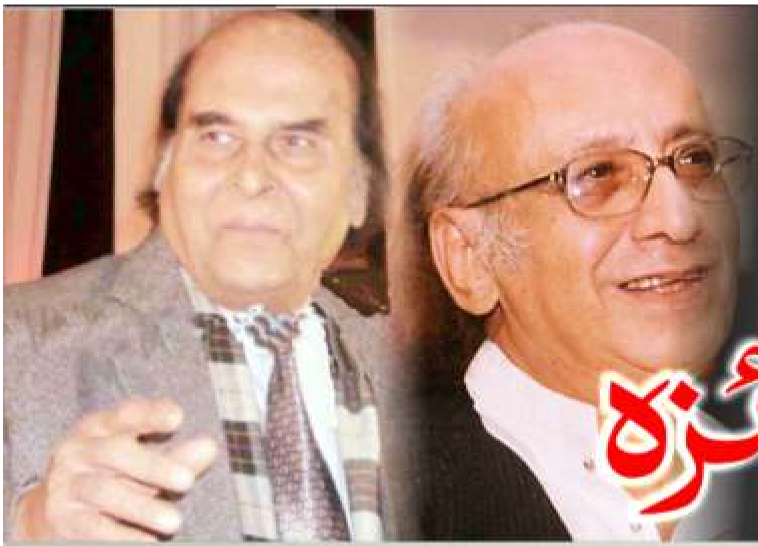

2016 کا ادبی جائزہ

عبدالرحیم اشتر

2016 — اہم ترین ادبی واقعات کا نہیں، نہایت سنگین ادبی و علمی سانحات کا سال رہا۔ اس برس اردو زبان و ادب کے بلند مینار ٹوٹ گئے — چاند ستارے ڈوب گئے — شعر و نغمہ، افسانہ و ناول، تنقید و تحقیق، ڈرامہ و تھیٹر اور صحافت و ادبی صحافت کی جو قابل رشک کہکشاں جگمگا رہی تھی اس نے دل و نظر میں اندھیرا ہی اندھیرا بھر دیا ہے۔ کچھ بھائی نہیں دیتا کس کس کو روئیے اور کس کس کا ماتم کیجیے۔ سال بھر میں تقریباً دو سو ادبی اموات — !اللہ کی پناہ!! گویا اکیسویں صدی کا اردو ادب یتیم ہوگیا — وہ سارے نام (عابد سہیل، انتظار حسین، ندا فاضلی، پروفیسر شکیل الرحمٰن، جوگندر پال، سیدہ جعفر، انور سدید، اسلم فرخی، ملک زادہ منظور احمد، زبیر رضوی، بیکل اُتساہی، پروفیسر اسلوب احمد انصاری، عبداللہ حسین، جاوید اقبال، بشر نواز، سرور عثمانی، عتیق مظفر پوری، محبوب الرحمٰن فاروقی، اقبال متین، رئیس الدین رئیس اور م ناگ سے لے کر ظہیر غازی پوری و منظر شہاب تک — وہ سارے نام جن سے کل تک مختلف ادبی اصناف میں زندگی دوڑ رہی تھی اور جن سے عالمی ادب میں اردو تخلیق کاروں کے نام قابل رشک مقام و مرتبہ حاصل کر رہے تھے۔ سال گذشتہ نے وہ سارے نام ہم سے چھین لیے۔ مرضی مولیٰ! حالانکہ بیشتر اہل قلم مرضی مولیٰ کے قائل نہیں ہیں لیکن جب فرشتۂ اجل آ کھڑا ہوتا ہے تو زبان گنگ ہوجاتی ہے۔ آستک ہو یا ناستک موت سب کو اٹھالے جاتی ہے۔

جانے والوں کی یادوں سے پورا سال روشن رہا۔ اخبارات، رسائل اور جرائد میں جانے والوں کی یادیں بھی تازہ ہوتی رہیں اور ان کے کارناموں اور کارگزاریوں کے تذکرے بھی ہوتے رہے۔ سال کے آخر آخر شماروں میں یاد رفتگاں کے اجالے جابہ جا بکھرے ہوئے دکھائی دیے۔ ماہنامہ 'آجکل' ماہنامہ 'اردو دنیا' اور 'اردو بک ریویو' نے بہترین خراج عقیدت پیش کیا۔ دانش گاہوں، ادبی تنظیموں اور انجمنوں نے جلسۂ ہائے تعزیت کا انعقاد کیا۔

2016 میں ادبی تحقیق اور تصنیف و تالیف کے سلسلے حسب سابق جاری رہے۔ شعری مجموعوں کی اشاعت میں سال گذشتہ بھی بڑی برکت رہی۔ اردو بستیوں اور ادبی شہروں کے علاوہ دور دراز کے غیر معروف مقامات سے بھی شاعری اپنے وجود اور مقام و مرتبے کا اعلان کرتی رہی۔ جن شعری مجموعوں کی ادبی حلقوں میں دھوم رہی اور جن شاعروں کو مبصروں اور ناقدوں نے سنجیدہ خراج تحسین پیش کیا ان میں مظفر حنفی کا 'چنیدہ' سب سے آگے رہا۔ غضنفر کا شعری مجموعہ 'آنکھ میں لکنت' اور تفضیل احمد کا شعری مجموعہ 'ٹکسال' بھی پیش پیش رہے۔ گذشتہ سال مشاہیر کے انٹرویوز کا ایک مجموعہ 'خانۂ تکلم' کے نام سے اکرم نقاش نے پیش کیا۔ یہ کتاب قارئین کی توجہ کھینچنے میں خاصی کامیاب رہی کیونکہ اس کتاب میں شمس الرحمٰن فاروقی، گوپی چند نارنگ، وارث علوی، فضیل جعفری، محمد علوی، ندا فاضلی، بشر نواز، بلراج کومل، خلیل مامون، اکرام باگ اور خالد جیسی مقتدر ہستیوں سے مکالمہ قائم کیا گیا ہے۔ ان سب سے نہایت بے تکلف، کھلے ڈلے، اہم اور سنگین سوالات و استفسار کیے گئے۔ جوابات بھی نہلے پر دہلا والے انداز میں نہایت بے لاگ اور بے باکانہ طرز پر ملے۔ انٹرویوز کا یہ مجموعہ بڑے انکشاف کا حامل ہے۔

فکشن کے باب میں بھی 2016 نے مایوس نہیں کیا۔ سال گذشتہ بعض ادبی رسائل میں افسانوں کی خاصی دھوم رہی۔ اقبال مجید، رتن سنگھ، سید محمد اشرف، حسین الحق، ذکیہ مشہدی، بلراج بخشی، غضنفر، شائستہ فاخری، محمد بشیر مالیرکوٹلوی، ف س اعجاز، ڈاکٹر اسلم جمشید پوری، نورالحسنین، راجیو پرکاش ساحر، صادقہ نواب سحر، عظیم راہی، ابواللیث جاوید، دیپک بدکی، آنند لہر، نیسین احمد، بیگ احساس، سلام بن رزاق، م ناگ، سید ظفر ہاشمی، غزالہ قمر اعجاز، دیپک کنول، شرافت حسین، مراق مرزا اور نواب رونق جمال کی افسانوی تخلیقات کو گذشتہ سال قارئین کی پسندیدگی حاصل رہی۔ سلام بن رزاق مہاراشٹر کے اردو افسانے کا سب سے بڑا اور معتبر نام ہے لیکن سال گذشتہ میں ان کے نام کسی بڑے اور یادگار افسانے کا عنوان نہیں جڑا۔ سلام صاحب گذشتہ سال یادنگاری اور مشہور و معروف افسانوں کی تجزیہ نگاری میں مصروف رہے اور انھوں نے ایک اہم اور بڑے کام کو بحسن و خوبی انجام دیا۔ گذشتہ سال سلام بن رزاق کی ایک اہم کتاب 'تذکرے' شائع ہوئی جو پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

م۔ ناگ کی موت اردو افسانچہ نگاری کی موت ہے۔ م ناگ نے جتنے برجستہ، بے ساختہ اور کسے ہوئے افسانچے تحریر کیے یہ گویا انھیں کا حصہ تھا۔ وہ جوگندر پال اور رتن سنگھ کے بعد اردو افسانے کا تیسرا بڑا نام تھے۔ 21 اکتوبر 2016 کی شام م ناگ کی شمع حیات گل ہوگئی۔ اسی شام ان کا آخری افسانہ 'لٹکی ہوئی عورت' ہندوستانی پرچار سبھا کی محفل افسانہ میں اظہر عزیز صاحب نے اپنی زبانی پیش کیا تھا۔ ادھر افسانہ ختم ہوا اور ادھر مصنف کی داستانِ حیات اختتام کو پہنچی۔ اردو افسانچے کو م ناگ نے جو وقعت و رفعت عطا کی تھی وہ ان کے ساتھ جاتی رہی۔ م ناگ کے معاصرین میں اس پائے کے افسانچے نہیں پائے جاتے۔ انھوں نے افسانچہ نگاری کی روایت کا حق ادا کردیا۔

گذشتہ برس بھی اردو کے متعدد ادبی اور غیر ادبی رسائل شائع ہوتے رہے۔ ان میں سے بعض رسائل کا انتظار قارئین کو رہا اور بعض رسائل قاری کا انتظار کرتے رہے۔ اکثر رسائل ایسے بھی ہیں جن کی پذیرائی اور دلچسپی کا محور یا تو شعبۂ ادارت رہا یا وہ اہل قلم جن کی 'تخلیقات' ان رسائل میں شائع ہوئیں۔ ماہنامہ 'کتاب' لکھنؤ کے مدیر عابد سہیل نے کہا تھا۔ یہاں چھوٹا کون ہے؟ اردو میں چھوٹا کوئی ہے ہی نہیں! تو کچھ رسالے محفوظ کرلیے جاتے ہیں۔ کچھ تماشی مطالعے کی میز تک جا پہنچتے ہیں اور کچھ رسائل 'ملٹی پرپزیز' کے لیے رہ جاتے ہیں۔ ذیل میں رسائل کی نا تمام فہرست درج ہے۔

ماہنامہ 'آجکل' دہلی' ماہنامہ 'کتاب نما' ماہنامہ 'اردو

دنیا' دہلی، ماہنامہ 'ایوانِ اردو' دہلی، ماہنامہ 'حیات' دہلی، ماہنامہ 'پیش رفت' دہلی، ماہنامہ 'بیسویں صدی' دہلی، ماہنامہ 'سائنس'، سہ ماہی 'سائنس کی دنیا' دہلی، ماہنامہ 'یوجنا' دہلی، سہ ماہی 'اردو ادب' دہلی، سہ ماہی 'فکر و تحقیق' دہلی، سہ ماہی 'اردو بک ریویو' دہلی، سہ ماہی 'ادب ساز' دہلی، عالمی اردو ادب دہلی، اندازِ بیاں (سالنامہ)، سہ ماہی 'نئی کتاب' دہلی، ہفتہ وار 'ہماری زبان' دہلی، ماہنامہ 'نیا دور' لکھنؤ، ماہنامہ 'نگیبن' لکھنؤ، سہ ماہی 'آمد' پٹنہ، سہ ماہی 'دسترس' دھنباد، ماہنامہ 'کسوٹی جدید'، ماہنامہ 'تحریرِ نو' نئی ممبئی، ماہنامہ 'تریاق' ممبئی، سہ ماہی 'اردو چینل' ممبئی، سہ ماہی 'اردو' امراوتی، سہ ماہی 'ہندوستانی زبان' ممبئی، سہ ماہی 'نیا ورق' ممبئی، ماہنامہ 'بیباک' مالیگاؤں، ماہنامہ 'ادبی محاذ'، ماہنامہ 'شاندار'، 'سالانہ' 'ادبی گزٹ'، ماہنامہ 'قرطاس'، ناگپور، ماہنامہ 'اردو میلہ' ناگپور، ماہنامہ 'الفاظِ ہند' کامٹی، ماہنامہ 'شاعر' ممبئی ___ اور ___ دیگر ڈھیر سارے رسائل و جرائد کی بھیڑ میں خالص ادب کے مخلص قارئین کو 2016 میں 'خبرنامہ شب خون' کے بند ہو جانے سے شدید صدمہ پہ خبرنامہ 'شب خون الہ آباد میں ماہنامہ 'شب خون' کا عکس بھی ہوتا تھا اور روح بھی! اب یہ خبر یقیناً دل خراش ہے کہ 'شب خون' کا یہ روپ بھی ہمیشہ کے لیے نظروں سے اوجھل ہو گیا ہے۔ 'شب خون' کی طرح خبرنامہ بھی ایک مکمل کتاب کی طرح بھرپور ہوا کرتا تھا۔

زبان و ادب اور ادبی صحافت کے حال مارے سے مراد یہ ہے کہ بیشتر رسائل محض مخصوص گوشوں کی اشاعت سے قائم ہیں اور بعض تو پھول پھل بھی رہے ہیں۔ ہر چند کہ اس بدعت کے آغاز و اجرا کا سہرا مدیرِ شاعر افتخار امام صدیقی کے سر بندھتا ہے لیکن انھوں نے فقط کاروباری اغراض کو حاوی نہیں ہونے دیا اور رسالے کی ادبی روح کو سلامت رکھ کر اپنے تحفظ کا گوشہ بھی نکال لیا ہے چنانچہ اپنے تجارتی گوشوں کے باوجود ماہنامہ 'شاعر' ایک معیاری اور قابلِ قدر رسالہ قرار پاتا ہے۔ یہ فخر و مسرت کا مقام ہے کہ قدیم ترین خالص ادبی رسائل میں سب سے اونچے مقام پر ماہنامہ 'شاعر' آج بھی قائم و دائم ہے۔ 1930 میں حضرت سیماب اکبرآبادی نے جو چراغ جلایا تھا اسے حضرتِ اعجاز صدیقی نے ناموافق و ناسازگار ہواؤں کے تند و تیز جھکڑوں میں بھی پوری طرح سے محفوظ و مامون رکھا تھا اور اب اس بھاری پتھر کو معمر و معذور شاعر و ادیب اور نمایاں ترین ادبی صحافی افتخار امام صدیقی نے بحسن و کمال تمام رکھا ہے۔ غیر سرکاری ادبی رسائل میں ماہنامہ شاعر ہی وہ جاندار و شاندار رسالہ ہے جس نے نہ صرف برصغیر بلکہ عالمی اردو بستیوں میں بھی تہلکہ مچا رکھا ہے۔ ہر ماہ ایک دو ادبی شخصیتوں کے گوشے ہونے کے باوجود قارئین کو مایوس و تشنہ نہیں رکھتے اور وہ گوشہ گیر تخلیق کار کے ساتھ ساتھ متعلقہ ادبی خصوص کو بھی اجالتے چلے جاتے ہیں۔ متنوع پیش کش اور قدرت کاری ماہنامہ 'شاعر' کا خاصہ رہا ہے۔ اعجاز صدیقی صاحب نے شاعر کو ایک بلند پایہ اور عالی مرتبت رسالہ بنا رکھا تھا۔ ان کے زمانے میں شائع ہونے والے سالنامے، خاص نمبر اور دیگر خصوصی اشاعتیں آج تک یاد کی جاتی ہیں۔ انھوں نے ساٹھ کی دہائی میں جو کرشن چندر نمبر شائع کیا تھا (قیمت صرف دس روپے) اس کی ٹکر کا نمبر کوئی دوسرا رسالہ آج تک پیش نہیں کر سکا۔ خصوصی اشاعتوں کے باب میں افتخار امام صدیقی بھی لاجواب ہیں۔ ان کی ادارت میں ہر شمارہ ایک خصوصی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ اپنی صدی پوری کرنے جا رہے ماہنامہ 'شاعر' کا پوری اردو دنیا پر ادبی قرض ہے اور اسے اس طرح ادا کیا جا سکتا ہے کہ چھوٹے بڑے ہر شہر اور گاؤں میں ماہنامہ 'شاعر' کے سالانہ خریداروں کی تعداد میں اضافہ کیا جائے۔

ادارۂ ادبیاتِ اردو حیدرآباد سے شائع ہونے والے قدیم و متوازن علمی و ادبی ماہنامے کے مدیر پروفیسر بیگ احساس نے ماہنامہ 'سب رس' کے دسمبر کے شمارے میں اپنے اداریے کا آغاز و اختتام مندرجہ بالا لفظوں میں کر کے گویا یہ بتا دیا کہ ادیب ہو، شاعر ہو، یا اور کوئی فنکار وہ اپنے گرد و پیش، اپنے معاشرے اور گرو میں لیتے ہوئے حالات سے آنکھیں موند کر نہیں بیٹھ سکتا۔ حالات اسے کچوکا لگائیں گے تو وہ تڑپے گا ضرور اور ضمیر کی پکار پر لبیک کہے گا۔ اسی آگ، تپش اور تڑپ کو اس تخلیق و تحریر میں تاثر کی شدت کے ساتھ خلق ہونا چاہیے۔ مطلب یہ نہیں کہ وہ صرف اپنے گرد و پیش اور شب و روز کی فوٹوگرافی پر اکتفا کرلے بلکہ اسے اپنی تخلیق و تحریر میں وہ شعاعِ جاں فروز بھی رکھنی چاہیے جس سے موجودہ حالات کو بدلا جا سکے۔

بیگ احساس ماہنامہ 'سب رس' حیدرآباد جیسے قدیم اور تاریخ ساز ادبی رسالے کے ایک سلجھے ہوئے مدیر ہی نہیں، ایک دردمند، خلاق افسانہ نگار بھی ہیں۔ گذشتہ برس بھی ان کے کچھ افسانوں کا چرچا رہا۔ ماہنامہ 'سب رس' اعلیٰ درجے کے ادبی رسائل میں ایک ممتاز مقام و مرتبے کا حامل ہے جس کے مطالعے سے ادبی ذوق کی سیری بھی ہوتی ہے اور تسکین بھی۔

سہ ماہی 'ہندوستانی زبان' یوں تو برسوں سے جاری

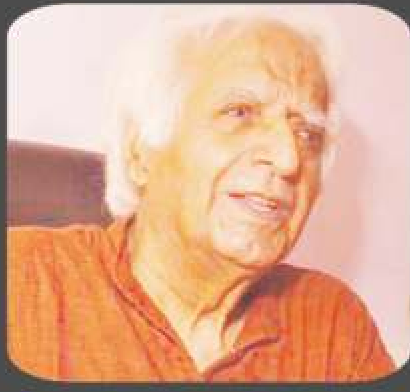

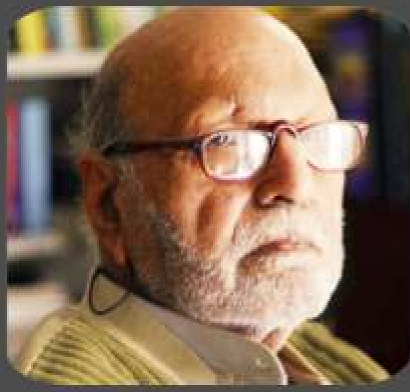

تھا لیکن گذشتہ سال اس کی کمان اطہر عزیز کے ہاتھوں سونپی گئی۔ یہ وہی اطہر عزیز ہیں جو برسوں پہلے کٹک اڑیسہ سے پروفیسر کرامت علی کرامت کے ساتھ ماہنامہ 'شاخسار' کو سینچتے سنوارتے رہے ہیں۔ ممبئی پہنچے تو ظ انصاری جیسے مدیر کی صحبت میں انقلاب کو نکھارا۔ اشاعتی ادارے ایڈ شاٹ سے کتنی ہی خوبصورت اور قابل ذکر ادبی کتابوں کو زیور طباعت سے آراستہ کیا۔ ان کی آمد سے 'ہندوستانی زبان' کو نئی زندگی اور نئی پہچان نصیب ہوئی۔ سید علی عباس کے ساتھ انھوں نے 2016 میں سال کے چاروں شمارے بروقت بھی شائع کیے اور اردو حلقوں نے ہندوستانی زبان کی دل کھول کر مدح سرائی بھی کی۔

شہرت کی للک آدمی سے کیا کچھ نہیں کرواتی۔ لوگ کیسے کیسے پاپڑ بیلتے ہیں۔ کیا کچھ جتن کرتے ہیں۔ اپنی جیب اور جان کو بھی داؤں پر لگا دیتے ہیں مگر ہزار جھکنڈوں کے باوجود یہ دلفریب حسینہ گچا دے ہی جاتی ہے۔ جب دیدۂ ہوش جاگتا ہے تو کھلتا ہے کہ ابھی تک جسے شہرت سے تعبیر کر رہے تھے، وہ تو محض خوش فہمی کا کہرا تھا۔ شہرت تو بے نیازوں کے دامن سے لپٹتی ہے۔ فقیروں اور قلندروں کے ساتھ چلتی ہے۔ درویشوں کے راستے کا غبار بن جاتی ہے۔

ایسے ہی ایک قلندر ہیں شری نند کشور وکرم! مالک رام کی طرح، کالیداس گپتا رضا، مہر لال سونی، ضیا فتح آبادی، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، اور فکر تونسوی یا نریش کمار شاد جیسے شہرت سے بے نیاز، بے پروا قدرت نے جو وصفِ خاص ودیعت کیا بس اس کا اظہار (مظاہرہ) کرتے رہے۔ اسے ہی نکھارتے رہے۔ سنوارتے رہے۔ برتتے رہے اور بانٹتے رہے۔ اردو زبان و ادب سے جو محبت ان کے دل میں تھی، اس محبت کے تقاضوں کی تکمیل میں پورے خلوص، اور پوری بے غرضی سے لگے رہے۔ اردو زبان و ادب اور تہذیب و تاریخ کی نمایاں نشانیوں میں انھیں ہرگز فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

ادبی صحافت میں ان کا بڑا مقام ہے۔ دیوندر اسر، اوپندر ناتھ اشک، ریوتی سرن شرما اور کرشن چندر کی ہم نشینی اور رفاقت نے انھیں بھی شمع اردو کا پروانہ بنا دیا اور ابھی عمر صدی کے قریب ہوتے ہوتے بھی وہ اردو زبان و دب کی بے لوث خدمت میں جٹے ہوئے ہیں۔ 'عالمی اردو ادب' ان کے عشقِ اردو کا بہترین اظہار نامہ ہے۔ اگست 2016 اور دسمبر 2016 میں 'عالمی اردو ادب' کے دو ضخیم اور یادگار شمارے منظرِ عام پر آچکے ہیں۔

مناظر عاشق ہرگانوی اردو کے معروف اور صف اول کے لکھاری ہیں۔ انھوں نے ادب کے اچھوتے موضوعات پر اچھوتے انداز میں لکھا ہے۔ وہ ایک کشادہ ظرف اہل قلم ہیں۔ ان کی تخلیقات سکہ بند نہیں ہوتیں۔ سال بھر ان کی تخلیق اور تصنیف و تالیف کے سلسلے جاری رہتے ہیں۔ ان کا سہ ماہی رسالہ 'کوہسار' ادبی حلقوں میں بڑے ذوق و شوق کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔

آج کے بچے ہی مستقبل کے ادبی قاری ہیں لہٰذا انھیں کتاب دوست بنانا بڑوں کا فرض بھی ہے اور ذمے داری بھی— آج بھی بچوں کے بہت اچھے رسالے پابندی سے شائع ہو رہے ہیں۔ ماہنامہ 'نور'، ماہنامہ 'ہلال'، ماہنامہ 'اچھا ساتھی'، ماہنامہ 'گل بوٹے'، ماہنامہ 'گلشنِ اطفال'، ماہنامہ 'امنگ'، اور ماہنامہ 'بچوں کی دنیا' چند ایسے رسالے ہیں جو بچوں کی ادبی تہذیب و تربیت میں بہترین رول ادا کر رہے ہیں۔ ان رسائل کا ہر ایک اردو گھر میں پڑھنا اور پڑھایا جانا بہت ضروری ہے۔ انھی رسائل کے مطالعے سے بچوں میں ادب کے سمجھنے اور اس سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت پیدا ہوگی۔

خوشی کی بات ہے کہ 2016 کے ننھے قارئین اچھے رسالوں اور اچھی کتابوں سے محروم نہیں رہے۔ گذشتہ سال بھی ادب اطفال کے تحت نظم و نثر کی متعدد کتابیں شائع ہوئیں۔ سرکاری رسالے تخلیقات کا معقول معاوضہ بھی پیش کرتے ہیں اور تخلیقات سلیقے سے شائع بھی ہوتی ہیں۔ ماہنامہ 'امنگ' دہلی نے تو نہیں لیکن قومی اردو کونسل دہلی کے ماہنامہ 'بچوں کی دنیا' نے غیر سرکاری بچوں کے رسائل کو پریشانی میں ڈال دیا تھا۔ اتنی کم قیمت (صرف دس روپے) میں اتنا خوبصورت، اتنا دلکش، اتنا بھرپور مواد، اتنی اچھی سیٹنگ اور اتنی عمدہ طباعت، دوسرے رسائل جو بیس روپے سے کم میں دستیاب نہ تھے۔ 'بچوں کی دنیا' کے سامنے ٹک نہ سکتے تھے پھر بھی غیر سرکاری مدیرانِ اطفال نے اپنے پاؤں نہ اکھڑنے دیے۔ ماہنامہ 'گل بوٹے' کے مدیر فاروق سید نے تو عزم و حوصلے اور ثابت قدمی کی مثال قائم کردی۔ بلاشبہ گل بوٹے بچوں کا سب سے پسندیدہ رسالہ ہے اور بڑی تعداد میں شائع ہوتا ہے۔ گل بوٹے نے ادیبوں اور شاعروں کا ایک ہجوم بھی پالیا ہے جو باقاعدگی سے بچوں کا ادب بھی تخلیق کر رہے ہیں۔ مالیگاؤں سے رحمانی سلیم احمد کے رسالے گلشنِ اطفال نے بھی بچوں کو اپنا گرویدہ بنا رکھا ہے۔

حکومتِ ہند— اور اکثر ہندوستانی ریاستیں بھی سرکاری رسائل و جرائد کے ذریعے اردو زبان و ادب کی نمایاں خدمت انجام دے رہی ہیں۔ ماہنامہ 'آجکل' دہلی، حکومت ہند کا سرکاری رسالہ ہے جو 75 برسوں سے زبان و ادب کی دنیا میں نہایت سربلند ہے۔ اسے ہمیشہ قد آور اور سرفراز علمی و ادبی مدیروں کا ساتھ ملا۔ سید وقار عظیم اور جوش ملیح آبادی کے دور ادارت کا تو پوچھنا ہی کیا۔ ان کے دور میں بڑے بڑے ادیب اور شاعر بھی آجکل میں شائع ہونے کو بہت بڑا اعزاز اور کامیاب اہل قلم ہونے کی سند مانتے تھے۔ آجکل کے سابق مدیر حسن ضیا کے مطابق ''اردو میں ادبی صحافت کے بڑے نقشے پر منفرد حیثیت حاصل کرنے کے لیے آجکل نے ایک طویل سفر طے کیا۔ اردو کا کوئی ادبی رسالہ اپنی مقبولیت کو برقرار رکھتے ہوئے اپنی عمر کے 76 سال پورے کرلے تو یہ بڑی بات ہے۔''

آجکل کو 75 سال کے اپنے سفر میں خوش قسمتی سے ایسا عملہ میسر آیا جو حکومت کے ضوابط کا پابند رہا۔ شعر و ادب کے اعلیٰ ذوق کا حامل بھی رہا اور اپنی ادارتی ذمے داریوں کا پاسدار بھی رہا۔ محمد یعقوب دواشی، وقار عظیم، جوش ملیح آبادی، عرش ملسیانی، جگن ناتھ آزاد، بلونت سنگھ، مہدی عباس حسینی، شہباز حسین، نند کشور وکرم، شیو ناتھ سنگھ، راج نرائن راز اور محبوب الرحمٰن فاروقی سے لے کر عابد کرہانی، خورشید اکرم اور موجودہ مدیر ڈاکٹر ابرار رحمانی تک سب نے پوری جانفشانی کے ساتھ اپنی بہترین صلاحیتیں اور وقت اس رسالے کی نذر کرتے ہوئے اپنے فرائضِ منصبی کو مثالی انداز میں نبھایا۔''

حکومت اترپردیش کے سرکاری رسالے 'نیا دور' کی بھی اپنی ایک تاریخ ہے۔ آجکل کے بعد نیا دور نے اپنے خاص نمبروں کی بہتات کے ساتھ علمی و ادبی حلقوں میں اپنی ایک مخصوص شناخت قائم کرلی ہے۔ اس کے موجودہ مدیر ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی نے 2004 سے 2016 کے دوران کم و بیش 20 خاص نمبر ایسے شائع کیے جنھیں علم و ادب کے خزانے سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ ماہنامہ آندھرا پردیش حیدرآباد، روح ادب کولکاتا، شیرازہ سرینگر کشمیر، اور چند ایسے ہی ریاستی ادبی رسالے عید کا چاند بن گئے ہیں۔ کبھی دکھائی دیتے ہیں، کبھی اوجھل ہو جاتے ہیں۔ اڈیشہ سے 'فروغ ادب' دو چار اچھے شمارے پیش کیے تھے لیکن 2016 میں اس کا کوئی شمارہ ہاتھ نہیں لگا۔ کرناٹک اردو اکادمی کا 'اذکار' اکرم نقاش کی ادارت میں قابل توجہ اور قابل ذکر تو ضرور رہا لیکن پابندی اشاعت اس کے نصیب میں بھی نہیں۔

■

Abdur Raheem Nashtar
Plot No.: 7, Behind Markaz, Teachers Colony,
Jafir Nagar, Nagpur 440013 (Maharashtra)

اردو زبان کی بین الاقوامی شہرت

ٹی آر رینا

کسی زمانے میں اردو زبان کے لیے ایک جملہ رائج کیا گیا تھا کہ 'یہ گنگا جمنی تہذیب کی نشانی' ہے۔ یہ بات پرانی ہوچکی ہے، ہم اب اسے 'بین الاقوامی تہذیب کی نشانی' کہہ سکتے ہیں۔ اس کرہ ارض پہ بولی جانے والی بڑی بڑی زبانوں کا ادب اس میں منتقل ہورہا ہے اور یہ سلسلہ تب سے جاری ہے جب سے ہندوستان میں فورٹ ولیم کالج کلکتہ کا قیام 10 جولائی 1800 مطابق 4 ساون 1857 سمیت اور 17 صفر 1215ھ عمل میں آیا تھا۔ 4 مئی 1799 کو انگریزی افواج نے میسور کے دارالسلطنت سرنگاپٹم میں ٹیپو سلطان کو شکست دی، انھوں نے شہادت پائی جس سے دکن کا قریب قریب اور شمالی ہند کا بہت سا علاقہ انگریزوں کے قبضے میں آگیا۔ فورٹ ولیم کالج کی طرز پر انھوں نے سینٹ جارج کالج مدراس کا قائم کیا۔

فورٹ ولیم کالج میں جو مضامین پڑھائے جانے طے ہوئے ان میں مشرقی زبانیں (عربی، فارسی، سنسکرت، ہندستانی، بنگلہ، تیلگو، مرہٹی اور تامل)، قوانین، تجارتی و کاروباری، یورپ کی جدید زبانیں، تاریخ اور سائنس شامل تھے۔

ان مضامین پہ نظر ڈالنے سے آپ اندازہ کرسکتے ہیں کہ انگریز کس طرح اپنے نووارد سول اور فوجی افسروں کے ذریعے ہندوستان میں ایک مستحکم حکومت قائم کرنا چاہتے تھے۔ کالج کے نظم ونسق کے لیے پانچ رکنی کونسل کی تشکیل دی گئی جس میں پرنسپل، وائس پرنسپل اور تین ممبر اور شامل تھے۔ ہندوستانی شعبے کا منتظم ڈاکٹر جان گل کرسٹ مقرر ہوا۔

فروری 1801 میں گل کرسٹ نے کالج کونسل کی اجازت سے اُن سے ایک پریس اور ٹائپ کا سامان اپنی تحویل میں لے لیا تاکہ نصابی کتابوں کی طباعت کا سلسلہ شروع کیا جاسکے۔ 1801 کے شروعاتی دو ماہ میں گل کرسٹ کی نگرانی میں گیارہ کتابیں تصنیف، تالیف یا ترجمہ ہوچکی تھیں۔ ان کی طباعت اسی 'ہندوستانی پریس' سے شروع ہوئی تھی۔ ان میں سے چھ ناگری اور پانچ فارسی (اردو رسم الخط) میں تھیں۔

9 اگست 1803 تک چودہ (14) اردو میں اور دو (2) ناگری میں طبع ہوئیں۔ چھ کتابوں میں پانچ اردو میں تھیں جن میں قرآن شریف کا ترجمہ بھی شامل تھا اور ایک ناگری میں تھی۔ طباعت کے لیے تین اردو میں تیار ہوچکی تھیں۔ طباعت کے لیے جو تیار کی جارہی تھیں ان میں بائیس اردو میں اور ایک ناگری میں تھی۔

اردو کی ترقی وترویج کے لیے گل کرسٹ کا یہ ایک ناقابل فراموش کارنامہ ہے۔ قریب ساٹھ کتابوں کی تیاری کے لیے اس نے اپنے توسط سے بیالیس منشی کالج میں مقرر کروائے تھے اور آٹھ ایسے حضرات کی خدمات حاصل کی تھیں جو باقاعدہ کالج کے ملازم نہیں تھے۔

کالج کونسل کے ساتھ کسی معاملے میں گل کرسٹ کا اختلاف سامنے آیا اور وہ مارچ 1804 میں استعفیٰ دے کر انگلستان روانہ ہوگیا۔ لیکن ہندوستان میں انگریزوں کی حکومت کی بنیاد کو مستحکم بنانے کے لیے اردو زبان کا جو بنیادی پتھر اس نے رکھا تھا وہ آج تک قائم ودائم ہی نہیں بلکہ اس پہ بین الاقوامی شہرت کی عمارت کھڑی ہے۔

1824 میں دہلی کالج کا قیام عمل میں آیا۔ اس کا ذریعہ تعلیم بھی اردو ہی تھا مگر کالج میں انگریزی کا شعبہ بھی قائم کیا گیا تھا اور اس کی طرف بھی طلبہ کو راغب کیا جاتا تھا۔ اس شعبے میں طلبہ کی تعداد کم ہی ہوا کرتی تھی۔ ابتدا میں تعلیم لکچروں کے ذریعے دی جاتی تھی، بعد میں انگریزی اور فارسی سے اردو میں ترجمہ کی ہوئی کتابیں بھی مہیا کی جانے لگیں۔ مسٹر ٹیلر کالج کے پرنسپل تھے۔ پروفیسر رام چندر اور اسسٹنٹ پروفیسر پنڈت اجودھیا پرشاد نہایت اہم شخصیات کے مالک تھے۔ مشرقی علوم یعنی عربی، فارسی کی تعلیم زبان اردو میں دی جاتی تھی۔ مولوی امام بخش صہبائی فارسی کے استاد تھے۔ دہلی کالج سے فارغ التحصیل ہونے والوں میں مولوی نذیر احمد، ماسٹر پیارے لال آشوب، مولانا محمد حسین آزاد، مولانا حالی، مولوی ذکاء اللہ، مولوی شہامت علی، ڈاکٹر مکند لال اور ڈاکٹر چمن لال قابل ذکر ہیں۔ انھوں نے اردو ادب کی ترقی اور اپنے اپنے میدان میں کافی نام پیدا کیا۔ 1842 میں پروفیسر رام چندر اور مولانا صہبائی نے ایک انجمن بنائی جس کے تحت انگریزی اور فارسی سے ترجمہ کی ہوئی کتابیں تیار کی جاتی تھیں جن کی طباعت دہلی میں ہوتی تھی۔ بعد میں ایسی کتابیں آگرہ، لکھنؤ اور بنارس سے بھی تیار ہوکر آتی تھیں۔ پنجاب میں بھی کئی مطبعے قائم ہوچکے تھے۔

وقت کی نوعیت کو دیکھتے ہوئے انگریزوں نے ایک اور اہم قدم اٹھایا جو اردو زبان کی ترقی کے لیے سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ 1832 میں انھوں نے فارسی کے بجائے اردو کو سرکاری زبان کا درجہ قرار دیا۔ جو کام پہلے فارسی میں ہوتا تھا وہ اب اردو میں ہونے لگا۔ ملک کے طول وعرض میں اردو کی ترقی کا سلسلہ تیزی سے آگے بڑھنے لگا۔ عدالتوں، دفتروں، صوبہ جات کے درمیان لین دین اور خط وکتابت اردو میں ہونے لگی۔

اس وقت ہندوستان کی جتنی بھی ریاستیں تھیں اور جنھیں ذرا سا سکون میسر تھا وہاں کے نوابین، امرا و جاگیردار شعرا حضرات کو اپنے یہاں ملازم رکھتے تھے۔ دل بہلانے کا مشاعروں اور ادبی محفلوں کے علاوہ اور کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ درباروں میں ہر شام ادبی محفلیں گرم ہوتیں، جن میں نوابین اور ان کے اہل کار تشریف فرما ہوتے، شعرا حضرات ایک دوسرے کے مدمقابل بیٹھ جاتے اور محفل میں شعرخوانی کا سلسلہ شروع ہوتا، ایک دوسرے کے کلام پہ فنی تنقید ہوتی، نوآموز شعرا کے کلام کو سن کر انھیں عروضی خامیوں سے آگاہ کیا جاتا۔ حالاں کہ کوئی بھی نوآموز اپنا کلام استاد کو دکھائے بغیر محفل میں نہیں پڑھتا تھا۔ استادی شاگردی کا ایک سلسلہ قائم تھا۔

دہلی کالج کے قیام اور اردو کو سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہونے کے بعد ملک میں اردو کتابوں کی مانگ بڑھنے لگی۔ اس کمی کی شدت کو محسوس کرتے ہوئے نواب

شمس الامرا نے حیدرآباد میں 1834 میں ایک سنگی چھاپہ خانہ قائم کیا جس سے انگریزی زبان سے اردو میں ترجمہ کی ہوئی کتابیں شائع ہونے لگیں۔ سب سے پہلے اس مطبع سے 1250ھ مطابق 1834 میں جو کتاب منظر عام پر آئی وہ 'رسالہ علم ہیئت' تھی۔ اس کے بعد اس دارالترجمہ سے سائنسی کتب کی اشاعت کا ایک سلسلہ جاری ہوا۔ تصنیفی و تالیفی حیثیت سے اس ادارے کو ایک خاص موقف حاصل ہوگیا۔ اسی ادارے سے 1839 میں 'علم اسطرلاب کروی' و 'شمس الہندسہ' شائع ہوئیں۔ 1842 میں 'رسالہ علم حساب' 1845 میں رسالہ نظام شمسی و آلۂ اربری، اور 1850 میں 'تحفۂ گردان' علم ہیئت سے متعلق شائع ہوئیں۔

لارڈ ڈلہوزی نے 29 مارچ 1849 کے ایک معاہدے کے مطابق پنجاب کو انگریزی حکومت میں شامل کرلیا، اس کی خودمختاری ختم ہوگئی۔ پنجاب میں الحاق سے قبل بہت سے چھاپہ خانے قائم ہو چکے تھے جن سے فارسی اخبار اور کتابیں شائع ہوتی تھیں۔ اردو کا پہلا ہفتہ وار اخبار کوہِ نور 14 جنوری 1850 کو لاہور سے جاری ہوا اس کا اپنا مطبع تھا۔ اس کے مالک و مدیر منشی ہرسکھ لال تھے۔

ان کا جھکاؤ حکومت کی طرف تھا۔ لہٰذا سرکاری بک ڈپو کی انگریزی سے اردو زبان میں ترجمہ کی ہوئی کتابوں اور دوسرا چھپائی کا سارا کام انہی کے مطبعے میں ہوتا تھا۔ بعد میں یعنی 1856 میں انھوں نے اسی مطبعے سے اردو ماہنامہ 'خورشید پنجاب' جاری کیا تھا۔ اب بڑی تعداد میں نصابی اور دوسری کتابیں عوام کو ملنے لگی تھیں۔ جب سے اردو زبان سرکاری اور عدالتی زبان قرار دی گئی اس سے قبل یہاں کے ہندو مسلمان دونوں اس زبان سے برابر مانوس تھے۔

1857 کی بغاوت کے دوران مولوی محمد باقر، جنھوں نے 1836 میں دہلی سے 'دہلی اردو اخبار' جاری کیا تھا، کو حکومت کے خلاف احتجاجی تحریر لکھنے کے جرم میں پھانسی کی سزا دی گئی۔ مولوی محمد باقر ادبی دنیا میں دوسری ایسی شخصیت تھے جنھیں ادبی جرم میں پھانسی دی گئی۔ پہلے شاعر جعفر زٹلی ہیں جنھیں اورنگ زیب کے جانشینوں میں سے شہزادہ فرخ سیر نے احتجاجی شاعری کے جرم میں دہلی ہی میں 1125ھ طابق 1713 میں چمڑے کے تسمے سے گلہ گھنٹوا کر مروا دیا تھا۔

مولوی محمد باقر کے فرزند مولانا محمد حسین آزاد کو بھی انگریز تلاش کررہے تھے۔ وہ دہلی سے بھاگ نکلے۔ لکھنؤ اور کشمیر ہوتے ہوئے۔ 1864 میں لاہور وارد ہوئے اور سررشتۂ تعلیم میں ملازم ہوگئے۔ بعد میں ماسٹر پیارے لال آشوب (جو دہلی سے لاہور چلے آئے تھے) کی وساطت سے میجر فلر ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم تک رسائی ہوئی۔ میجر فلر کے بعد کرنل ہالرائڈ ڈائرکٹر تعلیم ہوئے۔ انھیں بھی ڈاکٹر جان گل کرسٹ کی طرح زبان اردو کا محسن سمجھنا چاہیے۔

آزاد نے لاہور آتے ہی یہاں کے شعرا حضرات کے ساتھ مل کر 'انجمنِ پنجاب' کی بنیاد ڈالی تھی اور اگست 1867 میں اسی انجمن میں انھوں نے قدیم شاعری کی خامیوں پر ایک لکچر دیا تھا۔

اردو زبان کی خوش نصیبی دیکھیے کہ فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں ڈاکٹر جان گل کرسٹ نے جدید اردو نثر کی بنیادوں کو مستحکم کیا اور لاہور میں کرنل ہالرائڈ نے آزاد و حالی کی سرپرستی کرکے جدید اردو شاعری کی بنیادوں کو استوار کیا۔ 'انجمن پنجاب' کی اصل بنیاد کب پڑی اور اس کے تخیل کا محرک کون تھا اس کا مختصر خاکہ آگے آئے گا۔

آزاد کو معلوم تھا کہ دکنی شعرا میں سلطان محمد قلی، نصرتی اور شاہی وغیرہ کے ہاں نیچرل شاعری کا اچھا خاصا ذخیرہ موجود ہے اور شمالی ہند کے متقدمین، متوسطین اور متاخرین کے کلام میں بھی بعض حضرات کے یہاں اس کے خال خال نقوش نظر آتے ہیں۔ لیکن نظیر اکبرآبادی جنھوں نے میر اور سودا سے لے کر 16 اگست 1830 تک کی طویل عمر پائی انھیں جدید نظم کا موجد کہہ سکتے ہیں۔ شاعری کے تینوں ادوار کا انھوں نے اثر قبول نہیں کیا، دہلی کا رنگ ان پر چڑھ نہ سکا اور لکھنؤ کا رنگ انھیں چھو نہ سکا۔ وہ آزاد طبیعت پیدا ہوئے تھے اور آزاد ہی مرے۔ 'انجمن پنجاب' سے جس شاعری کی بنیاد پڑی اس کا بنیادی پتھر نظیر اکبرآبادی بہت پہلے رکھ چکے تھے۔

1869 میں شیفتہ کے انتقال کے بعد حالی بھی تلاش معاش کی خاطر لاہور چلے آئے۔ حالانکہ 1857 کے ہنگامے سے لے کر 1869 تک پورے بارہ سال حالی شیفتہ کے ساتھ رہے۔ حالی گو غالب کے شاگرد تھے مگر ابتدائی شاعری میں انھوں نے مومن سے اثر قبول کیا اور بعد میں سب سے زیادہ یہ شیفتہ کے خیالات سے متاثر ہوئے۔

1870 میں لاہور آنے کے بعد انھیں گورنمنٹ بک ڈپو میں ڈائرکٹر کی وساطت سے انگریزی سے اردو میں ترجمہ کی ہوئی کتابوں کی عبارت کو درست کرنے کے کام پہ مامور کیا گیا۔ یہاں بھی یہ انگریزی سے اردو میں ترجمہ کی ہوئی عبارت کے ذریعے سے انگریزی زبان کی خوبیوں سے واقف ہوئے۔ یہاں آنے سے قبل حالی کے دل میں قدیم شاعری کی رسمی باتوں اور عامیانہ خیالات کے لیے نفرت پیدا ہوچکی تھی۔ بک ڈپو کی ملازمت کے دوران ترجموں کو دیکھتے ہوئے ان کے خیالات میں اور زیادہ پختگی آگئی۔ جلد ہی حالی 'انجمن پنجاب' کے ایک اہم رکن بن گئے۔

1857 کے ہنگامے سے ہندوستانی ریاستوں پہ زوال آیا، مگر اردو زبان کی ترقی و ترویج میں نکھار آیا۔ محمد حسین آزاد، پیارے لال آشوب، پنڈت من پھول، مولوی سید احمد مولف 'فرہنگ آصفیہ' مولوی کریم الدین اور خواجہ الطاف حسین حالی ایک ساتھ لاہور میں جمع ہوگئے۔

1874 میں محمد حسین آزاد نے کرنل ہالرائڈ کی مدد سے 'انجمن پنجاب' کی سرپرستی میں ایک ایسے مشاعرے کا اہتمام کیا جس میں اردو شاعری کی قدیم روش سے ہٹ کر حقیقت و اصلیت کی روح پر زور دیا گیا۔ آزاد نے نئے خیالات پہ ایک لکچر دیا ساتھ ہی شام کی آمد اور رات کی کیفیت پہ اپنی ایک مثنوی بھی سنائی۔ مشاعرے میں آزاد اور حالی کے علاوہ بہت سے شعرا حضرات نے شرکت کی۔ 'انجمن پنجاب' کی سرپرستی میں اب اس قسم کے مشاعرے مسلسل ہونے لگے۔ ان میں شاہ انور حسین ہما، مرزا اشرف بیگ، منشی الٰہی بخش رفیق، آزاد، مولوی قادر بخش، مولوی عطاء اللہ اور حالی اپنی اپنی نظمیں پڑھتے۔ حالی نے 1874 کی چار نشستوں میں اپنی چار نظمیں برکھا رت، نشاطِ امید، مناظرۂ رحم و انصاف، اور حب وطن پڑھیں۔ آزاد نے شب قدر، حب وطن، خواب امن، ابر کرم، اور صبح امید جیسی مشہور نظمیں پڑھیں۔

اردو زبان کی خوش نصیبی دیکھیے کہ فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں ڈاکٹر جان گل کرسٹ نے جدید اردو نثر کی بنیادوں کو مستحکم کیا اور لاہور میں کرنل ہالرائڈ نے آزاد و حالی کی سرپرستی کرکے جدید اردو شاعری کی بنیادوں کو استوار کیا۔ 'انجمن پنجاب' کی اصل بنیاد کب پڑی اور اس کے تخیل کا محرک کون تھا اس کا مختصر خاکہ آگے آئے گا۔

حالی 1874 میں لاہور سے دہلی روانہ ہوگئے مگر آزاد نے لاہور میں رہ کر قریب بائیس سال تک جدید شاعری کے تیسرے دبستان کی آبیاری کی جس کی داغ بیل انھوں نے ڈالی تھی۔ آزاد نے پنجاب کے اسکولوں کے لیے ابتدائی درجوں کے نصاب کی کتابیں فارسی و اردو

میں تحریک کی جس سے پورے پنجاب میں اردو کی تعلیم کا پھیلاؤ ہوا۔ وہ اردو اخبار 'اتالیق پنجاب' اور 'پنجاب میگزین' کے سب ایڈیٹر بھی رہے۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں عربی وفارسی کے پروفیسر بھی ہوئے۔ کام کے دباؤ اور اکلوتی بیٹی کی بے وقت موت سے 1889 میں ان پہ جنون کے آثار نمایاں ہونے لگے مگر انھوں نے 'انجمن پنجاب' کی ادبی محفلوں میں کمی واقع نہیں ہونے دی۔ اردو کے فروغ کے لیے لاہور پورے ہندوستان میں ایک مثالی مرکز بن چکا تھا۔

شمالی ہند میں اردو کی ترقی سے متعلق بات کو آگے بڑھانے سے قبل ہم اسی دور کے دکن پہ ایک نظر ڈالنا چاہتے ہیں کہ وہاں اردو زبان کے فروغ کے لیے کیا کیا اقدام اٹھائے گئے۔

نواب میر محبوب علی خاں نے اپنے دور 19 ذی الحجہ 1292ھ مطابق 1875 جامعہ نظامیہ حیدرآباد کی بنیاد رکھی دکن کی یہ پہلی مذہبی یونیورسٹی تھی جس کا طرز تعلیم اردو مقرر کیا گیا۔ یونیورسٹی کے مذہبی نصاب کی کمی کو پورا کرنے کے لیے انواراللہ فضیلت جنگ نے 1302ھ مطابق 1882 میں 'دائرۃ المعارف' قائم کیا۔ جہاں سے عربی زبان کی نادرونایاب کتابوں کے اردو ترجمے شائع ہونے لگے۔ یہ ترجمے صرف یونیورسٹی کی کمی کو ہی پورا نہیں کرتے تھے بلکہ ملک کے دور دراز مکتبوں تک پہنچنے لگے۔ اس اشاعتی ادارے سے چالیس علوم پہ بے شمار کتابیں شائع ہوئیں۔

1911 میں میر محبوب علی خاں کے انتقال کے بعد ان کے فرزند نواب میر عثمان علی تخت نشین ہوئے۔ انھوں نے ریاستی تعلیمی نظام کے لیے ایک کمیٹی کی تشکیل کی جس نے پوری ریاست کے سبھی درجوں کے نصاب کو مرتب کیا۔ جس میں تاریخ، جغرافیہ، حساب، سائنس اور دیگر علوم کو شامل کیا گیا۔ ان سبھی علوم کی کتابوں کو اردو میں تیار کرنے اور اشاعت کی ذمے داری بابائے اردو مولوی عبدالحق کے سپرد کی گئی جو اس وقت انجمن ترقی اردو اورنگ آباد کے سربراہ تھے۔ دکن حیدرآباد کا یہ دوسرا ایسا ادارہ تھا جس نے اردو کتابوں کی اشاعرت کی طرف خاص طور سے توجہ کی۔

میر عثمان علی خاں نے 1918 میں یونیورسٹی جامعہ عثمانیہ قائم کیا، مگر ایک سال قبل 14 اگست 1917 کو وہ دارالترجمہ عثمانیہ حیدرآباد کی بنیاد رکھ چکے تھے تاکہ یہ ادارہ انگریزی سے مختلف علوم کی کتابوں کو اردو میں ترجمہ کرکے نصابی ضرورت کو پورا کر سکے۔ اس ادارے نے سائنس، انجینئرنگ، میڈیسن، قانون، علوم، عمرانیات جیسے علوم کے انگریزی کتابوں سے ترجمے شائع کیے۔ 1917 سے لےکر 1948 تک پورے 31 سالوں تک اس دارالترجمہ نے آکسفورڈ اور کیمبرج کی یونیورسٹیوں کے نصاب کی طرز کی کتابیں تیار کیں۔ 1950 میں جب کہ ہندوستان سے سفید فام انگریز پہلے ہی جا چکے تھے سیاہ فام انگریزوں نے جامعہ عثمانیہ کے نظام کو اردو کے بجائے انگریزی میں بدل دیا تو دارالترجمہ سے اردو کتابوں کے ترجمے کا سلسلہ بند ہوگیا۔

شمالی ہند کی نسبت جنوبی ہند تعلیمی میدان میں بہت آگے تھا۔ 1875 میں جامعہ نظامیہ حیدرآباد کی بنیاد پڑ چکی تھی۔ 1882 میں 'دائرۃ المعارف' جیسا اشاعتی ادارہ بھی وجود میں آچکا تھا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ گویہ پہلی مذہبی یونیورسٹی تھی مگر اس کا طرز تعلیم اردو تھا۔ اس سے قبل نواب شمس الامرا حیدرآباد کے سنگی چھاپہ خانے کا ذکر آچکا ہے جس نے 1834 سے لےکر 1850 تک بہت سی کتابیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کراکر سائنسی مضامین پہ شائع کردی تھیں۔

حالانکہ سرسید جیسے قومی رہنما نے 1863 میں غازی پور میں سائنٹفک سوسائٹی کی بنیاد رکھی جس کا مقصد یہ تھا کہ انگریزی سے عمدہ ومفید کتابوں کے اردو ترجمے کرا کے سائنسی علوم پہ شائع کیے جائیں تاکہ عوام نئے علوم سے بہرہ ور ہوں اور ان کے ذہنوں کے دریچے کھلیں۔ اگلے ہی سال یعنی 1864 میں انھوں نے یہاں ایک مدرسے کا سنگ بنیاد بھی رکھا۔ انہی کی کوششوں سے 8 جنوری 1877 کو وائسرائے وگورنر جنرل ہند لارڈلٹن نے مع لیڈی لٹن کے سہ پہر کے وقت سرسید اور دوسرے معزز حضرات کی موجودگی میں علی گڑھ کالج کا سنگ بنیاد رکھا، جس میں زیادہ تر مضامین کی تعلیم کا ذریعہ اردو ہی تھا۔ یہاں انگریزی بھی بہ طور ایک مضمون پڑھائی جاتی تھی۔

1898 میں سرسید کی وفات کے بعد ان کے رفقائے کار کی کوششوں سے 1920 میں یہی کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے نام سے اندرون و بیرون ملک جانا جانے لگا۔ اس سے قبل 1916 میں بنارس ہندو یونیورسٹی کا قیام بھی عمل میں آچکا تھا۔ ان یونیورسٹیوں میں عربی، فارسی، دینیات اور اردو کے شعبے قائم ہیں جن میں اعلیٰ درجے تک تعلیم دی جاتی ہے۔

منشی ہرسکھ رائے نے لاہور ہی سے پہلا اردو ہفتہ وار اخبار 'کوہ نور' 14 جنوری 1850 اور پہلا اردو ماہنامہ 'خورشید پنجاب' جنوری 1856 میں جاری کرکے پنجاب کی اردو صحافت میں وہ نام پیدا کیا جسے تاریخ صحافت بھی فراموش نہیں کر سکتی۔ وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ پنجاب کی اردو صحافت نے وہ ترقی کی کہ اردو اخبارات و اردو رسائل کی مجموعی اشاعت میں یہ صوبہ ملک کے دوسرے صوبوں سے بازی لے گیا۔ پنجاب کے لاہور شہر کو یہ فخر بھی حاصل ہے کہ یہاں سے ہی اردو کا پہلا روزانہ اخبار 'اردو روزنامچہ' یکم جنوری 1875 کو جاری ہوا۔

انیسویں صدی کے اختتام تک پنجاب میں چھپنے والے اردو اخبارات کی تعداد پینتالیس کے قریب تھی جن میں روزنامہ دو، ہفتہ وار سینتیس، پندرہ روزہ ایک اور ماہنامہ پانچ تھے۔ ان سب کی مجموعی اشاعت پینتیس ہزار سے کچھ اوپر تھی۔

بیسویں صدی کے آغاز میں اخبارات کے ساتھ ساتھ خالص ادبی رسائل جو پنجاب (لاہور) سے جاری ہوئے۔ ان میں مخزن، ہمایوں، ادبی دنیا، شاہکار، نیرنگ خیال، عالمگیر، ادب لطیف، سویرا اور بہارستان قابل ذکر ہیں۔ اگر آزادی سے قبل کے ہندوستان پہ نظر ڈالی جائے تو پورے ملک میں ان کی تعداد ہزاروں سے تجاوز کرتی ہے، جن کے پڑھنے والے لاکھوں میں تھے اور آج یہ تعداد کروڑوں سے آگے نکلتی ہے۔

اخبارات ورسائل کے جاری ہونے سے نئے نئے علوم وفنون سے عوام روشناس ہونے لگے۔ ہر قسم کا علمی، ادبی، تاریخی، سائنسی اور سیاسی میٹریل دوسری یورپی و ایشیائی زبانوں سے ترجمہ ہوکر اردو میں منتقل ہونے لگا جس سے اردو زبان و ادب کا دامن وسیع سے وسیع تر ہونے لگا۔ اردو ادب میں سماجی، فلسفیانہ اخلاقی، ملکی، حب الوطنی، مذہبی اور ہنگامی شاعری اور نثری مضامین کا آغاز اخبارات ورسائل کے ذریعے سے ہی ہوا۔ جدید ادبی تحریکوں، مثلاً: ادب لطیف، ترقی پسند تحریک اور آزاد شاعری کی داغ بیل بھی انہی اخبارات ورسائل نے ڈالی۔ شعرا وادبا کو اندرون و بیرون ملک کے عوام سے روشناس کرانے میں صحافت نے ایک اہم رول ادا کیا ہے۔

اردو صحافت نے اردو شاعری ہی کو نہیں بلکہ اردو نثر کو بھی متاثر کیا۔ اردو نثر کا پہلا دور دکنی تصنیفات کا ہے۔ دوسرے دور کا آغاز فورٹ ولیم کالج کلکتہ سے ہوتا ہے، تیسرا دور غالب کے خطوط، سرسید اور ان کے رفقائے کار کے علاوہ ڈپٹی نذیر احمد، مولانا محمد حسین آزاد، حالی، پنڈت رتن ناتھ سرشار، عبدالحلیم شرر اور اس عہد کے ادبا کا ہے۔

مولانا عبدالحلیم شرر لکھنوی نے 'دلگداز' لکھنؤ کے جنوری 1915 کے شمارے میں اردو کے مقبول اخباروں اور نثر کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

''اب علی گڑھ سے 'تہذیب الاخلاق' آگرے سے 'تیرھویں صدی' اور لکھنؤ سے 'اودھ پنچ' نکل رہے تھے جن میں سے ہر ایک نثر اردو کی ایک ممتاز شان رکھتا تھا۔ 'تہذیب الاخلاق' میں متانت اور عالمانہ وقار کے ساتھ قومی درد کا سوز و گداز تھا، سلجھی ہوئی صاف زبان تھی اور نئے مغربی فلسفۂ ادب سے لیے ہوئے خیالات اور اثر ڈالنے والے مضامین و خطبات تھے۔ 'تیرھویں صدی' میں اعلیٰ منشیانہ قابلیت کے ساتھ قدیم ادبی مذاق کی نگہداشت نئی خیال آرائیوں اور جدتوں کے ساتھ کی جاتی تھی اور پرانا مشرقی لٹریچر کچھ ایسی جدت طرازیوں کے ساتھ نئے لباس میں ظاہر کیا جاتا تھا کہ نئے اور پرانے دونوں گروہوں سے بے اختیار 'واہ واہ' کے نعرے بلند ہوتے تھے۔ 'اودھ پنچ' میں زبان اپنی اصلی شان میں دکھائی جاتی تھی جس میں مذاق کا پہلو غالب رہتا تھا۔ اس میں مختلف لکھنے والے تھے اور ہر ایک کا مذاق خاص لطف اور خاص خوبیاں رکھتا تھا۔ منشی سجاد حسین ایڈیٹر کی شوخیاں، مرزا مچھو بیگ صاحب کی کوثر کی دھوئی ہوئی زبان، منشی احمد علی کسمنڈوی کا ظرافت کی اعلیٰ ادبی اور شاعرانہ دلچسپیاں ظاہر کرنے والا رنگ، پنڈت تربھون ناتھ ہجر کی ہندی نظمیں اور ان کی خوبیوں کو نہایت دل چسپی کے ساتھ ظاہر کرنے والے مضامین اردو نثر میں ایک عجیب زندگی و شگفتگی پیدا کر رہے تھے۔''

بیسویں صدی میں اردو صحافت نے نثر و نظم کو بہ یک وقت متاثر کیا۔ اس کا اندازہ درج ذیل اقتباس سے لگایا جاسکتا ہے:

''اردو میں نثر کے چوتھے دور کا آغاز 1901 میں رسالہ 'مخزن' کے اجرا سے ہوا۔ آنریبل خان بہادر سر شیخ عبدالقادر بالقابہ اس رسالے کے اڈیٹر تھے۔ ان کی ادبی قابلیت نے 'مخزن' کو چار چاند لگادیے اور ایسا معلوم ہوا کہ اردو انشا پردازی کی ہونہاری ان کا راستہ دیکھ رہی تھی۔ جدید تعلیم یافتہ نوجوان انگریزی لٹریچر کی پہنائیوں میں جولانیاں دکھلا رہے تھے اور اردو ادب کی تنگ میدانی کے سبب اس سے مایوس ہوچکے تھے۔ رسالہ 'مخزن' کو اپنی پسند کی چیز سمجھ کر ادھر جھک پڑے اور پشاور سے راس کماری تک 'مخزن' کے مضمون نگاروں کی دنیا آباد ہوگئی۔ علمی، ادبی، تاریخی اور ہر قسم کا سائنٹفک میٹر انگریزی، فرانسیسی اور دوسری ترقی یافتہ زبانوں سے حاصل کر کے اردو کے سانچے میں ڈھالا جانے لگا۔ 'مخزن' کے ذریعے اردو زبان کو قابل فخر انشا پرداز اور شعرا نصیب ہوئے۔ نثار میں سید سجاد یلدرم جیسا عبقری اور شعرا میں علامہ اقبال ایسی بین الاقوامی سحر طراز شخصیت اسی دور کی یادگار ہیں۔ ان دو گراں پایہ شخصیتوں نے 'مخزن' کو 'مخزن' اور دور 'مخزن' کو اردو کا کامیاب ترین دور بنا دیا۔ 'مخزن' کے بعد کانپور بریلی سے 'زمانہ'، الہ آباد سے 'ادیب' اور علی گڑھ سے 'اردوئے معلیٰ'، ماہانہ ادبی رسالے بڑے طمطراق سے شائع ہوئے اور پھر ان کی دیکھا دیکھی اردو رسالے فوج در فوج ہر شہر سے میدان ادب میں نکل آئے۔ جب سے اب تک رسالوں کا یہ حشر و نشر جاری ہے۔ راقم الحروف نے رسالہ 'ہمایوں' میں رہ کر اس کا اندازہ کیا کہ ہندوستان میں اوسطاً اردو کے چھ رسالے ہر ماہ جاری ہوتے ہیں۔ ان میں اکثر کی زندگیاں اگرچہ 'حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے' کی مصداق ہوتی ہیں مگر رسالوں کی یہ عام مرگِ طفلی نئے حوصلہ مندوں کو نئے رسالے شائع کرنے سے نہیں روک سکی۔''

ہندوستانی صحافت نے تحریکِ آزادی میں ابتدا ہی سے ایک اہم رول ادا کیا۔ وہ حکومت کی اشتعال انگیز پالیسیوں کے خلاف ہمیشہ نکتہ چینی کرتی رہی۔ حکومت نے اس سے انتقام لینے کے لیے سب سے پہلے 1799 میں اخبارات پر سنسر شپ عائد کی۔ 1857 میں حکومت نے 'قانون زبان بندی' جاری کر کے اخبارات پر قابو پالیا۔ 1889 میں 'قانون رازہائے سرکاری' وضع کیا گیا، بیسویں صدی کے آغاز میں اخبارات نے حکومت کی پالیسیوں کی نکتہ چینی کی رفتار تیز کردی۔ مجبور ہو کر حکومت نے 1901 میں 'پریس ایکٹ' اور 1908 میں 'اشتعال جرائم بذریعہ اخبارات' جیسے قانون نافذ کیے، جس کی رو سے حکومت کسی بھی چھاپہ خانے یا اخبار کو ضبط کرسکتی تھی۔

1911 میں دہلی دربار منعقد ہوا، اس میں شمولیت کے جارج پنجم خود انگلستان سے ہندوستان تشریف لائے۔ سبھی چھوٹی بڑی ریاستوں کے نوابوں اور جاگیرداروں کو یہاں جمع کیا۔ انھیں انگریزی حروف کے ہار پہنائے گئے 'سر' اور اس قسم کے دوسرے خطابات عطا کر کے حکومت کے غلام اور وفادار بنا لیے گئے۔ بلقانی ریاستوں نے ترکوں پر حملہ کیا۔ مسلمانان ہند کے دل مجروح ہوئے۔ بے چینی کی آگ بھڑکی، تحریکِ خلافت وجود میں آئی، لکھنؤ کا فرنگی محل اس کا مرکز بنا۔ ڈاکٹر انصاری کی قیادت میں ایک وفد ترکی روانہ ہوا۔ محمد علی جوہر نے 'کامریڈ'، مولانا ابوالکلام آزاد نے 'الہلال' اور ظفر علی خان نے 'زمیندار' کے ذریعے ترکوں کے ساتھ اپنی ہمدردیاں ظاہر کیں۔ اگست 1913 میں مسجد کانپور کے واقعے سے ملک میں غم و غصے کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ ملکی سیاست میں ایک نیا موڑ آیا۔ 1914 میں پورے یوروپ میں پہلی جنگ عظیم چھڑ گئی۔ برٹش حکومت نے ہندوستان کو بھی اس آگ میں جھونک دیا۔ 1911 میں جن ہندوستانی ریاستوں کے نوابین اور جاگیرداروں کو انگریزی حروف کے اعزاز کے ہار پہنا کر غلام بنایا گیا تھا انھی کے ذریعے زبردستی ہندوستانی نوجوانوں کو بھرتی کر کے محاذ جنگ پہ بھیجا جانے لگا، زبردستی تاوانِ جنگ وصول کیا جانے لگا۔ ہندوستانی عوام اور زیادہ حکومت سے بدظن ہوئے۔ حکومت نے انقلابی رجحان کو دبانے کے لیے انتہا پسند رہنماؤں کو جیلوں میں ڈال دیا اور ان کے اخبار بند کردیے۔

اسی زمانے میں بہت سے پنجابی سکھ اور دوسرے لوگ کام کی غرض سے امریکہ اور کینیڈا میں آباد تھے۔ انھوں نے 1913 کے موسم گرما میں سٹاکٹسن میں ایک آرگنائزیشن بنا ڈالی جس کا نام انھوں نے ہندوستانی ورکرز آف پیسی فک کوسٹ (Hindustani workers of Pacific coast) رکھا۔ اس کے صدر سوہن سنگھ بھاکنہ اور سکریٹری لالہ ہردیال منتخب ہوئے۔ انھوں نے ایک ہفتہ وار اخبار 'غدر' کے نام سے جاری کیا جس کے چیف اڈیٹر لالہ ہردیال تھے۔ کام کی غرض سے انھوں نے اپنا مرکز یگانتر آشرم (Yagantar Ashram, 436 Hills Street Sansrancisco) منتخب کیا وہاں سے انھوں نے اپنی سرگرمیاں تیز کردیں اور آگ بھڑکانے والا لٹریچر ہندوستان منتقل کیا جانے لگا۔ اس کے علاوہ دوسرے ممالک میں بھی یہ اخبار تقسیم کیا گیا۔ بعد میں اس آرگنائزیشن کا نام 'غدر پارٹی' رکھا گیا۔ اس پارٹی نے 1915 میں شمالی مغربی صوبہ جات اور پنجاب کو اپنا اڈا بنا لیا اور 'اعلانِ جنگ' کے عنوان سے ملک میں اشتہار تقسیم کیے گئے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی نے اس سال ماہ فروری میں (5 تا 7) سہ روزہ صحافتی عالمی اردو کانفرنس کا انعقاد کیا۔ ٹورنٹو، کناڈا سے جاوید دانش اس کانفرنس میں شرکت کے لیے تشریف لائے انھوں نے اپنا مقالہ بہ عنوان 'شمالی امریکہ کا پہلا اردو اخبار 'غدر'' پڑھا۔ اس میں انھوں نے مذکورہ پارٹی او ہفت روزہ اردو اخبار 'غدر' کے اجرا سے متعلق یوں انکشاف کیا ہے:

''21 اپریل 1913 ایسٹوریا امریکہ میں ایک انجمن 'ہندی ایسوسی ایشن آف دی پیسفک کوسٹ آف امیرکا' وجود میں آئی سوہن سنگھ بھکنہ اس کے صدر اور ہردیال سکریٹری بنے۔ پہلی نومبر کو انجمن نے اپنا اردو اخبار غدر شائع کیا، ہردیال اس کے ایڈیٹر تھے، جس کا یقین تھا کہ

یہ اخبار 1857 کی دبی ہوئی چنگاری کو شعلہ بنادے گا۔26

لالہ لاجپت رائے جب بدیس سے جلاوطنی کی زندگی گزار کر واپس وطن لوٹے تو انھوں نے آتے ہی لاہور سے 'بندے ماترم' نام کے روزنامہ اخبار کا اجرا 17 مئی 1920 میں کیا۔'بندے ماترم' کا نام انھوں نے 'غدر' اخبار کی پیشانی پہ لکھے ہوئے نعرہ سے اخذ کیا تھا۔'غدر' اخبار کی پیشانی پہ یہ یوں آویزاں تھا۔''انگریزی راج کا دشمن... بندے ماترم... ہندی جوانو! جلد لو ہتھیار'' 'بندے ماترم' کے سرورق کے دائیں کونے میں اس کا رجسٹرڈ اکل نمبر 1237 درج ہے۔درمیان میں جلی حروف میں ''سوراجیہ ہمارا پیدائشی حق ہے'' لکھا ہے۔ نصف دائرے کی شکل میں اقبال کا یہ شعر درج ہے:

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم، وطن ہے ہندوستاں ہمارا

بیچ میں زیادہ موٹے حروف میں 'بندے ماترم' درج ہے اور ساتھ ہی یہ عبارت شعر کی صورت میں درج ہے:

پنجاب کی سیاسی زندگی میں نئی روح پھونکنے والا
تمام اردو اخبارات کی شان کو اونچا کرنے والا

ایڈیٹر لالہ لاجپت رائے، جوائنٹ اڈیٹر رام پرشاد بی اے دائیں طرف اوپر سے نیچے بندے ماترم پریس لاہور میں باہتمام لالہ رام پرشاد بی اے پرنٹر و پبلشر چھپ کر شائع ہوا لکھا ہے۔اس کی روزانہ قیمت تین پیسے تھی۔اس اخبار کی مالک دی پنجاب اخبارات اینڈ پریس کمپنی لمیٹڈ لاہور تھی جس کا سرمایہ اس وقت ایک لاکھ روپیہ تھا۔

بیسویں صدی کے پہلے 47 سالوں پہ نظر ڈالیں تو ادب نے ہر صنف میں جو ترقی کی اس کی مثال نہ پہلے تھی اور نہ بعد میں دکھائی دیتی ہے۔سیاسی، سماجی، مذہبی اور اصلاحی تحریکیں جو اس دور میں رونما ہوئیں انھوں نے اردو زبان کو خاص طور سے اپنے مشن کے لیے استعمال کیا۔ آزادی سے قبل ہندوستان کی سرحد مشرق میں برما سے لے کر مغرب میں پشاور تک اور شمال میں کشمیر سے جنوب میں کنیا کماری تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس وقت اردو زبان ہی واحد ایسی زبان تھی جو اس برصغیر میں بولی، سمجھی، لکھی اور پڑھی جاتی تھی۔

داستانی دور کے عروج کے بعد ناول اور افسانے کا دور آتا ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد نے اصلاحی، پنڈت رتن ناتھ سرشار نے ظرافتی، مولوی عبدالحلیم شرر نے تاریخی، مرزا ہادی رسوا نے سماجی، راشدالخیری اور پریم چند نے حقیقی زندگی کو اس ڈھنگ سے پیش کیا کہ ناول اپنی انتہائی بلندیوں تک پہنچ گیا۔ یہی حال افسانہ کا بھی رہا۔سدرشن،

اردو زبان کی خوش ذوقی دیکھیے کہ کس طرح اس نے دنیا کی بڑی بڑی زبانوں کے ادبی خزانے کو تراجم کے ذریعے اپنے ہاں منتقل کیا ہے۔ سب سے پہلے ہم اردو فکشن کی بات کرتے ہیں، انگریزی، پرتگالی، لاطینی، چینی، روسی اور فرانسیسی کے علاوہ دوسری زبانوں کے سیکڑوں ناول اور افسانوی مجموعے ہمارے ادبی ورثے کا حصہ بن چکے ہیں۔

خواجہ حسن نظامی، حامد اللہ افسر میرٹھی، سید عابد علی، حکیم شجاع الدین نے بھی چھوٹے چھوٹے قصے لکھے۔

ترقی پسند تحریک کے بعد کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی اور اوپندر ناتھ اشک کے علاوہ سیکڑوں حضرات اس میدان میں نکل آئے جنھوں نے اسے بام عروج پر پہنچا دیا۔

پنجاب کے شہر لاہور اور بمبئی میں فلم انڈسٹری اور تھیٹر کی شروعات سے ناول، افسانے اور ڈرامے کو خوب ترقی نصیب ہوئی۔

مختصر طور پہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ملکی تقسیم تک اردو زبان نے ادب میں وہ نقوش چھوڑے جو آئندہ آنے والی نسلوں کی رہبری کرتے رہیں گے۔

اردو زبان کی خوش ذوقی دیکھیے کہ کس طرح اس نے دنیا کی بڑی بڑی زبانوں کے ادبی خزانے کو تراجم کے ذریعے اپنے ہاں منتقل کیا ہے۔ سب سے پہلے ہم اردو فکشن کی بات کرتے ہیں، انگریزی، پرتگالی، لاطینی، چینی، روسی اور فرانسیسی کے علاوہ دوسری زبانوں کے سیکڑوں ناول اور افسانوی مجموعے ہمارے ادبی ورثے کا حصہ بن چکے ہیں۔ یہ سلسلہ انیسویں صدی کے آغاز سے ہی جاری ہے مگر اس میں تیزی ترقی پسند تحریک کے بعد آئی، ہنوز یہ سلسلہ جاری ہے۔

اسی طرح اردو زبان نے دنیا کا دھیان اپنی طرف کھینچا تو پریم چند اور کرشن چندر کے علاوہ دوسرے مشہور ناول نگاروں اور افسانہ نویسوں کے مجموعوں کو دوسری زبانوں میں منتقل کیا گیا۔ پریم چند اور کرشن چندر کے ناولوں کے سب سے زیادہ ترجمے روسی اور چینی زبان میں ہوئے ہیں۔

ابن صفی نے اپنی 52 سالہ زندگی میں 250 سے زائد جاسوسی ناول تخلیق کیے۔ اسی طرح تیرتھ رام فیروز پوری نے اپنے تخلیقی اور تراجم جاسوسی ناول منظر عام پہ لائے۔ ان دونوں حضرات کے جاسوسی ناولوں نے ایک زمانے تک نوجوانوں کے ذہنوں کو اپنے قبضے میں رکھا۔

شاعری کے مجموعوں میں میر، مومن، غالب، اقبال، سردار جعفری اور اخترالایمان کا کلام دوسری زبانوں میں منتقل ہو رہا ہے۔ اخترالایمان کی نظموں کے ترجمے کناڈا میں مقیم جناب بیدار بخت نے کیے ہیں۔

آزادی سے قبل سبھی دفتری و عدالتی کام اردو میں ہوا کرتے تھے تو اس وقت قانون کی سبھی کتابوں کے اردو ترجمے دستیاب ہوجایا کرتے تھے۔ 'تعزیرات ہند' کا ایک پرانا نسخہ راقم کے پاس موجود ہے۔

یوں تو لغت کی اچھی تعداد اردو زبان میں موجود ہے لیکن دوسری زبانوں سے اردو میں بھی چند لغات منتقل ہوئی ہیں، مثلاً: ہندی اردو لغت، گجراتی اردو لغت، فارسی اردو لغت، انگریزی اردو لغت۔ حیدرآباد کے یعقوب میراں مجتہدی (مرحوم ہیں اب) نے 25 سال کی مسلسل محنت کے بعد تین جلدوں میں انگریزی اردو لغت 'لغتِ مجتہدی' مرتب کی تھی جس کے اردو حصے کی تصحیح اردو ادب کی مایہ ناز شخصیت محقق و مدون رشید حسن خاں نے کی تھی۔

آج سائنس اور ٹکنالوجی کی کتابیں بھی اردو میں دستیاب ہیں۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، انجمن ترقی اردو (ہند و پاکستان) 'ریختہ فاؤنڈیشن) اور گوگل نے ویب سائٹ پر بہت سی جانکاری آپ اردو زبان سے متعلق حاصل کر سکتے ہیں۔

آپ یہ جان کر خوش ہوں گے کہ دنیا کے 142 ممالک کے تین ہزار پانچ سو چوبیس شہروں میں اردو پڑھنے والے لوگ موجود ہیں اور دنیا کی قریب سبھی بڑی زبانوں کے الفاظ اس میں شامل ہیں۔

ہندوستان کا پہلا شخص راکیش شرما جب مصنوعی سیارے میں سوار خلا میں پہنچا تو اس وقت کی وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی نے اس سے پوچھا تھا مسٹر راکیش وہاں سے ہمارا ہندوستان کیسا دکھائی دیتا ہے۔ اس نے جواب دیا تھا ''سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا'' راکیش شرما کی زبانی اردو زبان کا یہ مصرعہ کائنات کی پنہائیوں میں تحلیل ہوگیا اور نہ ختم ہونے والی مدت تک گردش کرتا رہے گا۔

ہم دعوے سے کہہ سکتے ہیں کہ اردو زبان بین الاقوامی شہرت یافتہ ہے ہم اسے کسی فرضی حد میں مقید نہیں کرسکتے۔

■

Dr. T. R. Raina., F-237, Lover Hari Singh Nagar, Rehari Colony, Jammu-5 (J&K)

جموں وکشمیر میں اردو صحافت

مشتاق قادری

ملک کی دوسری بڑی زبانوں کی طرح اردو میں بھی صحافت کو ایک فن کی حیثیت حاصل ہے۔ اردو صحافت نے ملک وقوم کی ترقی میں کلیدی رول ادا کیا۔ انگریزی اور ہندی زبانوں کے علاوہ اردو وہ واحد زبان ہے جس کے اخبارات ورسائل ہندوستان کے کونے کونے سے شائع ہوتے ہیں۔ آج انسان کی معاشرتی اور سماجی زندگی میں صحافت کو اہم مقام حاصل ہے۔ اسی وجہ سے دنیا کی متعدد جامعات میں اس فن کی تدریس کا عمل جاری وساری ہے۔

صحافت بنیادی طور پر کثیر المقاصد عمل ہے۔ اس میں ادیب، مفکر، مفسر، مبصر، مدبر اپنے خیالات سے عوام الناس کو آگاہ کرتے ہیں، بہ الفاظ دیگر یہ فن رائے عامہ کی تشکیل اور عوامی جذبات واحساسات سے متعلق مختلف موضوعات کی ترسیل وتبلیغ سے عبارت ہے۔

ملک کی دوسری ریاستوں کی طرح جموں وکشمیر میں بھی اردو صحافت نے کئی نشیب وفراز دیکھے ہیں۔ نیز اسے کئی آزمائشی مراحل سے نبرد آزما ہونا پڑا ہے۔ اس ضمن میں جب سیاست کے حوالے سے بات کی جاتی ہے تو یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہوکر سامنے آتی ہے کہ ایک طویل عرصے تک فارسی زبان یہاں کی معاشرتی اور ثقافتی زندگی پر براجمان رہی ہے اور تقریباً چھ سو سال تک اس نے اپنی شہنشاہیت کا دبدبہ قائم رکھا ہے لیکن بیسویں صدی کا سورج جب طلوع ہوا تو عوام اور حکومت کے تقاضے بدل گئے۔ فارسی زمانے کے ان جدید تقاضوں کو پورا نہیں کرسکتی تھی۔ چنانچہ بیسویں صدی میں فارسی کی جگہ دوسری زبانوں نے لے لی۔

مہاراجہ رنبیر سنگھ کا عہد ریاست میں علم وحکمت کا سنہرا عہد تصور کیا جاتا ہے۔ اس عہد میں عربی، فارسی اور سنسکرت کے تعلیمی ادارے قائم کیے گئے۔ سنسکرت کی ترویج واشاعت کے لیے رگوناتھ مندر جموں میں اور اس سے ملحق کئی جگہوں پر پاٹھ شالاؤں کا وجود عمل میں آیا۔ مہاراجہ نے کئی تعلیمی ادارے اور عربی وفارسی کے مدارس قائم کیے، اسی لیے ان کو جموں وکشمیر کا سرسید بھی کہا جاتا ہے۔ مہاراجہ نے ریاست کو علمی وادبی سطح پر نئے نئے افکار وخیالات سے روشناس کرایا۔ جموں میں ایک چھاپہ خانہ بھی قائم کیا جس سے یہاں کے ادبی ماحول میں کافی حد تک گرماہٹ پیدا ہوئی۔ انھوں نے نہ صرف ریاستی ادیبوں، قلمکاروں اور دانشوروں کو ریاست کی تعلیمی فضا کو بہتر کرنے کے لیے دعوت دی بلکہ ہندوستان کے مختلف حصوں سے ادیبوں اور فنکاروں کی خدمات بھی حاصل کیں اور ریاست کے علمی وادبی خزانے کو مالا مال کیا۔ مہاراجہ نے ایک انجمن 'ودیا بلاس' بھی قائم کی جس کے ذریعے عربی، فارسی اور سنسکرت کے ادبی شہ پاروں کو اردو اور ہندی میں منتقل کروایا گیا۔ صحافت کے باب میں ودیا بلاس نے اخبار جاری کرکے اپنی روشن خیالی کا ثبوت فراہم کیا۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ اخبار مہاراجہ کے دربار کے زیر اثر پروان چڑھا۔ شروع میں یہ اخبار ہفت روزہ تھا اور آٹھ صفحات پر مشتمل تھا۔

1931 میں شیخ محمد عبداللہ کی قیادت میں اس وقت کی سیاسی جماعت مسلم کانفرنس آج کی نیشنل کانفرنس کے بینر تلے جموں اور سری نگر سے اخبارات جاری ہوئے۔ اس ضمن میں ہمیں یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ اس وقت یہاں کے ادیبوں اور دانشوروں کے ذریعے ہندوستان کے مختلف شہروں سے کون کون سے اخبارات شائع ہورہے تھے۔ درج ذیل فہرست سے کچھ اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

1.	اسلۂ کشمیر	لاہور	1872
2.	اخبار عام	ایضاً	1881
3.	خیر خواہ کشمیر	ایضاً	1882
4.	ہمدرد ہند	ایضاً	1894
5.	کشمیر درپن	الہ آباد	1898
6.	رسالہ کشمیر پرکاش	لاہور	1898
7.	کشمیری پرکاش	ایضاً	1898
8.	پنجۂ فولاد	ایضاً	1901
9.	کشمیر گزٹ	ایضاً	1901
10.	کشمیر میگزین	لاہور	1901
11.	کشمیر مخزن	ایضاً	1905
12.	کشمیر میگزین	ایضاً	1906
13.	سفیر	ایضاً	1914
14.	صوبۂ کشمیر	ایضاً	1916
15.	بہار کشمیر	ایضاً	1961
16.	کشمیر	مرامرتسر	1924

مندرجہ بالا فہرست سے یہ صاف ظاہر ہے کہ ریاست کے ادیبوں اور دانشوروں نے اخبارات تو جاری کیے لیکن ریاست سے باہر جاکر۔ کیونکہ ریاست میں انھیں اخبارات جاری کرنے کا اجازت نامہ نہیں ملتا تھا۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ ریاست میں مطبوعہ صحافت کا آغاز انیسویں صدی کے وسط کے بعد سے ہی شروع ہوجاتا ہے۔ لیکن اس سے قبل بھی ریاست میں مطبوعہ صحافت کی ایک شکل تو موجود تھی۔ اس کے متعلق گربچن چندن نے اپنی معرکۃ الآراء تصنیف 'اردو صحافت کا سفر' میں کچھ اس طرح اظہار خیال کیا ہے:

''ریاست کے بادشاہوں کے نظام میں وقائع نویسی کے لیے باقاعدہ عملہ ہوا کرتا تھا جو بڑی سرگرمی سے وقائع فراہم کرتا تھا۔ یہ وقائع نگار سلطنت کے مختلف

علاقوں کے حالات رقم کرتے تھے اور اپنی قلمی رپورٹیں جنھیں اخبار کہا جاتا تھا، بادشاہ کو مہیا کرتے تھے۔ ان کے مرتب کیے ہوئے اخبار دربار کے اندرونی حلقوں میں تو گشت کرتے تھے لیکن عوام کی دسترس سے باہر ہوتے تھے۔ ان کا مقصد صرف بادشاہوں کو اپنی سلطنت کے حالات سے باخبر رکھنا ہوتا تھا۔ جموں و کشمیر کی ریاست انیسویں صدی میں وجود میں آئی۔ اس کے جموں کے حصے کا قیام 1820 میں اور اس میں کشمیر ولداخ وگلگت کا شمول 1846 میں ہوا۔ پہلا چھاپہ خانہ 1858 میں ڈوگرہ حکومت کے زیر اہتمام قائم ہوا۔ یہ پریس جس میں فارسی اور دیوناگری حروف میں طباعت کا انتظام تھا، جموں میں تھا۔ یہاں فارسی اور سنسکرت کے علاوہ اردو میں بھی کچھ سرکاری فارم اور دستاویزات چھپتے تھے۔"

جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے کہ مہاراجہ رنبیر سنگھ کے عہد میں علوم وفنون کی ترویج واشاعت کی جانب اچھی خاصی توجہ دی گئی۔ مہاراجہ نے اپنی انجمن ویدیابلاس کے ذریعے عربی، فارسی، سنسکرت اور انگریزی کی بیشتر علمی اور ادبی کتابوں کا اردو اور ہندی میں ترجمہ کروایا اور ان کے متعلق تنقیدی اور تاریخی نکات کو زیر بحث لایا گیا۔ اسی کڑی کے تحت جموں میں ویدیابلاس پریس اور سری نگر سے سالک رام سالک کے ناموں سے پریس قائم کیے گئے۔ ان دونوں میں اردو کی طباعت کا انتظام وانصرام موجود تھا۔

انیسویں صدی کے اخیر تک ہندوستان کے مختلف شہروں میں اکثر وبیشتر سرکاری اور غیر سرکاری چھاپہ خانے قائم ہو چکے تھے لیکن ریاست جموں وکشمیر کو اس بابت اجازت نہ تھی۔ پھر بھی کچھ کشمیری ادیبوں اور دانشوروں نے دوسرے مراکز میں رہ کر اس عمل کو جاری وساری رکھا۔ عبدالقادر سروری نے لکھا ہے کہ:

"مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے ابتدائی دور میں لاہور سے بابو غلام محمد نے 'آئینۂ ہند' کے نام سے ایک ہفتہ وار اخبار 1885 میں جاری کیا تھا اور اس میں مہاراجہ پرتاپ اور ان کے نظم ونسق پر تنقید کی جاتی تھی۔ ایک اور اخبار ہمدرد 1884 میں جاری ہوا تھا اور اس کا مقصد مہاراجہ کے خلاف تنقیدوں کا جواب دینا تھا لیکن اس میں زیادہ تر اشخاص کو چن کر ان کے خلاف لکھا جاتا تھا۔ یہ طریقہ ریاست کے اکثر صحیفہ نگاروں کا رہا۔ چنانچہ پنڈت ہرگوپال کول خستہ اور پنڈت سالک رام سالک کا بھی یہی طریقہ رہا ہے۔ کشمیر پرکاش ماہنامہ تھا جسے 1898 سے پنڈت نند کشور نکالا کرتے تھے۔ کشمیر درپن تیغ بہادر سکرو کی ادارت میں الہ آباد سے 1898 سے نکلنے لگا تھا اور 1904 تک جاری رہا۔ یہ ہندی اور اردو دونوں زبانوں میں شائع ہوتا تھا۔ سرتیغ بہادر کے علم وفن اور سیاسی صداقت شعاری نے اس کے لب ولہجے کو بہت بلند کردیا تھا۔ اسی سنہ میں پنڈت ہرگوپال خستہ نے اخبار شمالی کے نام سے راولپنڈی سے ایک ہفتہ وار جاری کیا جو دوسال بعد بند ہوگیا۔ پنڈت گوپی ناتھ نے جو پہلے ویدیابلاس کے ایڈیٹر تھے، اس کے بند ہونے کے بعد انھوں نے اخبار عام کے نام سے ایک اخبار جاری کیا جسے ان کے فرزند پنڈت بال کرشن ترتیب دیتے تھے۔ یہ اخبار 1938 تک جاری رہا۔"

انیسویں صدی کی آخری دہائی اور بیسویں صدی کے اوائل میں کشمیری صحافت میں ایک نئی آواز محمد دین فوق کی شکل میں نمودار ہوئی۔ فوق نے اردو زبان وادب کی ترویج واشاعت میں اور کشمیری عوام کی بیداری کے حوالے سے وہی کارہائے نمایاں انجام دیے جو سرسید احمد خان کی تحریک اور ان کے رفقا نے انجام دیے تھے۔ فوق کثیر الجہات شخصیت کے مالک تھے۔ انھوں نے ریاست جموں وکشمیر کے اردو ادبی اور صحافتی سرمائے میں حتی المقدور اضافے کیے۔ انھوں نے اپنی علمی وادبی زندگی کا آغاز اردو صحافت سے کیا تھا۔ وہ محض بیس سال کی عمر میں 'پیسہ' نامی اخبار میں ملازم ہوگئے تھے۔ اس کے علاوہ بھی وہ کئی دوسرے اخبارات کے ساتھ منسلک رہے۔ مثلاً کوہ نور، اخبار عام، صدائے ہند، اردو اخبار، آفتاب پنجاب وغیرہ۔ ان اخبارات میں انھوں نے ادارت کے فرائض انجام دیے۔ اسی دوران وہ لاہور سے کشمیر آئے اور ڈوگرا حکومت سے التماس کی کہ انھیں ریاست میں ایک پریس قائم کرنے اور اخبار جاری کرنے کی اجازت دی جائے۔ محمد دین فوق نے 1904 کی اپنی عرضداشت میں حکومت کو یقین دلایا تھا کہ ان کے مجوزہ اخبار کا سیاسی اور ملکی معاملات سے کوئی سروکار نہیں ہوگا اور نہ ہی ان کی حکومت کے بارے میں کوئی منفی رویہ اختیار کیا جائے گا۔ ان تمام شرائط کے باوجود حکومت نے ان کی عرضداشت کو نامنظور کردیا اور 10 جون 1907 کو جواب میں لکھا کہ موجودہ وقت میں ان کو نہ تو پریس قائم کرنے کی اجازت دی جاسکتی ہے اور نہ ہی اخبار جاری کرنے کی۔ اسی دوران ڈوگرہ شہنشاہ نے ریاست کی عدلیہ کو یہ ہدایت نامہ جاری کیا کہ وہ پریس قائم کرنے اور اخبار جاری کرنے کے متعلق ایک ضابطہ تیار کرے جس میں ان تمام شرائط اور پابندیوں کا باضابطہ اندراج ہو جن پر اخبار جاری کرنے والے عمل پیرا ہوں۔ فوق نے ریاست جموں وکشمیر سے اردو اخبار جاری کرنے کے لیے کوئی بھی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ اسی جدوجہد کے دوران انھوں نے 1901 میں 'پنجۂ فولاد' کے نام سے ایک اخبار جاری کیا جو شروع میں پندرہ روزہ تھا اور بعد میں اس کو ہفت روزہ کردیا گیا۔

'پنجۂ فولاد' کے علاوہ انھوں نے اور بھی کئی اخبار ورسائل جاری کیے جن کا مقصد کشمیری عوام کو بیدار کرنا، حصول تعلیم کی طرف راغب کرنا اور اپنے حقوق کے حصول کے لیے تگ ودو کرنا تھا۔ انھوں نے سری نگر سے 'کشمیر جدید' کے نام سے ایک ہفت روزہ جاری کیا جو دوسال تک جاری رہا۔ اس کے ساتھ ساتھ فوق نے اردو صحافیوں کے تعلق سے ایک تذکرہ بھی قلم بند کیا جس میں اس دور کے نامور صحافیوں کے حالات زندگی درج ہیں۔ ڈوگرہ حکومت نے ریاست میں تحریر وتقریر پر جو پابندیاں عائد کر رکھی تھیں وہ بالآخر 'رنبیر' کی اشاعت کے ساتھ ختم ہوگئیں۔ 'رنبیر' کے مدیر جموں کے ایک بے باک صحافی اور انسان دوست ملک راج صراف تھے۔ ریاست میں اردو صحافت کے منظرنامے کا جائزہ لینے کے بعد یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ یہاں اردو صحافت آزادی سے قبل ہی کئی مراحل سے گزر چکی تھی۔ اس ضمن میں خاص طور پر جن اخبارات کا نام لیا جاسکتا ہے ان میں رنبیر، ماتند، ہمدرد، خدمت، امر، وتستا، صداقت اور حقیقت وغیرہ کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ شیخ محمد عبداللہ اور ان کے مربی خاص مولانا محمد سعید اور پیر حسام الدین اور قیصر قلندر نے مل کر 1933 میں اخبار 'صداقت' جاری کیا مگر بعض وجوہات کی بنا پر اخبار کو بھی بند کردیا گیا۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر جموں وکشمیر کی اردو صحافت پر تبادلۂ خیال کیا جائے تو یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ مشکلات اور دشواریوں کے باوجود اخبارات کا سلسلہ جاری رہا۔ ان مشکلات اور دشواریوں کو یوسف جمیل نے اس طرح بیان کیا ہے:

"مشکلات کے باوجود 1932 تا 1947 کشمیر میں صحافت کا معیار مجموعی طور پر اچھا رہا۔ اس دور میں جتنے بھی صحافی منظر عام پر آئے۔ ان میں سے اکثر کی سیاسی وابستگیاں تھیں۔ اس طائفے میں پنڈت پریم ناتھ بزاز، مولانا محمد سعید مسعودی اور پنڈت کیشیپ بندھو شامل تھے۔ 1947 سے کچھ پہلے اور اس کے بعد ان میں سے بیشتر نے صحافت کو خیرباد کہہ دیا اور عملی سیاست میں دلچسپی لینے لگے، جس سے ریاست کی صحافتی دنیا میں ایک خلا پیدا ہوگیا۔"

ملک کی تقسیم ریاستی صحافت پر اثر انداز ہوئی جس

کے نتیجے میں کئی نامور صحافی سرحد کے اُس پار چلے گئے۔ اسی وجہ سے ریاست میں صحافت کی ترقی متاثر ہوئی۔ سانحۂ تقسیم کے بعد شخصی راج کا خاتمہ ہوا اور اس کی جگہ عوامی اور جمہوری حکومت قائم ہوئی۔ ماحول سازگار ہوا اور یہ سازگار ماحول صحافت کے لیے بھی سازگار ثابت ہوا۔ اس لیے ریاست سے کئی اخبارات ورسائل جاری ہوئے اور کئی باصلاحیت لوگوں نے صحافت کو اپنا مستقل پیشہ بنالیا۔ ان اخبارات ورسائل میں ماہنامہ گلریز، آزاد، تعمیر، سویرا، سنگم اور دیہات سدھار قابل ذکر ہیں۔ 1957 میں کلچرل اکادمی کا قیام عمل میں آیا جہاں سے مختلف زبانوں مثلاً اردو، کشمیری، ڈوگری، گوجری، پہاڑی زبانوں میں رسائل جاری ہوئے۔ اس کے علاوہ 1966 میں اکادمی سے اردو رسالہ 'شیرازہ' کی اشاعت عمل میں لائی جو ابھی تک بڑے تزک واحتشام کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔

دو ماہی اردو شیرازہ اپنی نوعیت کا پہلا رسالہ ہے جو نہ صرف پوری ریاست کی علمی اور ادبی کاوشوں کی ترجمانی میں مصروف ہے بلکہ اس کا شمار ملک کے نمائندہ رسائل وجرائد میں کیا جاتا ہے۔ شروع میں ریاست کے نامور ادیب اور دانشور محمد یوسف ٹینگ کی نگرانی میں اور بعدۂ محمد امین اندرابی کی ادارت میں شائع ہوتا رہا اور اب اس کی ادارت محمد اشرف ٹاک اور سلیم سالک کر رہے ہیں۔

ریاست میں سیاسی انقلاب کے بعد صحافت کی دنیا میں ایک اور آواز 'آئینہ' کی شکل میں سامنے آئی۔ 'آئینہ' کے روح رواں شمیم احمد شمیم تھے جو ریاست میں اپنی نوعیت کے پہلے صحافی تھے۔ مالی دشواریوں کے باوجود انھوں نے کیسے نہ کیسے کر کے اس ہفتہ روزہ اخبار کو جاری کیا۔ تقسیم ملک کے بعد ریاست جموں وکشمیر کے حوالے سے جو تصویر دنیا کے سامنے بنی، اسے شمیم احمد شمیم نے ہمیشہ محسوس کیا۔ اس حوالے سے وہ اکثر وبیشتر بے چین رہتے تھے۔ اپنے بزرگوں کی عزت کا انھیں ہر وقت پاس ولحاظ رہتا۔ اس کے باوجود ان بزرگوں میں جہاں انھیں کوئی کمی دکھائی دی، اس پر تنقید بھی کی اور نکتہ چینی بھی۔

'سرینگر ٹائمز' بھی ریاست میں صحافت کے حوالے سے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ اس کے وہ کارٹون جن کو صوفی غلام محمد ترتیب دیتے تھے، آج بھی لوگوں کے ذہنوں میں محفوظ ہیں۔ اس کے بعد تو اور کئی اخبار نمو پذیر ہوئے۔ مثلاً انڈین ٹائمز، سرینگر ایکسپریس، مورننگ ٹائمس، کرم ویر، کہستان، صداقت، انقلاب اور لالہ رخ نے اپنے اپنے انداز میں سیاسی اور سماجی حوالے سے ریاستی صحافت میں اپنا کردار ادا کیا۔ جہاں تک رسائل وجرائد کا سوال ہے تو اس سلسلے میں کئی رسائل تو کشمیر یونیورسٹی اور جموں یونیورسٹی سے باہر بھی شائع ہوئے۔ ان میں گلریز، وکیل، جھرنا، ادبیات، العطش اور ہماو غیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ کشمیر یونیورسٹی سے خبرنامہ کے علاوہ بھی ادبیات اور نیا شعور کے نام سے رسالے نکلتے رہے۔ اس کے بعد کشمیر یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے 'بازیافت' نام سے ادبی رسالہ شائع ہونے لگا۔ اسی طرح جموں یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے پروفیسر ظہور الدین کی مسلسل کوششوں سے 'تسلسل' کے نام سے ایک ادبی رسالہ منظر عام پر آیا جو آج بھی پابندی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے اور جس کی ادارت کے فرائض پروفیسر شہاب عنایت ملک انجام دے رہے ہیں۔ گذشتہ دہائیوں میں اردو صحافت نے اپنے دائرے کو وسیع کیا اور کئی ادبی رسائل اور ماہنامے منظر عام پر آئے۔ انھی وجوہات کی بنا پر لوگوں کو اخبار بینی سے لگاؤ پیدا ہوا اور کئی نوجوانوں نے اس طرف توجہ کی اور کئی نے تو اس کو اپنے روزگار کے ساتھ بھی جوڑ دیا۔

1975 میں نیشنل کانفرنس کے سربراہ شیخ محمد عبداللہ ایک بار پھر ریاست کے سیاسی افق پر نمودار ہوئے۔ وہ سب سے پہلے جن مسائل کو زیر بحث لائے، ان میں صحافت کے مسائل کو بھی ترجیحات میں شامل کیا۔ اس دوران کئی اخبارات جاری ہوئے۔ مثلاً: ایکاؤ، قومی آواز، ترجمان الحق، ٹائمس آف کارٹونس، دہر، انھی، کام، جموں ایکسپریس، دھرم لوک، نیوز اینڈ ویوز، صبح جموں، لازوال، جن شکتی، وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اس طرح گذشتہ نصف صدی سے زیادہ عرصے پر محیط صحافت کا یہ منظرنامہ اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ جگمگا رہا ہے۔ اس عرصے میں چونکہ ریاست کی سرکاری زبان اردو تھی، اس لیے اکثر تعلیمی اداروں نے جن میں اعلیٰ اور ثانوی ادارے شامل ہیں، نے اپنی اپنی سطح پر اپنے اداروں کی جانب سے سالنامے اور میگزینیں شائع کیں۔ ایسے اداروں سے نوخیز قلمکاروں کی صلاحیتیں ابھر کر سامنے آئیں جو ریاست کے حوالے سے خوش آئند ہیں۔ اس بات سے کسی کو انکار کی گنجائش نہ ہوگی کہ موجودہ عہد میں ریاست سے شائع ہونے والے جو اخبارات ورسائل پوری آب وتاب کے ساتھ اس فن میں سرگرم عمل ہیں، ان میں کشمیر عظمیٰ اور اڑان بیک وقت جموں وکشمیر سے پابندی کے ساتھ شائع ہو رہے ہیں۔ یہ عوام میں بے حد مقبول ہیں۔ یہ دونوں اخبار ہفتے میں ایک بار اپنے ادبی صفحے کے ساتھ شائع ہوتے ہیں جن میں نہ صرف ریاست بلکہ بیرون ریاست سے بھی ادیبوں اور دانشوروں کے مضامین شائع ہوتے ہیں۔ آزادی کے بعد اپنی نوعیت اور معیار ووقار کے اعتبار سے ان اخبارات کو منفرد مقام حاصل ہے۔ 'اڑان' کے قارئین کی تعداد میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے اور ریاست کے دور دراز کے علاقوں میں بھی لوگ بڑی بے صبری کے ساتھ اس اخبار کا انتظار کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس اخبار میں ریاست کے اور خصوصاً جموں صوبہ کے حوالے سے خبروں کو بڑے انتظام وانصرام کے ساتھ شامل کیا جاتا ہے۔ 'کشمیر عظمیٰ' بھی اپنے معیار اور مرتبے کے لحاظ سے قابل داد ہے۔ یہ جموں اور کشمیر دونوں جگہوں سے مستقل شائع ہو رہا ہے اور بڑی ذمے داری کے ساتھ خبروں کی ترسیل کو بہتر سے بہتر کر رہا ہے۔ قابل ذکر بات یہ بھی ہے کہ روزنامہ 'تسکین' جس نے بڑے پُرآشوب دور میں جموں اور اس کے ملحقہ علاقوں کو اپنی خدمات پیش کیں، صہیب کاظمی کی ادارت میں صحافت کی دنیا میں نام کر رہا ہے۔ یہی کام وادی سے 'اطلاعات' نامی اخبار نے بھی انجام دیا۔

مختصر یہ کہ ریاست جموں وکشمیر جس کا ماضی صحافت کے اعتبار سے تابندہ تھا، حال روشن اور مستقبل اس سے بھی روشن ہے۔ اس لیے کہ یہاں باصلاحیت افراد کی کمی نہیں ہے۔ بس ایک موقع چاہیے جس کے ذریعے یہ باصلاحیت حضرات اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اس فن کی آبیاری کر سکیں۔

■

Dr. Mushtaq Qadri
Dept. of Urdu, Delhi University
Delhi - 110007

کامل القادری کی ادبی خدمات

سید شاہد اقبال

تقسیم ہند کے نتیجے میں لاکھوں انسانوں کو اپنا وطن چھوڑنا پڑا۔ بنگال اور پنجاب میں بڑے پیمانے پر تبادلہ آبادی ہوا۔ بہار اور یوپی سے لاکھوں کی تعداد میں مسلمان پاکستان ہجرت کر گئے۔ اس طرح پاکستان سے لاکھوں کی تعداد میں ہندو اور سکھ نقل مکانی کر کے ہندوستان چلے آئے۔ پاکستان جانے والے مہاجرین کی زیادہ تعداد مشرقی بنگال اور سندھ میں پناہ گزیں ہوئی۔ بہت کم لوگ بلوچستان میں آباد ہوئے۔ ان ہی چند لوگوں میں کامل القادری بھی شامل ہیں۔ انھوں نے پہلے کراچی (سندھ) پھر کوئٹہ (بلوچستان) میں سکونت اختیار کی۔

برٹش عہد حکومت میں بلوچوں نے انگریزی فوج میں خدمات انجام دی تھی۔ بلوچ رجمنٹ میں ہندوستانی بھی کثیر تعداد میں شامل تھے جنھوں نے دوسری جنگ عظیم کی اتحادی افواج کے شانہ بہ شانہ نمایاں خدمات انجام دی تھی۔ کرشن چندر نے اپنی ایک کہانی 'پشاور ایکسپریس' میں بلوچ سپاہیوں کی وفاشعاری کا ذکر کیا ہے۔

بہار کے میجر ڈاکٹر صفدر علی خاں (پ 1911، م: 2000) نے دوسری جنگ عظیم (1939-1945) میں بلوچ رجمنٹ کے ساتھ مشرقی افریقہ میں خدمات انجام دی تھی، بعدہٗ ڈپٹی ڈائرکٹر (محکمہ صحت/ حکومت بہار، پٹنہ) ہو کر سبکدوش ہوئے۔ ان کا انتقال 13 اگست 2000 کو مغل پورہ (پٹنہ سٹی) میں ہوا۔

(بحوالہ ہفت روزہ ہماری زبان نئی دہلی، یکم مارچ 2000)

تقسیم وطن کے بعد بلوچستان سے اردو کے دو عظیم ادیب ہندوستان میں اقامت گزیں ہوئے ہیں۔ ان میں آنجہانی راج نرائن راز (پیدائش 1930 بمقام لورالائی (بلوچستان) وفات 1998 دہلی) اور پروفیسر گوپی چند نارنگ (پیدائش 1931 بمقام ڈکی نزد کوئٹہ (بلوچستان/ باحیات) کے نام اہم ہیں۔

کامل القادری نے اپنے قیام بلوچستان کو غنیمت سمجھا۔ انھوں نے بلوچی اور براہوی زبان و ادب پر عبور حاصل کیا۔ انھوں نے بلوچی اور براہوی میں شاعری کی ہے اور ادبی خدمات بھی انجام دی ہیں۔ ان کی بلوچی زبان و ادب اور ثقافت پر کئی کتابیں ہیں۔

آج بھی کامل القادری کی بلوچی اور براہوی زبان میں کہی ہوئی نظمیں بلوچستان کے اسکولوں میں پڑھائی جاتی ہیں۔

کامل القادری کی خدمات:

سید شاہ کامل القادری کا تعلق ہندوستان میں قدم رنجہ فرمانے والے سلسلہ قادریہ کے سب سے پہلے درویش کامل حضرت سیدنا محمدؒ القادری بغدادی ☆ نبیرہ غوث الاعظم حضرت شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانیؒ کے خانوادے سے تھا، کامل القادری کے والد کا نام سید شاہ فتح الجبار قادری تھا۔ کامل القادری چار بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے۔ ان کے بھائیوں کے نام اس طرح ہیں۔ (1) ذاکر القادری (2) شاغل القادری (3) عاقل القادری اور (4) کامل القادری۔

کامل القادری کی پیدائش 5 جولائی 1932 کو بمنڈیہا (ضلع اورنگ آباد) میں ہوئی۔ ان کا آبائی وطن بمنڈیہا (تھانہ اوبرا/ ڈاکخانہ کڑا) ضلع اورنگ آباد (بہار) تھا۔ ان کی تعلیم اورنگ آباد (بہار) اور جھریا (جھارکھنڈ) میں ہوئی۔ کامل القادری نے راجہ شیو پرشاد ہائی اسکول جھریا (دھنباد) R.S.P High School سے میٹرک پاس کیا۔ اس کے بعد سدھارتھ کالج بمبئی (Sidharth College, Bombay) سے بی اے (آنرز) کرنے کے بعد کراچی چلے گئے جہاں انھوں نے کراچی یونیورسٹی سے ایم اے (اردو) کیا۔ اس کے بعد کوئٹہ (بلوچستان) میں سکونت اختیار کی۔ ان کا ذریعہ معاش صحافت تھا۔

(بحوالہ: سخنوران جھارکھنڈ ص 346-47)

کامل القادری کو شاعری ورثے میں ملی تھی۔ ان کو انگریزی، اردو، عربی، فارسی، براہوی اور بلوچی زبان پر عبور حاصل تھا۔ وہ ہندو پاک کے شعرا میں اپنا ایک منفرد مقام رکھتے تھے، اسلاف کی وراثت جو ماضی سے چلی آرہی ہے، وہ ایک قادرالکلام شاعر کے ذہن کے نہاں خانے میں ہمیشہ محفوظ رہتی ہے اور نزول اشعار کے وقت یہ وراثت معاون ثابت ہوتی ہے۔ یہ اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

میری آنکھوں میں سمٹ آتے ہیں ارض و افلاک
میں نے پایا ہے دھڑکتے ہوئے دل کا انداز
کوئی جلوہ نہیں پوشیدہ نظر سے کامل
پردۂ ساز سے نکلی ہے مگر وہ آواز

کامل القادری نے کائنات کے مظاہر کا سنجیدگی اور گہرائی سے مطالعہ کیا ہے۔ ان کی شاعری تصوف، انسانی جذبات و احساسات، اعلیٰ انسانی قدروں اور آفاقیت کی ترجمان ہے۔ وہ اس حقیقت سے آشنا ہیں۔ نمونہ کلام ملاحظہ فرمائیں:

لو دشت جنوں آج ختم ہوتا ہے
جو دل میں ہے احساس رقم ہوتا ہے
ہزار موج بہاراں گزر گئی لیکن
ابھی ہے زیر نمو کائنات کیا کہیے
ہمیں تو راس نہ آیا نہ آئے گا پھر بھی
چلے چلو اسی کوچے میں پا بریدہ سہی

رنگِ محفل کا دیکھ کر چپ ہیں
وہ سمجھتے ہیں بے زباں ہیں ہم
اس چشمِ نم کا اشارہ کچھ اور ہے
دیکھا جو میں نے خوابِ تمنا کچھ اور ہے
تشنگی کا مری اب کون بھرم رکھے گا
ساقی کھلتا ہے نہ رندوں کا دہن کھلتا ہے
اے لحۂ خاورِ دل ذرّہ سے نکل
اے مظہرِ قلزمِ رم قطرہ سے نکل

(بحوالہ سخنورانِ جھارکھنڈ۔ صفحہ نمبر 348)

کامل القادری کی ایک مشہور نظم 'بلوچستان جاگ اٹھا' اور ایک غزل ملاحظہ فرمائیں۔

بلوچستان جاگ اٹھا:

خوابِ محکومی سے اب بیدار ہیں کوہ و کمر
دشت و صحرا سے عیاں ہے جلوۂ نورِ سحر
ذرّے ذرّے میں ہے رخشندہ شعورِ زندگی
اب کہاں باقی رہی محتاجیِ شمس و قمر
گرم ہے جہدِ بقا سے یوں بلوچوں کا لہو
تھرتھرا اٹھے ہیں جس سے کاخِ کہنہ بام و در
اب کوئی صرصر انہیں پژمردہ کرسکتی نہیں
اب کوئی قوت انھیں افسردہ کرسکتی نہیں
وہ دلوں کے چاک صدیوں سے رہے جو بے رفو
ایک ہی تارِ نظر سے سل گئے اللہ ہُو!
یوں بلوچوں کے قبائل ہوگئے شیر و شکر
جس طرح قوسِ قزح میں رنگ وحدت مُو بہ بو
مردِ حر بیدار ہیں ، بیدار ہیں قلب و نظر
بعد مدت پھر ہوا روشن چراغِ آرزو
اب کوئی اس روشنی کو قید کرسکتا نہیں
اب یہاں کوئی شگوفہ گل کتر سکتا نہیں

(بحوالہ سپر کے پھول)

غـــــزل

اے بلوچوں کی زمیں، اے شیر نر کی چھاؤنی
تختۂ گلزارِ جنت، رزم گاہِ زندگی
تجھ سے میری آبرو ہے، مجھ سے تیری آبرو
شمع سے پروانہ ہے، پروانے سے ہے روشنی
اور ہی کچھ رنگ ہے ، تیرے قتیلِ ناز کا
ورنہ اٹھ جاتی جہاں سے رسم و راہِ عاشقی
دستِ ہمت لکھ رہی ہے آج اک تاریخِ نو
وہ اٹھی شمشیر جاکر، لو چھٹی وہ تیرگی
سرنگوں بیٹھے ہوئے کیا ہو قفس کو لے اڑو
اے اسیرانِ چمن پھولوں کے لب پر ہے ہنسی

بُعدِ منزل سے خطر کیا، بُعدِ منزل کچھ نہیں
شرطِ اوّل غیرتِ قوم و وطن حفظِ خودی
کیا یہ لازم ہے کہ تیری انجمن کا رُخ کرے
کاملِ صحرا نشیں نورِ نگاہِ عاشقی

(بحوالہ سپر کے پھول)

کامل القادری کی مطبوعہ تصانیف یہ ہیں:
سپر کا پھول (شعری مجموعہ)، قدیم بلوچستان، جام و زک، مثنوی بلوچستان، بلوچستان نامہ، بلوچ قبائل، من کی آگ، گل زمین، نورا (ناول)، لمبے سر کا سوار، بولانی کا خزانی، براہوی ادب کا لسانی مطالعہ (تحقیق)، بلوچی ادب کا مطالعہ، مہمات خالد، سکندر اعظم اور محمد بن قاسم کا سفر بلوچستان، اقبال کا شعور مزاح، جامع فہرست مطبوعات بلوچی۔

ان کے علاوہ کامل القادری نے مندرجہ ذیل کتابیں بچوں کے لیے تصنیف کی ہیں: الجیریا، ملیشیا، ایران

کامل القادری کی مطبوعہ تصانیف سے ان چند کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو خدابخش لائبریری (پٹنہ) میں موجود ہیں۔

بلوچ قبائل: یہ کتاب ایم لونگ ورتھ ڈیمز کی انگریزی کتاب ہے جسے کامل القادری نے اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ یہ کتاب 1983 میں کوئٹہ (بلوچستان) سے شائع ہوئی تھی۔

اقبال کا شعور مزاح ، ضمیمہ، جامعہ فہرست مطبوعات، بلوچی، براہوی مع تعارف مصنفین۔

کامل القادری نے پی ایچ ڈی (اردو) کے لیے تحقیقی مقالہ زیرِ نگرانی ڈاکٹر جمیل جالبی کراچی یونیورسٹی میں 1983 میں جمع کیا تھا لیکن سند ملنے سے قبل موت کو گلے لگالیا۔ ان کا موضوع تحقیق 'براہوی ادب کا لسانی مطالعہ' تھا۔ میر محمد علی تالپور وفاقی وزیرِ تعلیم حکومت پاکستان ان کا خاص معتقد تھا۔ مجھے سید قیام الدین نظامی (مقیم کراچی) نے بتایا کہ میر محمد علی تالپور کامل القادری کو کراچی یونی ورسٹی کا وائس چانسلر بنانا چاہتا تھا لیکن ان کی زندگی نے وفا نہ کی۔ آج بھی بلوچستان کے اسکولوں کے تعلیمی نصاب میں کامل القادری کی نظمیں شامل ہیں۔ بلوچستان کے اسکولوں کے بچے کامل القادری کی نظمیں بڑے ذوق وشوق سے پڑھتے ہیں۔

کامل القادری کی شادی بہار شریف میں ہوئی تھی۔ ان کی پانچ اولادیں ہیں۔ دو پسران اور تین دختران۔

کامل القادری کے بڑے صاحبزادے ڈاکٹر شموئیل القادری کراچی یونیورسٹی میں اسلامک اسٹڈیز کے پروفیسر ہیں۔

(راوی سید قیام الدین احمد نظامی، آمد عظیم آباد کے موقع پر راقم الحروف سے ایک یادگار ملاقات بتاریخ 9 نومبر 2014)

کامل القادری کا انتقال 10 رمضان المبارک 1404ھ بمطابق 2 جولائی 1983 کو کراچی میں ہوا۔ وہ قبرستان میوہ شاہ (کراچی) میں مدفون ہیں۔ (بحوالہ سخنورانِ جھارکھنڈ صفحہ نمبر 348، وفیات ناموران پاکستان صفحہ نمبر 653)

حواشی:

1. رموزِ تحقیق از ڈاکٹر سید شاہد اقبال عفیف پرنٹرس نئی دہلی، دوسرا ایڈیشن 2017
2. سخنورانِ جھارکنڈ (حصہ اول) مرتبہ ڈاکٹر اقبال حسین، مطبوعہ فوٹو آفسٹ پرنٹرس کولکاتہ 2012
3. شاعر بمبئی شمارہ بابت ستمبر-اکتوبر 2016 (یادرفتگان کے نام)
4. شیر شاہ اور اس کا عہد: مصنف کالکارنجن قانون گو مترجم رام آشرے شرما، ناشر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی، دوسرا ایڈیشن 1998
5. وفیات ناموران پاکستان مرتبہ ڈاکٹر منیر احمد سلیچ ناشر اردو سائنس بورڈ، لاہور طبع اول 2006
6. ہماری زبان (ہفتہ وار نئی دہلی) بابت شمارہ یکم مارچ 2000 بحوالہ وفیات مشاہیر بہار 2000 کے حوالے سے از ڈاکٹر سید شاہد اقبال)

☆ حضرت سیدنا محمد ن القادری (م: 940ھ)، مزار مبارک انجھر شریف نزد سپیرو ضلع اورنگ آباد (بہار)
حضرت مخدوم سیدنا محمد ن القادری کے ارادتمند بہار، جھارکھنڈ، مغربی بنگال، اڑیسہ اور چھتیس گڑھ میں پھیلے ہوئے ہیں۔

■

Dr. S. Shahid Iqbal
At: Astana-e-Haque, Road No.: 10, West Block, New Karimganj, Gaya - 823001 (Bihar)

ڈاکٹر اخلاق الرحمن قدوائی

محمد رحمت اللہ

اسم بامسمیٰ

اس دنیائے فانی میں ہمیشہ سے موت وزیست کا سلسلہ جاری ہے۔ روزانہ کتنے لوگ اس عالم آب وگل میں آنکھیں کھولتے ہیں اور بے شمار لوگ خاک اوڑھ کر ابدی نیند سو جاتے ہیں۔ جانے والوں میں کچھ ہستیاں اور شخصیتیں اتنی ہمہ جہت ہوتی ہیں کہ گزر جانے کے بعد ان کی یادوں کے نقوش ذہن و دماغ پر رنج والم کی ایک عجیب کیفیت طاری کر جاتے ہیں۔ ان کی موت عالم کی موت کے مترادف ہوتی ہیں۔ ڈاکٹر اخلاق الرحمن قدوائی ایسے ہی لوگوں میں سے ایک تھے جو اپنے کردار وگفتار، قول وفعل، خلوص ومحبت اور گوناگوں خوبیوں کی بنیاد پر ہمیشہ یاد کیے جائیں گے۔ وہ کل تک ہمارے درمیان موجود تھے، مگر افسوس کہ ایک مختصر علالت کے بعد اپنے بے شمار چاہنے والوں کو روتا بلکتا چھوڑ کر اس جگہ پہنچ گئے جہاں جانے والا کبھی واپس نہیں آتا۔ ان کی موت سے جو قوم وملت کا خسارہ ہوا ہے بظاہر اس کا ازالہ مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔

ڈاکٹر اخلاق الرحمن قدوائی ایک ممتاز ماہر تعلیم، معروف سائنسداں، قابل قدر سیاست داں، اعلیٰ منتظم و معمار قوم، نظام تعلیم کے ریفورمر (Reformer) کے نام کے طور پر یاد کیے جاتے رہے ہیں۔ ڈاکٹر قدوائی علم کیمیا (Chemistry) کے بین الاقوامی سطح کے سائنسداں، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سب سے کم عمر پروفیسر، یونین پبلک سروس کمیشن کے ممبر اور چیرمین اور تین ریاستوں کے گورنر، کچھ ریاستوں کے لفٹیننٹ گورنر (اضافی چارج) رہنے کے بعد راجیہ سبھا (پارلیمنٹ کے ایوان بالا) کے رکن بھی بنے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے چانسلر کے طور پر انھوں نے یونیورسٹی کی جدید کاری، بین الاقوامی سطح کی لائبریری خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ (بہار) کی جدید کاری میں اہم رول ادا کیا۔ انھوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کو الٰہ آباد ہائی کورٹ کے ذریعے منسوخ کیے جانے کے بعد 1981 میں وزیر اعظم آنجہانی اندرا گاندھی کے ذریعے علی گڑھ یونیورسٹی کے پھر سے اقلیتی کردار بحال کرانے میں اہم رول نبھایا۔ مسز گاندھی ڈاکٹر قدوائی کو بے حد عزیز رکھتی تھیں۔ لیکن الٰہ آباد ہائی کورٹ نے اس حکم کو پھر رد کر دیا۔ اب وہی معاملہ سپریم کورٹ کے زیر سماعت ہے۔ وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا اقلیتی کردار بحال رکھنے کے لیے سپریم کورٹ میں بھی وائس چانسلر کے ساتھ برابر تعاون کرتے رہے۔

ڈاکٹر اخلاق الرحمن قدوائی بہار بلکہ پورے ملک کی یونیورسٹیوں میں بڑی تبدیلی کے حمایتی رہے ہیں۔ پہلی بار بہار کے گورنر کے طور پر 1980 میں اس وقت کی حکومت سے بہار کی یونیورسٹی اور تعلیمی حلقے میں کئی اہم فیصلے کرائے، ان میں ریاست کی مختلف یونیورسٹیوں کے درمیان ارتباط قائم کرنے اور یونیورسٹیوں کے اعلیٰ اقدار کے لیے انٹر یونیورسٹی بورڈ کا قیام، یونیورسٹی میں اساتذہ کی بحالی میں شفافیت اور معیار کے لیے یونیورسٹی سروس کمیشن کا قیام، سائنس کی معیاری تعلیم کے لیے اچھے استاد کی بحالی، بہتر لیبوریٹری کا قیام، جدید سہولیات کی دستیابی، غیر مالی امداد 250 سے زائد کالجوں کو حکومت کی منظوری، یونیورسٹیوں میں سبھی ذات اور طبقے کے لوگوں کو وائس چانسلر کے طور پر تقرری، بہار پبلک سروس کمیشن میں دلت اور آدیباسی کی رکنیت، یونیورسٹی اساتذہ کی بحالی میں درج فہرست ذات اور قبائل کے لیے ریزرویشن کا نظم وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

اعلیٰ تعلیم کی بہتری کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر قدوائی مسلم بچوں اور بچیوں کی مذہبی تعلیم کے لیے بھی فکرمند رہے۔ اس کے ساتھ ہی ہم وطن بچوں میں سنسکرت کی پڑھائی کے فروغ کے لیے ہی مدرسہ بورڈ اور سنسکرت بورڈ قائم کروایا۔ یہ ان کے سیکولر ذہن کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ ان بورڈ کے اساتذہ کو سرکاری اساتذہ کی طرح تنخواہ کی فراہمی کا نظم یقینی کروایا۔ اتنا ہی نہیں انھوں نے بہار آفیشیل لینگویج (ترمیمی) ایکٹ 1981 کے ذریعے 7 (سات) بنیادی مقاصد کے لیے حکومت بہار کے ذریعے اردو کو ریاست کی دوسری سرکاری زبان کا درجہ بھی دلوایا۔ یہاں یہ واضح رہے کہ یہ پہلی ریاست ہے جہاں اردو سرکاری زبان کا درجہ رکھتی ہے۔ اس ایکٹ کے ذریعے انھوں نے حکومت بہار سے ریاست کے تقریباً تمام کلکٹریٹ، سب ڈویزن اور بلاک دفاتر میں اردو سیل کا قیام کروایا اور اس میں اردو عملے کی بحالی بھی کروائی۔

ڈاکٹر قدوائی ہی ایسے شخص تھے جنھیں کسی ریاست کا دو بار گورنر بننے کا شرف حاصل ہوا۔ بہار کی گورنری کے دوران انھوں نے یہاں کی یونیورسٹیوں کے چانسلر کے فرائض بھی انجام دیے۔ بہار میں بالخصوص تعلیمی انقلاب لانے میں انھوں نے اہم کردار ادا کیا۔ مولانا آزاد انجینئرنگ کالج، پٹنہ؛ کٹیہار میڈیکل کالج، کٹیہار؛ امارت شرعیہ، پٹنہ؛ شاہ رشید اللہ انسٹی ٹیوٹ، پٹنہ؛ جامعہ ابن تیمیہ، چندن باڑا (مشرقی چمپارن)؛ توحید ایجوکیشنل ٹرسٹ، کشن گنج؛ نیشنل اردو لائبریری، ریونڈھا (دربھنگہ)؛ قاضی احمد ڈگری کالج، جالے (دربھنگہ) جیسے معروف تعلیمی، سماجی وملی اداروں کو ان کی سرپرستی حاصل رہی اور آج جو موجودہ چمک دمک ان اداروں میں قائم ہے وہ ڈاکٹر قدوائی کی کوشش کا ہی ثمرہ ہے۔ اتنا ہی نہیں پٹنہ کی خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری کی جدید کاری بھی موصوف کی تحریک پر اس دور میں ہوئی جب وہ لائبریری کے ایکس آفیشیو چیرمین (Ex-Officio Chairman) تھے۔ ان کی کوششوں سے ہی یہ لائبریری اعلیٰ تعلیم وتحقیق کے طلبا کے لیے انفارمیشن ٹکنالوجی سے آراستہ ایک اہم ریفرنس لائبریری کا درجہ حاصل کر سکی۔ یہاں یہ باور کرانا ضروری ہے کہ اس لائبریری کو دو ہی گورنر نے بین الاقوامی سطح کی لائبریری بنانے میں اہم رول ادا کیا۔ پہلے گورنر ڈاکٹر ذاکر حسین تھے جنھوں نے نائب صدر کی حیثیت سے ایوان بالا میں اسے پاس کرا کر سنٹرل گورنمنٹ کی تحویل میں دے دیا اور دوسرے ڈاکٹر قدوائی جن کی ذاتی توجہ اور کوششوں سے موجودہ چمک دمک قائم ہے۔

ڈاکٹر قدوائی یکم جولائی 1920 کو اتر پردیش کے

ضلع بارہ بنکی کے بڑا گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام مرحوم اشفاق الرحمٰن قدوائی اور والدہ کا نام مرحومہ نسیم النساء تھا۔ ان کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی جہاں انھیں ایک استاد پڑھانے آتے تھے۔ بعدۂ گاؤں کے اسکول میں پڑھے۔ 1940 میں جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی سے انھوں نے گریجویشن کیا۔ اس کے بعد اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے امریکہ چلے گئے۔ وہاں انھوں نے 1948 میں ایم ایس سی اور پھر 1950 میں کارنیل یونیورسٹی سے بایوکیمسٹری (Bio Chemistry) میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ وطن لوٹنے کے بعد 1950 کی دہائی میں انھوں نے اپنا کیریر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ کیمیا میں لکچرر کی حیثیت سے شروع کیا اور بعد میں ترقی کر کے وہ ریڈر اور پروفیسر بھی ہوئے اور شعبے کے صدر کے ساتھ ہی فیکلٹی آف سائنس کے ڈین بھی رہے۔

پروفیسر قدوائی 1967 تک اس ادارے سے منسلک رہے اور اس دوران انھوں نے یونیورسٹی پراکٹر کے ساتھ ہی پہلے ڈین اسٹوڈنٹس ویلفیئر کے طور پر خدمات انجام دیں۔ اس کے بعد وہ یونین پبلک سروس کمیشن کے چار سال رکن اور پھر چار سال 1974 سے 1977 تک اس ادارہ کے چیر مین رہے۔ ڈاکٹر قدوائی 1979 سے 1985 اور 1993 سے 1998 تک دو مرتبہ کل تیرہ سال بہار کے گورنر رہے۔ یہ ایک رکارڈ مدت ہے۔ پھر انھیں 1998 سے 1999 تک مغربی بنگال کا گورنر بنا دیا گیا۔ پروفیسر قدوائی 1983 سے 1992 کے دوران علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے چانسلر اور ممبئی مرکنٹائل کوآپریٹیو بینک کے چیر مین بھی رہے۔ وہ انسٹی ٹیوٹ آف مارکیٹنگ اینڈ مینجمنٹ، نئی دہلی کے چیر مین وو کیشنل ایجوکیشنل سوسائٹی فار وومن کے بھی صدر رہے۔ وہ انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر کے فاؤنڈر ممبر (ممبر شپ نمبر 72 تھا) رہے۔ اور اس کی بنیاد ڈالنے سے لے کر اس کی تعمیر و ترقی میں بڑا کردار ادا کیا۔ انھوں نے جنوری 2000 سے جولائی 2004 تک راجیہ سبھا (پارلیامنٹ کے ایوان بالا) کے معزز رکن کے طور پر خدمات انجام دیں۔ اس کے بعد وہ ہریانہ کے گورنر مقرر ہوئے جہاں انھوں نے 2004 سے 2009 تک اپنی خدمات انجام دیں۔ ڈاکٹر پرتیبھا سنگھ پاٹل کے راجستھان گورنر کے عہدے سے استعفیٰ کے بعد چند ماہ تک انھوں نے راجستھان کے گورنر کے فرائض بھی انجام دیے۔ یہاں جون 2007 سے 6 ستمبر 2007 تک رہے۔

ڈاکٹر اخلاق الرحمٰن قدوائی نے ایک ماہر سائنسداں اور محقق کے طور پر بھی بایوکیمسٹری 'آرگینک اور نیچرل پروڈکٹس' (Organic and Natural Products) کی دنیا میں اپنی صلاحیت کا لوہا دنیائے سائنس سے منوایا اور تقریباً 35 برسوں تک اعلیٰ تعلیم خصوصاً سائنس و ٹکنالوجی، ایجوکیشن ٹکنالوجی، تحقیق، غیر روایتی طریقہ تعلیم اور ووکیشنل ایجوکیشن کے مسائل حل کرتے رہے۔ اتنا ہی نہیں انھوں نے سائنسی موضوعات پر لگ بھگ 40 اور یجنل تحقیقی مقالے پیش کیے جو قومی اور بین الاقوامی سطح کے جرنلس میں شائع ہو کر دنیائے سائنس سے خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ وہ یونیورسٹی کی زندگی کا آغاز کرنے کے بعد لگاتار سائنسی تلاش و جستجو اور تحقیقات کے کاموں میں مشغول رہے اور بین الاقوامی سطح پر علم کیمیا کے مشہور سائنسداں کے طور پر ان کی شناخت قائم ہوئی۔ انھیں جو بھی ذمے داری ملی اسے انھوں نے پوری ایمانداری، لگن اور محنت کے ساتھ انجام دیا۔ یو پی ایس سی (UPSC) کے ممبر اور پھر چیئر مین کے طور پر جو انھوں نے بہتر ناظم کی صلاحیت کا ثبوت دیا اس کے ہی نتیجے میں انھیں بہار کے گورنر کا عہدہ تحفتاً پیش کیا گیا۔ یہاں بھی انھوں نے ماہر ناظم کی شکل میں کافی شہرت حاصل کی اور یہی وجہ ہے کہ انھیں یہاں کا دوبارہ گورنر بنایا گیا۔ بہار کے گورنر کی حیثیت سے چانسلر کے طور پر ریاست کی یونیورسٹیوں میں انھوں نے تعلیمی معیار کو بلند کرنے کے لیے کئی طرح کے منصوبے شروع کیے۔ انھوں نے بہار کی پسماندگی اور غریبی دور کرنے کے لیے اندرا گاندھی سے ملاقات کی اور بہار کے لیے کئی منصوبوں کو منظوری دلائی۔ وہ بہار کو ایک ترقی یافتہ ریاست کے طور پر بنانے کے لیے برابر کوشاں رہے اور اس کو لے کر ہی بہار کے لیے کئی منصوبوں کو مرکز کی منظوری دلائی اور یہی وجہ ہے کہ انھیں بہار کے بعد مغربی بنگال پھر ہریانہ اور دوسری ریاستوں کی ذمے داری بحیثیت گورنر سونپی گئی اور آپ نے اپنی ذمے داری احسن طریقے سے نبھائی اور ہر جگہ ہر دل عزیز رہے۔ ان کی گوناگوں دلچسپیوں میں باغبانی اور برڈس ریئرنگ کا خاص مقام رہا ہے۔ ان کاموں کے ذریعے وہ جوان نسل کو روزگار سے جوڑنا چاہتے تھے۔

ڈاکٹر قدوائی کا بندۂ ناچیز سے خادمانہ و نیاز مندانہ تعلق تھا۔ جب بھی ملتے مسکراتے ہوئے ملتے، انتہائی شفقت و محبت سے خیریت دریافت فرماتے۔ خدا بخش لائبریری، پٹنہ، نیشنل اردو لائبریری، ریونڈھا؛ امارت شرعیہ، پھلواری شریف کے متعلق ضرور پوچھتے۔ ان اداروں سے ان کو بے پناہ محبت تھی۔ دعاؤں سے نوازتے اور حوصلہ دیتے۔ یہ ڈاکٹر قدوائی کی بلند نگاہی اور اعلیٰ ظرفی تھی کہ اپنے چھوٹوں سے بھی ٹوٹ کر پیار کرتے تھے اور دل سے دعائیں دیتے تھے۔

ڈاکٹر قدوائی مسلمان اور برادر وطن بلکہ سبھوں کے لیے بلاشبہ مثل آفتاب تھے۔

ڈاکٹر اخلاق الرحمٰن قدوائی کی زندگی کے کس پہلو کو اجاگر کیا جائے۔ ان کی شخصیت کو چند جملوں میں سمیٹنا ممکن نہیں۔ ہر پہلو روشن اور آبدار ہے۔ آپ ایک بلند پایہ عالم، کتاب وسنت کے رمز آشنا، دبستان خطابت کے مہکتے گلاب، عظیم الشان خطیبانہ صلاحیت کے حامل، محبت و مودت اور تواضع و انکساری میں اپنی مثال آپ، امت مسلمہ کے بے لوث خادم، آخری وقت تک ملک وملت کی فکر رکھنے والے بلا امتیاز مسلک و مشرب کے دھڑکتے دلوں کے درد کا درماں، الغرض ڈاکٹر قدوائی متعدد اوصاف اور مجموعۂ کمالات تھے اور بہت سی دینی، تعلیمی، سماجی، ادبی، ثقافتی، سائنسی، تکنیکی، سرکاری، نیم سرکاری اداروں اور انجمنوں کے اہم رکن اور روح رواں تھے۔ ان کے مجاہدانہ کارنامے اور ان کی خدمات کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ ان کو پھیلا دیا جائے تو ایک دفتر بن جائے گا۔

ان کی مجموعی خدمات کے لیے ویسے تو بہت سارے اعزازات و انعامات سے انھیں نوازا گیا۔ 2010 میں انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو اسٹڈیز نئی دہلی نے انھیں لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ سے نوازا۔ اس کے تحت انھیں سند، میمنٹو کے علاوہ ایک لاکھ روپے کا چیک بھی دیا گیا۔ اس چیک کو ڈاکٹر قدوائی نے یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ یہ ادارہ ملک گیر پیمانے پر قوم وملت کے بچوں کے لیے بہت سے فلاحی کام انجام دیتا رہا ہے۔ اس لیے یہ رقم بھی انہی فلاحی کاموں میں خرچ کی جائے، اس سے مجھے زیادہ خوشی ملے گی۔ عوامی زندگی میں ان کی انھیں گراں قدر خدمات کے اعتراف میں ہی انھیں 2011 میں ملک کے دوسرے سب سے بڑے شہری اعزاز 'پدم وبھوشن' سے نوازا گیا تھا۔

بدھ 24 اگست 2016 کو اس عظیم شخصیت نے دن کے 11.30 بجے اسکارٹس اسپتال، دہلی میں آخری سانس لی۔ انھیں نمونیا کا مرض ہو گیا تھا۔ ایک ہفتے تک اسپتال کے ICU میں زیر علاج رہے۔ سرٹیفکیٹ کے مطابق وہ 96 برس کے تھے ویسے انھوں نے اپنی عمر عزیز کے سو سال اس دار فانی میں گزارے۔ ان کی نماز جنازہ جمعرات کو بعد نماز ظہر جامعہ ملیہ قبرستان نئی دہلی میں ہوئی اور وہیں کے قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔ ان کے پسماندگان میں دو لڑکے اور چار لڑکیاں ہیں۔ ان کی اہلیہ جمیلہ قدوائی مغربی بنگال میں رہنے کے دوران ہی اس دنیا سے گذر گئی تھیں۔

■

Dr. M Rahmatullah
Consulting Editor (Urdu), Doordarshan News
Mandi House, New Delhi - 110001
Mob.:9818462389

فرحت قادری
شخص اور شاعر

احمد صغیر

فرحت قادری کے خاندانی شجرے سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا تعلق شیخپورہ (ضلع مونگیر) کے سادات بارہ گانواں سے ہے۔ یہ سادات حضرت سید احمد جاجنیری کی اولاد ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ بزرگ بغداد سے ہندوستان آئے اور حکومت دہلی نے ان کی برگزیدہ شخصیت کے پیش نظر علاقہ لکھی سرائے (ضلع مونگیر) کے ایک گاؤں ندیانواں میں خانقاہ کے لیے انھیں جگہ دی اور ارد گرد کے چند مواضعات بھی جاگیر کے طور پر عطا کیے۔ سید احمد جاجنیری کا مزار موضع ندیانواں (شیخپورہ) میں ہے۔ ان کے پانچ بیٹے تھے جو مختلف علاقوں میں جا کر آباد ہو گئے۔ مثلاً سید علی شیر گیسو درازؒ جنوبی ہند میں حیدرآباد کے علاقے میں آباد ہوئے۔ آپ کا مزار گلبرگہ میں ہے۔ سید حیدر عرف شاہ باگھؒ بہار شریف کے علاقے میں آباد ہوئے۔ آپ کا مزار مخدوم الملک شاہ شرف الدین یحییٰ منیریؒ کے آستانے کے شمال میں ہے۔ سید شاہ جمال الدینؒ شیخپورہ کے پہاڑی سلسلے کے آس پاس آباد ہوئے۔ شیخ پورہ کا بارہ گانواں آپ ہی کی اولادوں سے آباد ہوا۔ آپ کا مزار موضع جمواڑا کی پہاڑی پر ہے۔ سید شاہ برہان الدین موضع سامحہ پرگنہ بلیا میں آباد ہوئے، وہیں آپ کا مزار ہے۔ سید شاہ یوسف موضع چونپڑ پرگنہ سمائے (ضلع گیا) میں آباد ہوئے، وہیں آپ کا مزار ہے۔

فرحت قادری کا تعلق سید احمد جاجنیری کی تیسری اولاد سید شاہ جمال الدین سے ہے۔ انھیں کی اولادوں نے شیخ پورہ کے بارہ گانواں کو آباد کیا۔ ان کے خاندان میں کئی خدا رسیدہ بزرگ پیدا ہوئے جن کے فیض سے قریب و دور کے لوگ بہرہ مند ہوتے رہے۔ فرحت قادری کے دادا مولانا سید ابو محمد ابرار حسین رحمانی موضع کٹنی کول (شیخ پورہ، ضلع مونگیر) کے رہنے والے درویش صفت بزرگ تھے۔ آپ عرصہ دراز تک خانقاہ رحمانیہ، مونگیر سے منسلک تھے۔ جنوبی بہار کے بیشتر شہروں میں آپ کے ارادت مندوں کی بڑی تعداد موجود ہے۔ آپ نے 9 اگست 1947، موضع کٹنی کول میں انتقال فرمایا اور وہیں مدفون ہوئے۔ آپ کی دو شادیاں ہوئیں۔ محل اولی سے تین صاحبزادیاں اور دو صاحبزادگان ہیں۔ بڑے صاحبزادہ فرحت قادری کے والد حکیم سید ابوالظفر محمد قادری (فاضل دیو بند و فاضل الطب، لکھنؤ) ہیں۔ محل ثانی سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ 1930 میں فرحت قادری کے والد بسلسلۂ طبابت بہار کے مشہور تاریخی شہر گیا تشریف لائے اور یہیں بود و باش اختیار کر لی۔ آپ عرصہ دراز تک گیا ضلع جمیعتہ العلما ہند کے صدر رہ چکے ہیں۔ آپ کا انتقال 12 دسمبر 1975 کو محلہ معروف گنج، گیا میں ہوا اور محلہ کریم گنج، گیا کے پرانے قبرستان میں مدفون ہیں۔ ابوالظفر محمد کے چار صاحبزادگان اور ایک صاحبزادی ہیں۔ فرحت قادری دوسری اولاد ہیں۔

فرحت قادری کی پیدائش 6 جنوری 1928 بروز جمعہ بہ وقت صبح صادق اپنے ننہیال موضع اوگانواں میں ہوئی۔ ان کا تاریخی نام سید ابو الفرح ذوالنون محمد جاہ ہے۔ ان کے والد گیا کے محلہ معروف گنج میں مقیم ہو گئے تھے۔ اس لیے ان کی پرورش و پرداخت یہیں ہوئی۔

گیا آنے کے بعد فرحت قادری کی بسم اللہ خوانی کرائی گئی۔ اُردو فارسی کی تعلیم مقامی مکتب اور مدرسہ سے حاصل کی۔ عربی کی تعلیم کے لیے 1939 میں ان کے ماموں مولانا سید فصیح احمد اپنے ساتھ سرونج لے گئے جہاں وہ سرکاری مدرسے میں عربی کے استاد تھے۔ 1941 سے 1944 تک فرحت قادری دارالعلوم دیو بند میں عربی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرتے رہے۔ اس کے بعد انگریزی تعلیم کی طرف متوجہ ہوئے اور اپنے شہر کے ایک اسکول ہری داس سمیزی میں داخلہ لیا۔ جہاں ان کے ہم جماعت میں سید شہاب الدین تھے جو اپنی ذہانت کے لیے مشہور تھے۔ فرحت قادری نے گیا کالج، گیا سے آئی۔ کام کا امتحان پاس کیا۔ 1954 میں تلاش معاش کے لیے کلکتہ پہنچے اور دو سال تک مختلف کمپنیوں میں کام کرتے رہے۔ آخر کار 1956 میں سول کورٹ گیا میں ملازمت حاصل کی اور یہیں سے ریٹائر ہو کر محلہ نیو کریم گنج، گیا میں سکونت پذیر رہے اور 10 دسمبر 2016 کو اس دار فانی سے رخصت ہو گئے۔

دیو بند کے علمی و ادبی ماحول نے فرحت قادری کو شاعری کی طرف راغب کیا۔ دیو بند میں محمد حنیف اسلم مظفر نگری مدیر 'روحانی عالم' نے انھیں شاعری کی راہ پر لگایا۔ عام روایت کے مطابق فرحت قادری کی شاعری کی ابتدا بھی غزل سے ہوئی۔ 1947 سے باضابطہ مشاعرے میں اپنا کلام سنانے لگے اور ان کی غزلیں اخبار و رسائل کی زینت بننے لگیں۔ فرحت قادری نے ہر صنف میں طبع آزمائی کی لیکن غزلوں کی طرف ان کا رجحان زیادہ رہا۔ مرزا غالب، جگر مراد آبادی، فیض احمد فیض ان کے محبوب شاعروں میں تھے۔ ان شاعروں نے انھیں بے حد متاثر کیا۔ کافی مدت تک انھوں نے کسی سے مشورہ سخن نہ کیا اور محض ذوق شعری اور فطری رجحان کے سہارے جادہ شعر و سخن پر آگے بڑھتے رہے مگر محسوس کیا کہ ایک استاد کی ضرورت ہے لہٰذا 1963 میں ظہیر غازی پوری کے توسط سے حضرت علامہ ابر احسنی گنوری (بدایونی) سے اصلاح لینا شروع کیا اور 1965 میں فارغ الاصلاح ہوئے۔

1968 میں قومی نظموں کا مجموعہ 'زمین ہند' کے نام سے شائع ہوا۔ 1975 میں غزلوں اور قطعات و رباعیات کا مجموعہ 'کائنات غم' منظر عام پر آیا۔ اس میں 1950 سے

1970 تک کی منتخب تخلیقات شامل ہیں۔ 1981 میں علم عروض و بلاغت پر مبنی 'ضروریات شعروادب' شائع ہوئی۔ 1983 میں غزلوں اور نظموں کا دوسرا مجموعہ 'شیشے اور پتھر' کے نام سے منظر عام پر آیا۔ اس میں 1970 کے بعد کی تخلیقات شامل ہیں۔ 1988 میں حمد و نعت کا مجموعہ 'رقص و عکس' اشاعت پذیر ہوا۔ 1997 میں غزلوں کا مجموعہ 'ایک جام اور' شائع ہوا۔ 1999 میں ایک موضوعی نظموں کا مجموعہ 'اندھیرے کے مسافر' منظر عام پر آیا۔

فرحت قادری قریب 50 سال تک شعروادب کی خدمت میں مصروف رہے۔ یوں تو گاہے گاہے ان کی دوسرے انداز کی نگارشات بھی شائع ہوتی رہیں لیکن ان کا بنیادی مزاج ایک غزل گو کا مزاج تھا۔ ویسے انھوں نے نظمیں بھی کہی ہیں اور ان کی مقدار بھی خاصی ہیں۔ فرحت قادری ایسے شاعر ہیں جو اپنے آپ کو منوا لینے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ 'کائنات غم' ان کا دوسرا مجموعہ کلام ہے۔ جس میں 131 غزلیں، 23 نظمیں، 70 قطعات، 24 رباعیات اور کچھ متفرق اشعار ہیں۔

فرحت قادری نے نہ تو کسی تسکین قلب کے لیے اور نہ شہرت کے دیار کاذب کی شہریاری کے لیے شاعری کی ہے۔ انھوں اپنی تخلیقی ذکاوت کو تمام معاشرے کی بھلائی کے لیے وقف کر دیا۔ شاعر کبھی تنہا نہیں ہوتا بلکہ وہ جس دنیا میں رہتا ہے اور جن دنیاؤں کی سیر کرتا ہے، وہ سب اس کے ہمراہ ہمہ وقت ہوتی ہیں۔ شاعر اور سماج کا رشتہ ساکت اور غیر متحرک ہرگز نہیں ہوتا۔ وہ معاشرے سے متعلق ہو کر اس میں تگ و دو کرتا ہے۔ وہ زندگی کو جاوداں بنانے کے لیے دکھ سہتا ہے۔

اک قیامت تھی شب غم کا گزرنا فرحت
رات بھر پھوٹ کے رویا کیے چھالے دل کے

گردش تقدیر نے برسوں رلایا ہے مجھے
اک تبسم کے لیے جب بھی کوئی تدبیر کی

فرحت قادری نے غزل میں عصر حاضر کے مسائل اور نئے تہذیبی عناصر کو جلا بخشی۔ انھوں نے بہت محتاط رویہ اختیار کیا اور شاعری کو شاعری ہی رہنے دیا۔ فرحت قادری نے اپنی شاعری میں رائج تمام اندھی روایتوں کی زنجیریں توڑ ڈالیں لیکن جو روایات زندگی عطا کرتی ہیں ان کا ضرور خیال رکھا۔ انھوں نے دنیا کے ساتھ ساتھ دین کی پاسداری کا بھی خیال رکھا۔ وہ انسانوں کی فلاح کے ساتھ زندگی کے بھی امین رہے اور لہجے میں پیار بھری نرمی پیدا کی۔ ان کی غزل محض عشقیہ اور جمالیاتی حس لیے ہوئے نہیں ہے بلکہ اس میں اپنے عہد کی آگہی ملتی ہے۔

ان کے کلام کا خاصہ یہ ہے کہ اس میں اخلاقی، مفکرانہ اور فلسفیانہ طرز کی مساعی موجود ہے۔ یہ انداز ایک شاعر کو کلام کی آفاقی حدود تک لے آتا ہے۔ سچی شاعری حقیقت میں نہ کبھی قدیم ہوتی ہے اور نہ جدید، یہ تو سدابہار شاعری ہوتی ہے۔ فرحت قادری کو ہم غزل گو شعرا یا نظم نگاری کی تخصیص کا پابند نہیں کر سکتے۔ غزل ہو یا نظم وہ کسی صنف کے اسیر نہیں رہے۔ وہ کسی طرح کے ادبی حصاروں میں بند بھی نہیں رہے۔ فرحت قادری نے ہمیشہ ان چیزوں سے گریز کیا۔ وہ ایک ایسے نظریے پر گامزن رہے جو دنیا کو صراط مستقیم پر لاتا ہے:

اُس دور کے ہم پروردہ ہیں، آرام کا جس میں نام نہیں
تعزیر تو ہے، انعام نہیں، تعلیم تو ہے اکرام نہیں

ارباب سیاست کو ہم سے پرخاش اگر ہے، ہونے دو
ہم اہل محبت ہیں یارو! پرخاش ہمارا کام نہیں

———

جو دلوں میں نور بھر دے، جو غموں کو دور کر دے
وہی فکر و فن مناسب، وہی آگہی گوارا

———

سختیاں وقت انھیں پہ کرتا ہے
وقت کے جو رسول ہوتے ہیں

فرحت قادری حساس، ذہین اور باصلاحیت شاعر تھے۔ ان کے افکار و جذبات سنجیدگی کا دامن کبھی نہیں چھوڑتے۔ ان کی شاعری میں ان کی ذکاوت اور عالمانہ وقار کی جلوہ گری نظر آتی ہے۔ ان کی زبان سادہ، سلیس ہونے کے باوجود پُر اثر ہے۔ انداز دلنشیں ہے۔ ان کی شاعری میں ایک خاص قسم کا ٹھہراؤ ہے۔ وہ جذبات کی رو میں نہ بہتے نظر آتے ہیں نہ بھٹکتے دکھائی دیتے ہیں۔ انھوں نے اپنی غزلوں میں اپنی دلی کیفیات کے ساتھ ماحول کی بھرپور ترجمانی کی ہے جس کی وجہ سے ان کے اشعار قاری پر دیرپا اثر چھوڑ جاتے ہیں۔ یہی شاعری کی سب سے بڑی کامیابی ہے:

بھرے مکان میں طوفاں کے بعد کوئی نہ تھا
بھٹک رہی تھی بس اک بے اثر دعا گھر میں

نہ چھت ملے گی نہ دیواروں کا نشاں ہوگا
یہ جانتا تو پلٹ کر نہ گھر گیا ہوتا

———

ہم نے سورج کو خلاؤں میں اُچھالا، لیکن
روشنی سے بھی جو نکلے تو اندھیرے نکلے

فرحت قادری کی شاعری اس لیے پسند کی جاتی ہے کہ ان کی باتیں پڑھنے والوں کی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ ان کے تجربات اور محسوسات اپنے ماحول کی عکاس نظر آتی ہے۔ فرحت قادری نے چونکانے والے اشعار کبھی نہیں کہے۔ ان کے اشعار آہستہ آہستہ ذہن و دل کو اس طرح متاثر کرتے ہیں کہ پڑھنے اور سننے والوں کو خبر تک نہیں ہوتی۔ ان کی شاعری پھلجھڑی نہیں کہ ایک پل کے لیے فضا روشن اور دوسرے ہی لمحے گھپ اندھیرا۔ فرحت قادری کی شعری تخلیقات وہ چراغ ہیں جن کی لو مدھم سہی مگر اماوس کی راتوں میں صبح تک ساتھ دیتے ہیں۔

دشمن کے پتھروں نے بھی بخشا نہ تھا وہ درد
اپنے چمن کے پھول جو نشتر چبھو گئے

———

خامشی بھی مری مشکوک ہے دنیا کے لیے
اور بولوں تو قیامت ہی بپا ہوتی ہے

فرحت قادری سیاست سے ہمیشہ دور رہے مگر بھرپور سیاسی شعور رکھتے تھے۔ سماجی مسائل سے واقف تھے ملک و قوم کے احوال و کوائف سے کبھی بے خبر نہیں رہے۔ زبان شستہ اور انداز بیان شائستہ رہا۔ محفل دوستاں ہو یا خلوت دوست، ادب کے دامن کو مضبوطی سے تھامے رہے۔ اسے کبھی تنہا چھوڑنے کے قائل نہیں رہے۔

اتنا لوٹا ہے رہنماؤں نے
ہم ہر اک رہنما سے ڈرتے ہیں

———

بندگی تو مری فطرت میں ہے داخل اے دوست
تو نہ ہوتا تو پھر اپنی ہی پرستش ہوتی

فرحت قادری کا پورا کلام پڑھ جائیے شروع سے آخر تک ایک رنگ و آہنگ میں ڈھلا ہوا ملے گا۔ وہ ہر موسم میں لباس کی طرح انداز بیان نہیں بدلتے۔ اُردو ادب میں کئی تحریکیں آئیں اور ختم ہو گئیں مگر فرحت قادری کے فکر و فن کا باغ ہمیشہ ہرا ابھرا رہا۔ وہ تحریک کے پیچھے بھی نہیں بھاگے۔ ان کی شاعری اور زندگی کی کامیابی کا سبب ان کی محتاط روی یا محتاط رویہ ہے۔ زندگی کا سفر ہو یا ادب کا فرحت قادری آہستہ آہستہ قدم جما کے چلتے رہے۔ اس لیے کوسوں کا سفر طے کرنے کے باوجود نہ ان کے شوق میں کمی آئی نہ دم پھولا اور نہ ہی حوصلوں نے تھکن محسوس کی۔

لڑا جو موجوں سے، اور ابھرا بھنور سے ٹکرا کے پار اترا
سفینۂ عمر کے لیے خود بھنور ہی ساحل نہیں تو کیا ہے

فرحت قادری کی دلچسپی خاص طور سے صنف غزل سے رہی ہے جس کے ذریعے وہ اپنے احساسات، جذبات، افکار و تجربات نہایت سنجیدگی اور سادگی کے ساتھ پیش کرتے رہے ہیں جس میں ہمیشہ انھیں کامیابی اور نیک نامی ملی ہے۔

■

Ahmad Sagheer
Haneef Manzil, Koyli pokhar,
Police Line, Gewal Bigha
Gaya - 823001 (Bihar)

حکیم سید غلام مہدی راز حیات و خدمات

حافظ سید حبیب الرحمن کانپوری

دہلی سے شمال مشرق کوئی ڈیڑھ سو کلو میٹر کے فاصلے پر مغربی اتر پردیش کی ایک مشہور بستی نوگنواں سادات (ضلع مراد آباد، پھر جے پی نگر، اور اب امروہہ) میں ان کی پیدائش سادات کے ایک معزز گھرانے میں 17 مئی 1940 مطابق 9 ربیع الثانی غالبًا 1360ھ بروز جمعہ ہوئی۔ وہاں نوے فیصد سیدوں کا سلسلۂ نسب نامہ اثنا عشری کے سلسلے کے چوتھے امام حضرت زین العابدین علی ابن الحسین علیہ السلام پر منتہی ہوتا ہے۔ اجداد میں مشہور صوفی بزرگ حضرت بابا فرید الدین گنج شکر کے داماد حضرت مولانا سید بدرالدین اسحٰق تھے۔ ان کی زوجہ یعنی حضرت فریدالدین گنج شکر کی بیٹی اپنے دور کی معروف بزرگ خاتون بی بی فاطمہ تھیں جن کا مزار دہلی میں قطب مینار جاتے ہوئے راستے کی ایک آبادی 'ادھ چنی' میں ہے۔ ان کے دو بیٹے مولانا خواجہ سید محمد امام اور مولانا خواجہ سید موسیٰ تھے۔ دونوں کی پرورش اور تربیت محبوب الٰہی حضرت نظام الدین اولیا کے زیر سایہ ہوئی۔ حضرت خواجہ سید موسیٰ کا مزار درگاہ حضرت نظام الدین اولیا کے اندر ہی ہے۔ مولانا خواجہ سید محمد امام کا مزار درگاہ کے احاطے سے باہر اس سے متصل ہی ہے اور آج بھی مرجع خواص وعوام ہے آج بھی بستی نظام الدین میں وہ دادا مولانا کہہ کر یاد کیے جاتے ہیں دادا مولانا کے پانچ بیٹے تھے۔ بڑے بیٹے مولانا سید فخرالدین نے نوگنواں سادات کو آباد کیا۔ نوگنواں سادات کی آبادی کی اکثریت حضرت سید فخرالدین کے سلسلہ نسب سے ہے۔ ان کے خاندان کے تین بزرگ اشخاص سید خادم علی، سید بدر علی اور سید سجاد علی 1857 کے ہنگامے میں انگریزوں سے بغاوت کے الزام میں پھانسی دے کر شہید کردیے گئے۔ سید خادم علی ان کے دادا کے دادا تھے۔ ان حضرات کے مصلوب ہونے کے بعد زمین جائداد ضبط کرلی گئی۔ قناعت پسندوں کا سلسلہ تھا۔ ملک کی آزادی کے بعد اس سلسلے میں کسی نے کوئی دعویٰ نہیں کیا۔ 1947 کے بعد ان کے دادھیال اور ننھیال کے آدھے لوگ پاکستان منتقل ہوگئے اور بچی کھچی املاک کسٹوڈین کی نذر ہوگئی۔ ان کے والد سچے محب وطن تھے۔ بہت سی ترغیبات کے باوجود انھوں نے ملک نہیں چھوڑا۔

ان کے والد محترم سید مشیت علی صاحب تھا،س سرکاری پرائمری اسکول کے صدر مدرس تھے۔ 1976 میں ان کا انتقال ہوا۔ انھوں نے اپنے بچپن میں انھیں سے تعلیم وتربیت حاصل کی۔ 1953 گورنمنٹ ہائر سیکنڈری اسکول امروہہ سے یوپی بورڈ کا ہائی اسکول کا امتحان پاس کیا۔ اس وقت عمر صرف (13) تیرہ سال تھی۔ اس دور میں اس عمر میں ہائی اسکول کرلینا ایک ریکارڈ تھا۔ اپنے ایک بہی خواہ کے مشورے سے ان کے والد محترم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے طبیہ کالج میں داخلہ کے لیے لے گئے۔ اس وقت وہاں داخلے کے لیے انٹر سائنس پاس ہونے کی شرط نہ تھی۔ نہ داخلے کے لیے کوئی مقابلہ کا امتحان ہوتا تھا۔ صرف انٹرویو ہوا داخلہ ہوا اور 1958 میں بی یو ایم ایس کرلیا۔ بعد میں ادیب کامل اور ایم اے فارسی وعربی میں کیا۔

دوران ملازمت تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا۔ یونیورسٹی کی شبینہ کلاسوں میں تعلیم حاصل کی۔ مذہبی درس گاہوں سے استفادہ کیا۔ بعض امتحانات پرائیویٹ طور پر بھی پاس کیے۔

بی یو ایم ایس کرنے کے بعد جنوری 1960 میں اتر پردیش کے ہیلتھ ڈائرکٹریٹ میں ریڈیولوجی ڈپارٹمنٹ

کے تحت روزانہ تنخواہ (ڈیلی ویجز) پر سب سے پہلے الہ آباد میں اودھ میں اودھ کمبھ میلے میں تقریباً دو ماہ کام کیا۔ پھر اسی طرح کے میلوں میں گونڈہ، مرزا پور اور فیض آباد میں تھوڑے تھوڑے عرصے تک کام کیا۔ اسی سال ہمدرد (وقف) لیبریٹریز دہلی میں اطبا کی خالی جگہیں مشتہر ہوئیں تو درخواست بھیج دی۔ تحریری امتحان اور انٹرویو کے لیے بلایا گیا۔ نتیجے کے طور پر یکم اگست 1950 کو ہمدرد دواخانے کے شعبۂ مجلس تشخیص و تجویز میں بہ حیثیت جونیر طبیب تقرر ہوگیا۔ 31 اگست 1966 تک وہاں کام کیا اور کچھ عرصے کے لیے شعبے کے انچارج کی ذمے داری بھی سنبھالی۔ اس دور میں آصف علی روڈ نئی دہلی پر ہمدرد ریسرچ کلینک اینڈ نرسنگ ہوم قائم ہوا جہاں سینئر ہاؤس فزیشین/ ریسیڈنٹ میڈیکل آفیسر کے عہدے کی پیش کش کی گئی اور یکم ستمبر 1966 کو وہاں جوائن کرلیا۔ تقریباً ساڑھے چار سال وہاں کام کیا۔ پھر وزارت صحت و خاندانی منصوبہ بندی (اب خاندانی بہبود) حکومت ہند کے تحت قائم شدہ سنٹرل کونسل فار ریسرچ ان انڈین میڈیسن اینڈ ہومیوپیتھی (CCRIMH) کے لٹریری ریسرچ یونٹ تکمیل الطب کالج لکھنؤ میں 22 فروری 1971 کو ریسرچ اسسٹنٹ (یونانی طب) کی حیثیت سے جوائن کیا۔ وہیں نومبر 1974 میں اسسٹنٹ ریسرچ آفیسر کے طور پر ترقی ہوئی۔ پھر کونسل کے ہیڈ کوارٹر آفس نئی دہلی میں ریسرچ آفیسر (یونانی طب) کی حیثیت سے منتخب کرلیا گیا اور 7 مارچ 1975 کو وہاں جوائن کیا۔ سنٹرل کونسل فار ریسرچ ان

کونسل میں مختلف انتظامی امور کی انجام دہی کے ساتھ، فارسی و عربی طبی کتب کے ترجموں، تدوین و ترتیب اور اشاعت کے کاموں سے وابستگی رہی۔ کونسل سے سہ ماہی شائع ہونے والے رسالے 'جہان طب' کے ادارتی بورڈ میں شامل رہے اور ریٹائر ہونے کے بعد اس کے ادارتی بورڈ میں رہے۔ کونسل سے شائع ہونے والے دو ماہی سی سی آر یو ایم نیوز لیٹر کی باقاعدہ اشاعت کے لیے بہت کام کیا۔ کونسل سے ریٹائر ہونے کے بعد بھی مختلف سمیناروں اور لکھنے پڑھنے کے کاموں سے وابستگی رہی۔

انڈین میڈیسن اینڈ ہومیوپیتھی 79-1978 میں حکومت ہند کے ایک پالیسی فیصلے کے تحت دیسی طبوں کی تحقیق کے لیے چار الگ الگ کونسلوں میں تقسیم ہوگئی جن میں سے ایک "سنٹرل کونسل فار ریسرچ ان یونانی میڈیسن" (CCRUM) تھی جس سے یہ وابستہ رہے۔ جون 1983 میں اسسٹنٹ ڈائرکٹر (یونانی طب) کی پوسٹ پر ترقی ہوئی اور جنوری 2000 میں ڈپٹی ڈائرکٹر کی پوسٹ سے رضا کارانہ طور پر قبل از وقت ریٹائرمنٹ لے لیا۔

کونسل کی مدت ملازمت کے دوران ریجنل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن (RRIUM) بھدرک (اڑیسہ) ریجنل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن پٹنہ (بہار) اور ریجنل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن لکھنؤ (اترپردیش) نہ صرف قائم کیے بلکہ ان کے انچارج کی حیثیت سے بھی کافی عرصے تک کام کیا۔ 1986 میں لکھنؤ، پٹنہ، علی گڑھ اور حیدرآباد میں قائم لٹریری ریسرچ یونٹس کو مدغم کرکے جامعہ ہمدرد نئی دہلی میں ایک لٹریری ریسرچ انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن قائم ہوا تو اس کے انچارج کی حیثیت سے کام کیا جب کہ کونسل کے ہیڈ کوارٹر میں کام کرتے رہے۔ اس طرح یہ دوہری ذمے داری تھی۔

اس دور میں کونسل کے تحت ہندوستان کے مختلف شہروں میں قائم یونٹوں اور انسٹی ٹیوٹس سے رابطہ رہا۔ ان کی ترقی کے لیے کام انجام دیے، میٹنگ، سمینار، سمپوزیم، کانفرنس وغیرہ کے لیے مقالات بھی پیش کیے اور اس طرح طب یونانی کی تحقیق میں ترقی کی راہ میں شریک رہے۔ ہندوستان کے مختلف شہروں دہلی، ممبئی، کولکاتہ، پٹنہ، لکھنؤ وغیرہ میں منعقد ہونے والے کونسل کے سمیناروں میں شریک ہوتے رہے۔ آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس کے اجلاس، منعقدہ، کولکاتہ، حیدرآباد، برہان پور، دہلی وغیرہ کی سائنسی نشستوں میں بہ حیثیت مندوب و مقالہ نگار شرکت کی۔ آل انڈیا پرشین ٹیچرس ایسوسی ایشن کے مختلف سالانہ سمیناروں منعقدہ علی گڑھ، ممبئی، شانتی نکیتن، (مغربی بنگال)، ناگپور، حیدرآباد، بیجاپور، مرشدآباد (مغربی بنگال)، وغیرہ میں فارسی زبان سے متعلق طبی مقالات پیش کیے۔ اکتوبر 1992 میں تہران اسلامی جمہوریہ ایران میں تاریخ طب در ایران و اسلام، موضوع پر منعقدہ بین الاقوامی سمینار میں وہاں کی دعوت پر شرکت کی اور مقالہ پیش کیا۔

کونسل میں مختلف انتظامی امور کی انجام دہی کے ساتھ، فارسی و عربی طبی کتب کے ترجموں، تدوین و ترتیب اور اشاعت کے کاموں سے وابستگی رہی۔ کونسل سے سہ ماہی شائع ہونے والے رسالے 'جہان طب' کے ادارتی بورڈ میں شامل رہے اور ریٹائر ہونے کے بعد اس کے ادارتی بورڈ میں رہے۔ کونسل سے شائع ہونے والے دو ماہی سی سی آر یو ایم نیوز لیٹر کی باقاعدہ اشاعت کے لیے بہت کام کیا۔ کونسل سے ریٹائر ہونے کے بعد بھی مختلف سمیناروں اور لکھنے پڑھنے کے کاموں سے وابستگی رہی۔ دہلی کالج (اب ذاکر حسین کالج) ایوننگ، دہلی یونیورسٹی کی اردو میگزین 'شمع حیات' کے بانی ایڈیٹر رہے۔ انسٹی ٹیوٹ آف پوسٹ گریجویٹ اسٹڈیز (ایوننگ) دہلی یونیورسٹی کی میگزین 'ایونٹائڈ' کے فارسی سیکشن کے مدیر تھے۔ مختلف رسائل میں طبی و ادبی مضامین (اور کبھی کبھی غزلیں وغیرہ) بھی شائع ہوئیں۔

الحمدللہ 2001 میں ان کو حج بیت اللہ کی سعادت

حکیم صاحب کا پہلا شعری مجموعہ 'شام غم' کے نام سے 1968 میں مجلس اشاعت ادب دہلی کے زیر اہتمام اس کے بعد 1986 میں 'درد کا صحرا' فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی کے مالی اشتراک سے نظامی پریس سے شائع ہوا جس کو انہوں نے اپنی دختر کلاں فریدہ ریشمی کے نام انتساب کیا تھا۔

حاصل ہوئی۔ عمرہ اور زیارت کا شرف کئی بار حاصل ہوا۔ ان کے پردادا مرحوم سید عجائب علی ابن سید خادم علی کربلائے معلی (عراق) میں صحن روضۂ امام حسین علیہ السلام میں مدفون ہیں۔

1963 میں شادی ہوگئی تھی۔ اولاد کی نعمت کے طور پر تین لڑکے اور تین لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ ایک صاحب زادے (منجھلے) محمد مختار مہدی جو بی فارما کرکے ڈی ایل ڈبلیو (ڈیزل لوکو) بنارس کے سینٹرل ہاسپٹل میں ملازم ہوگئے تھے۔ ملازم ہونے کے دس ماہ بعد ہی بنارس سے دہلی آئے اور اسٹیشن سے گھر آتے ہوئے ایک ٹرک نے ان کے آٹو پر ٹکر ماری اور اس ایکسیڈنٹ کے نتیجے میں وہ فوراً جاں بحق ہوگئے۔ عمر محض چوبیس سال تھی باقی دو صاحب زادے شادی شدہ برسر کار اور صاحب اولاد ہیں۔ دو لڑکیاں اپنے شوہروں کے ساتھ قطر میں ہیں۔ حکیم صاحب 76 برس کی عمر میں 29 ستمبر 2016 کو دہلی

میں انتقال فرما گئے۔

حکیم صاحب موصوف سے راقم الحروف کے ذاتی مراسم تھے۔ دورانِ تصنیف و تالیف تذکرۂ شعرائے یوپی محترمہ صالحہ عابد حسین سے ملاقات ہوئی اور ڈاکٹر صغرا مہدی صاحبہ نے حکیم میرن کے قطعات اور شاعری پر مبنی مواد فراہم کیا۔ حکیم میرن ڈاکٹر عابد حسین کے برادر نسبتی تھے۔

ادبی خدمات

حکیم صاحب کا پہلا شعری مجموعہ 'شامِ غم' کے نام سے 1968 میں مجلس اشاعت ادب دہلی کے زیر اہتمام اس کے بعد 1986 میں 'درد کا صحرا' فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی کے مالی اشتراک سے نظامی پریس سے شائع ہوا جس کو انھوں نے اپنی دختر کلاں فریدہ ریشمی کے نام انتساب کیا تھا۔

حکیم صاحب نے جب شعر کہنا شروع کیا تو ترقی پسند تحریک کے زیر اثر اردو میں شعری مواد جمع ہو چکا تھا اور یہ فیض و مجاز کا دور تھا۔ مشاعروں میں جگر کے ترنم کا جادو سر چڑھ کر بولتا تھا۔ فراق جدید دور میں کلاسیکی غزل کو نیا روپ دے کر اسے معتبر بنا چکے تھے۔ جوش ابھی پاکستان منتقل نہ ہوئے تھے، سردار جعفری، کیفی اعظمی اور جاں نثار اختر اپنی شناخت کرا چکے تھے۔ جذبی 'ابھی چلتا ہوں ذرا ہوش میں آلوں تو چلوں' سنایا کرتے تھے۔ ان کے وطن نوگنواں سادات میں مشاعرے بھی منعقد ہوا کرتے تھے۔ خاندان میں ان کی نانی خدیجہ الکبریٰ المتخلص بہ ثریا متوفی 1956 جن کی نعت، نوحے، منقبت پر مشتمل ایک بیاض بھی شائع ہوئی تھی لہٰذا ان کو موزونی طبع اور ذوق جمال بھی ایک طرح سے فطرت کا عطیہ تھا جسے ماحول نے آتش شوق کو تیز تر کر دیا اور 1953 سے 1958 تک قیام علی گڑھ یونیورسٹی نے مطالعے کی نئی سمتوں سے آشنا کر دیا۔ 1960 میں لکھنؤ کی ادبی و شعری فضاؤں سے موقع میسر آیا اس کے بعد زندگی کا وسیع میدان سامنے تھا اور تجربات و مشاہدات کی راہیں کھلی ہوئی تھیں۔ 1960 کے بعد کا بیشتر وقت دلی کی ملازمت میں گزرا۔ باقاعدگی سے شعر کبھی نہ کہے اور نہ کبھی شعوری طور پر فکرِ سخن کے لیے وقت نکالا۔ کبھی احباب کی محفلیں تو جمتیں تو اساتذہ کے اچھے اور پسندیدہ اشعار پر گفتگو ہوا کرتی اور کبھی کبھی مختصر ادبی و شعری نشستوں میں شرکت کا موقع ملتا۔ ذاتی واردات و محسوسات نے کبھی کبھی شعر کہلوا دیے اور غزل کی جانب رجحان رہا نظمیں بھی کہیں۔

نمونۂ کلام۔

تری ذات پاک ہے اے خدا تری شان جل جلالہٗ
مرے ذہن و فکر کو دے جلا تری شان جل جلالہٗ
مجھے کو بہ کو یہی آرزو یہی جستجو یہی گفتگو
تری معرفت مجھے ہو عطا تری شان جل جلالہٗ
مری زندگی کو نکھار دے مری عاقبت کو سنوار دے
میں امیدوار ہوں عفو کا تری شان میں جل جلالہٗ

فارسی ادب کی جھلکیاں

یہ معروف فارسی ادیب علی اصغر حکمت جو ہندوستان میں ایران کے سفیر تھے۔ ان کی انگریزی تالیف (Glimpses of Persian Literature) کا اردو ترجمہ ہے جو فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی حکومت یوپی کے مالی تعاون سے زیور طباعت سے آراستہ ہوا تھا۔ یہ سات (7) توسیعی خطبات کا مجموعہ ہے۔ یہ خطبات دسمبر 1954 اور 7 مارچ 1955 کے درمیان دہلی یونیورسٹی کی فیکلٹی آف آرٹ کے زیر اہتمام دیے گئے تھے۔ 1956 میں ایران سوسائٹی کلکتہ نے ان خطبات کو کتابی شکل میں شائع کیا۔ یہ خطبات فارسی زبان و ادب کی تاریخ کے مختلف ادوار کا احاطہ کرتے ہیں اور فاضل خطیب نے ڈھائی ہزار سالہ دبستان کو بڑی خوبی سے اپنے خطبوں میں بیان کیا تھا۔ ان خطبات کا ترجمہ 'فارسی ادب کی جھلکیاں' کے عنوان سے حکیم صاحب کا علمی و ادبی کارنامہ ہے۔ اس میں تاریخ ایران، زبان تعریف اور حدود و قدیم فارسی اور جدید فارسی، نثر قبل از اسلام، اسلامی دور کی نثر، قدیم فارسی شاعری (قبل از اسلام) فارسی شاعری اہمیت۔ پہلوی شاعری، رومانی مثنویاں وغیرہ ابواب تھے۔

جگر لخت لخت: حکیم سید غلام مہدی راز کا یہ طبی و ادبی مضامین کا مجموعہ ہے جو ایک عظیم طبیب کا عظیم کارنامہ ہے۔ یہ مجموعہ حکیم غلام مہدی راز کا آخری علمی، ادبی نیز طبی مضامین کا مجموعہ ہے۔ 2007 میں اردو اکادمی دہلی کے مالی اشتراک سے طبع ہوا جو ہمدرد خلائق حکیم عبدالحمید دہلوی کے نام منسوب ہے۔ مجموعے کا پیش لفظ پدم شری پروفیسر اختر الواسع اور مقدمہ ڈاکٹر خالد محمود صدیقی، ڈاکٹر جنرل سی سی آر یو ایم نے سپرد قلم کیا ہے۔ کتاب کا تعارف پروفیسر صغرا مہدی سابق صدر شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ اور پروفیسر نرگس جہاں صدر شعبۂ فارسی دہلی یونیورسٹی نے لکھا ہے۔ کتاب علمی و ادبی نیز طبی میدان کا بیش بہا ذخیرہ ہے جو اپنے اندر ایک تاریخ رکھتا ہے۔ یہ کتاب طبی تذکرہ نگاروں کے لیے ایک نعمت غیر مترقبہ ہے جس میں ابن القف مسیحی، شیخ الرئیس بو علی ابن سینا بحیثیت شاعر، فلسفی طبیب ابن رشد حکیم محمد اعظم خاں کی ادویہ مفردہ کے موضوع پر بے مثل کتاب حکیم محمد اسماعیل جرجانی اور ان کی طبی تالیف ذخیرہ خوارزم شاہی فارسی زبان میں طب یونانی کو منتقل کرنے والا طبیب حکیم محمد اکبر ارزانی، حکیم تبارک، حکیم تکمیلی، حکیم افتخار الحق تکمیلی، حکیم حماد عثمانی، سابق ڈائرکٹر سی سی آر یو ایم، حکیم محمد عبدالرزاق، قصائد ذوق میں طبی اصطلاحات پر خامہ فرسائی کی ہے۔

حکیم صاحب نے جب شعر کہنا شروع کیا تو ترقی پسند تحریک کے زیراثر اردو میں شعری مواد جمع ہوچکا تھا اور یہ فیض و مجاز کا دور تھا۔ مشاعروں میں جگر کے ترنم کا جادو سر چڑھ کر بولتا تھا۔ فراق جدید دور میں کلاسیکی غزل کو نیا روپ دے کر اسے معتبر بنا چکے تھے۔ جوش ابھی پاکستان منتقل نہ ہوئے تھے، سردار جعفری، کیفی اعظمی اور جاں نثار اختر اپنی شناخت کراچکے تھے۔ جذبی 'ابھی چلتا ہوں ذرا ہوش میں آلوں تو چلوں' سنایا کرتے تھے۔ ان کے وطن نوگنواں سادات میں مشاعرے بھی منعقد ہوا کرتے تھے۔ خاندان میں ان کی نانی خدیجہ الکبریٰ المتخلص بہ ثریا متوفی 1956 جن کی نعت، نوحے، منقبت پر مشتمل ایک بیاض بھی شائع ہوئی تھی لہٰذا ان کو موزونی طبع اور ذوق جمال بھی ایک طرح سے فطرت کا عطیہ تھا جسے ماحول نے آتش شوق کو تیز تر کردیا اور 1953 سے 1958 تک قیام علی گڑھ یونیورسٹی نے مطالعے کی نئی سمتوں سے آشنا کردیا۔

ہشت سخن: پچاس صفحات پر مشتمل ایک کتابچہ اپنے فرزند سید محمد مختار مہدی دوم جن کا ایک سڑک حادثہ میں 20 اکتوبر 1996 کو انتقال ہوا اور ان کے انتقال پر مختلف حضرات نے قطعات، تاثرات، اور نظمیں مرحوم کی یاد میں سپرد قلم کیں ان کو یکجا کر کے حکیم سید غلام مہدی راز نے اپنے تاثرات کے ساتھ 1997 میں شائع کیا تھا جو تاثرات قلبی کی شکل میں پیش ہے۔

راقم السطور کی ناقص نظر اور معلومات میں حکیم سید غلام مہدی راز فی الوقت طبی دنیا کی ایک ایسی ہستی تھی جس کا پورا ہونا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔

■

Dr. HKM S. Habibur Rahman 97/128, Delhi Dawakhana, Talaq Mahal
Kanpur 208001 (UP)

شخصیت

سید طلحہ نقشبندی القادری

اردو ادب و صحافت کا مشہور نام
اختر شیرانی

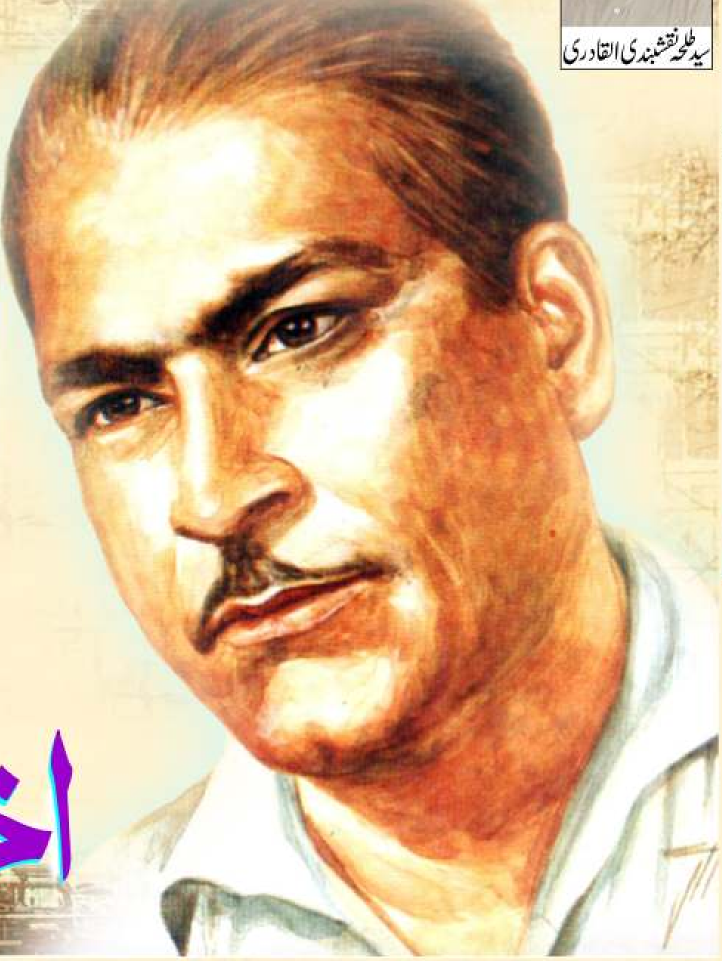

ایک جگہ آغا حشر کاشمیری مرحوم نے یہ شعر کہا تھا:

کہو زاہد سے کیوں ہے اس قدر فردوس میں نازاں
ہزاروں جنتیں آباد ہیں تخیل اختر میں

مذکورہ بالا شعر میں ایک ایسی حقیقت پوشیدہ ہے جس کی وجہ سے یہ شعر خود لافانی بن گیا ہے۔ کون ہے جو تخیل اختر سے منکر ہے۔ اختر سے مراد واجد علی شاہ اختر نہیں بلکہ اردو دنیا وصحافت اردو ادب، شاعر رومان اختر شیرانی ہے۔ جن کی بابت ایک زمانے میں مولانا محمد علی جوہر مرحوم نے ایک جگہ اس طرح تحریر کیا تھا "آپ کی بے مثال نظم سے زیادہ آپ کی بے نظیر نثر نے مجھے متاثر کیا ہے۔" مذکورہ بالا نقل وقول اس خط کا ہی جزو ہے جو رسالہ 'خیالستان' کی زینت بن چکا ہے۔ مولانا ظفر علی خان مرحوم کا یہ مشہور مصرعہ "کوئی نقاش ہو یا کوئی عکاس" ان کے اس فرضی نام کی طرف اشارہ کرتا ہے جس کے پردے میں اختر شیرانی مرحوم مضمون نگاری کرتے تھے۔ 'نقاش' خود مولانا ظفر علی خان مرحوم تھے اور 'عکاس' سے مراد اختر شیرانی مرحوم تھے۔ جو علامہ ابن بطوطہ ایں جہانی" کی آڑ لے کر اردو زبان وادب کی خدمت انجام دیتے رہے۔

یہ ہیں اردو زبان وادب وصحافت کے ایک خادم اور رومانی شاعر اختر شیرانی جو 4 مئی 1905 بمطابق 28 ربیع الاوّل 1323ھ ٹونک ریاست راجستھان میں پیدا ہوئے۔ آپ کا اصلی نام محمد داؤد خان ہے۔ لیکن دنیائے علم وادب وشاعری میں اختر شیرانی کے نام سے معروف ہوئے۔ آپ کے والد ماجد حافظ محمود خان شیرانی مرحوم اردو زبان کے بہت بڑے محقق اور عالم واورینٹل کالج لاہور میں پروفیسر تھے۔ زمانہ طفلی اختر نے آغوش مادر میں گزارے مگر جب ذرا ہوش سنبھالا تو مسلمانوں کے اور بچوں کی طرح انھیں بھی عربی مدرسہ میں داخل کیا گیا۔ 1920 میں نواب ابراہیم علی خان نے ریاست ٹونک کے کچھ لوگوں کو جلاوطن کرنا شروع کر دیا تھا۔ حافظ محمود خان شیرانی بھی اسی زد میں آگئے اور وہ جودھپور کی صحرائی حویلی 'قصرِ صحرا' میں جاکر مقیم ہوئے بعد ازاں اختر شیرانی مع والدہ ماجدہ کے وہاں پہنچے اس طرح تمام تعلیمی سلسلہ ختم ہوگیا۔ حافظ صاحب مرحوم کو اپنے لختِ جگر کی یوں تباہی وبربادی دیکھی نہ گئی اس لیے آپ نے یہ مصمم ارادہ کیا کہ وہ اختر شیرانی کو لاہور لے جاکر اورینٹل کالج لاہور میں تعلیم دلائیں گے۔ چند ماہ کے بعد ہی انھیں لاہور لے گئے اور سب سے پہلے محمود خان مرحوم نے اپنے استاد محترم مولوی محمد دین مختار پروفیسر فارسی اورینٹل کالج لاہور کی خدمت میں اختر شیرانی کو پیش کیا اور بعدہ علامہ اقبال مرحوم، سر عبدالقادر مرحوم، مرزا محمد شفیع دہلوی مرحوم، شیخ عبدالعزیز مرحوم اور شجاع الدین مرحوم سے متعارف کرایا۔

اورینٹل کالج لاہور میں داخل ہوکر اختر شیرانی مرحوم کو اپنی خداداد قابلیت وذہانت دکھانے کا موقع ملا۔ چنانچہ 1921 میں انھوں نے ادیب فاضل کا امتحان پاس کیا۔ مگر اختر شیرانی کے ماحول اور میلان طبع نے انھیں ہائی اسکول کا امتحان بھی پاس کرنے نہیں دیا۔ امتحان سے چند ماہ قبل وہ وہاں سے فرار ہوگئے۔ تعلیم کے زمانے ہی میں آپ

نے چند غزلیں بغرض اصلاح علامہ تاجور مرحوم (ایڈیٹر مخزن) کو دکھائی تھیں۔ اس طرح یہ دونوں ایک دوسرے سے روشناس ہو چکے تھے۔ میاں بشیر احمد جب سوئزرلینڈ جانے لگے تو چند ماہ کے لیے ادبی مجلّہ 'ہمایوں' کی ادارت اختر شیرانی کے سپرد کر گئے۔ کیونکہ اس وقت علامہ تاجور بھی حیدرآباد میں تھے۔ 1925 میں لاہور ہائی کورٹ کے ایک کلرک مولوی غلام رسول مرحوم نے ایک رسالہ نکالا تھا اور اس کا نام 'انتخاب' رکھا تھا۔ اس کی ادارت بھی اختر شیرانی کے ذمے آئی لیکن کچھ ان بن کی بنا پر یہ رسالہ بعد میں جاری نہ رہ سکا۔ بعدہٗ 'بہارستان' عالم وجود میں آیا۔

اس زمانے میں مولانا محمد علی جوہر مرحوم کا 'ہمدرد' شباب پر تھا۔ مولانا مرحوم نے بھی اختر شیرانی کے زورِ قلم اور قوت تحریر کا اندازہ لگا کر اختر مرحوم کو لکھا کہ وہ ہر ہفتے 'ہمدرد' کے لیے کچھ نہ کچھ ضروری لکھا کرے۔ چنانچہ 'نکات و معارف' کے عنوان سے انھوں نے ہمدرد کے لیے کالم لکھے۔ پھر 1928 میں اختر نے اپنا پرچہ 'خیالستان' نکالا مگر یہ کارکنان کی بددیانتی کی نذر ہو گیا۔ 1931 میں 'رومان' کو ادبی اور اردو دنیا سے متعارف کرایا۔ لیکن اس کا بھی 'خیالستان' کا سا حشر ہوا۔ 1941 میں 'شاہکار' کی ادارت آپ نے سنبھالی مگر چند وجوہات کی بنا پر انھیں خود اس سے علاحدہ ہونا پڑا۔

رسائل، مجلّے، نکالنا، مضامین لکھوانا، اور ان کو شائع کرنا بھی زبان و ادب کی ایک زبردست خدمت ہے۔ مگر بعض اصحاب صرف 'تصنیف و تالیف و شعری مجموعوں' کو ہی اردو کی خدمت گردانتے ہیں۔ اگر اس نظریہ سے بھی اختر شیرانی کی ادبی صحافتی خدمات کا جائزہ لیا جائے تب بھی اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی تمام زندگی اردو ادب، اردو کی ترویج و اشاعت کے لیے وقف کر دی۔ 'مجمع سعدین و مجموعہ بحرین' کی تدوین و ترتیب جو خان بہادر مولوی محمد شفیع مرحوم نے کی تھی اختر شیرانی کا اس میں ہاتھ رہا۔ اس کے علاوہ 'جامع اللغات' کی ادارت بھی انھوں نے ہی کی۔ ڈاکٹر علامہ اقبال مرحوم نے جو فارسی نصاب کی کتابیں مرتب فرمائی تھیں ان کی تدوین میں بطور مددگار آپ مرحوم نے کام کیا تھا۔ اختر مرحوم چونکہ فن خطاطی کے ماہر تھے اس وجہ سے علامہ اقبال کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام کو نقل کرنے کی خدمت آپ ہی کے سپرد ہوئی۔ ان تمام مشغلوں کارناموں کے باوجود آپ نے شعر و شاعری اور تصنیف و تالیف، رسائل و مجلوں کی ادارت برابر جاری رکھی۔ اختر شیرانی جانتے تھے کہ ان کی یہ تمام خدمات اکارت نا جائے گی۔ ہم اختر شیرانی کی تصانیف و تالیف و تراجم کی فہرست آپ قارئین کی دلچسپی کے لیے یہاں پیش کر رہے ہیں:

(1) ضحاک: یہ ایک ترکی ڈرامے کا ترجمہ ہے۔ آپ نے یہ ترجمہ نہایت سلیس و بڑے عمدہ طریقے سے کیا ہے۔

اختر شیرانی مرحوم کو نثرنگاری میں جو ملکہ حاصل ہے وہ بتاتے ہیں کہ انہیں اردو کی مختلف اصناف ادب پر مکمل عبور حاصل ہے۔ الفاظ، فقرے، اور جملے ان کے پابند نظر آتے ہیں۔ وہ سادہ و رنگین اور دقیق عبارت بھی تحریر کرتے ہیں۔ اگر ان کی سحرنگاری اور سہل نگاری کے نمونے دیکھنے ہوں تو 'دھڑکتے دل' اور 'آئینہ خانہ' میں آسان اور عام فہم زبان موجود ہے۔ ان کا دوسرا انداز تحریر وہ ہے جس میں فارسی کا غلبہ ہے آمد کم اور تصنع زیادہ ہے۔ عبارت سادہ رنگین ہوگئی ہے۔

(2) پھولوں کے گیت: بچوں کے لیے نظمیں بڑی دلکش و عام بول چال اور بچوں کی سمجھ میں آنے والی تمام نظمیں اس میں موجود ہیں۔

(3) آئینہ خانے میں: پانچ فلمی افسانے جو کہ آپ نے ایک ہی رات میں لکھے تھے۔

(4) نغمہ حرم: خواتین کے لیے نظمیں

(5) صبح بہار: نظموں اور کچھ غزلوں کا مجموعہ۔

(6) اختر ستان: نظموں کا دوسرا مقبول مجموعہ

(7) لالہ طور: نظموں کا تیسرا مجموعہ۔

(8) طیور آوارہ: نظموں اور گیتوں کا شاندار مجموعہ۔

(9) دھڑکتے دل: افسانوں کا مجموعہ

(10) جوامع الحکایات: دو جلدوں میں یہ محمد عوض کی کتاب کا لاجواب ترجمہ اور خلاصہ ہے۔

(11) شہناز: غزلوں اور خواتین کے نظموں کا مجموعہ۔

اختر شیرانی مرحوم کو اردو دنیا و اردو ادب نے ایک نثرنگار اور شاعر کی حیثیت سے پہچانا ہے ایسا بہت کم دیکھنے میں آتا ہے کہ ایک اہل قلم نظم، و نثر و صحافت پر یکساں قدرت و استعداد رکھتا ہو۔ اختر شیرانی مرحوم کو نثرنگاری میں جو ملکہ حاصل ہے وہ بتاتے ہیں کہ انھیں اردو کی مختلف اصناف ادب پر مکمل عبور حاصل ہے۔ الفاظ، فقرے، اور جملے ان کے پابند نظر آتے ہیں۔ وہ سادہ و رنگین اور دقیق عبارت بھی تحریر کرتے ہیں۔ اگر ان کی سحرنگاری اور سہل نگاری کے نمونے دیکھنے ہوں تو 'دھڑکتے دل' اور 'آئینہ خانہ' میں آسان اور عام فہم زبان موجود ہے۔ ان کا دوسرا انداز تحریر وہ ہے جس میں فارسی کا غلبہ ہے آمد کم اور تصنع زیادہ ہے۔ عبارت سادہ رنگین ہوگئی ہے۔ تمثیلات، استعارات اور تشبیہات کا استعمال بھی موجود ہے۔ اس کی مثال ہم یہاں پیش کر رہے ہیں ملاحظہ ہو:

''اکبر اردو کا وہ تنہا شاعر ہے جو ایک ہی وقت میں شاعر بھی تھا اور مصلح قوم بھی بذلہ سنج ظریف بھی تھا اور حکیم اُمت بھی قومی رہنما بھی تھا اور ملک کا ضرور شناس مفکر بھی حالی بھی تھا اور انشا بھی، طنز نگار بھی تھا اور غزل گو بھی۔''

حالی اگر جدید شاعری کے اولین علم بردار تھے تو اکبر جامعیت کے لحاظ سے اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ دونوں کی شاعری کی روح ایک ہے۔ مگر انداز مختلف ہے۔ شراب ایک ہے مگر رنگ و ساغر الگ الگ۔ جس مقصد پر حالی کی نگاہ، غم و یاس میں ڈوبی ہوئی پڑتی ہے۔ اکبر کی فکر ظریف اسے مسکرا کر دیکھنے کی عادی ہے۔ حالی کی طرح بلکہ ان سے بھی کچھ زیادہ متعصب انداز میں اکبر ایک سچا مشرقی تھا اور اس کے بیشتر کارنامے مشرقی اور اسلام کی ہمدردی سے لبریز ہے۔ شاعری کے نقطہ نظر کا جو پھیلاؤ اکبر کے یہاں نظر آتا ہے۔ وہ اب تک بدستور قائم ہے۔ (ماہ نو کراچی، جلد اوّل، شمارہ نو 1949)

اختر شیرانی مرحوم نے بچوں کے لیے انتہائی عام فہم زبان میں نظمیں لکھی ہیں۔ جذبات ضرور جواں شاعر کے ہیں مگر ان میں بچپن اور لڑکپن کی روح ڈالی گئی۔ کلام کی شعریت غیر فطری معلوم ہوتی ہے مگر حقیقت جب بیاں ہوتی ہے تو بچوں کے شاعر اور جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ بچوں کے انداز و جذبات کے حامل ہو کر پیش کر رہے ہیں اور اس میں وہ ایسی موسیقیت اور ایسا ترنم پیدا کر دیتے ہیں کہ بچوں کے دل میں اتر جائے۔ بچے کیا جوان اور بڑے بوڑھے بھی وجد کرنے لگتے ہیں۔ جیسے بچے جھولا دیکھ کر یوں خوش ہو رہے ہیں:

آیا ساون کا مہینہ نظر آیا جھولا
دل کو بھایا مری آنکھوں میں سمایا جھولا

باغ کی بہار دیکھ کر بچے بھی تڑپ اٹھتے ہیں:

باغوں کی بہار کوئی دیکھے
پھولوں کا سنگار کوئی دیکھے
پھولوں میں بسی ہوئی فضا ہے
خوشبو سے لدی ہوئی ہوا ہے

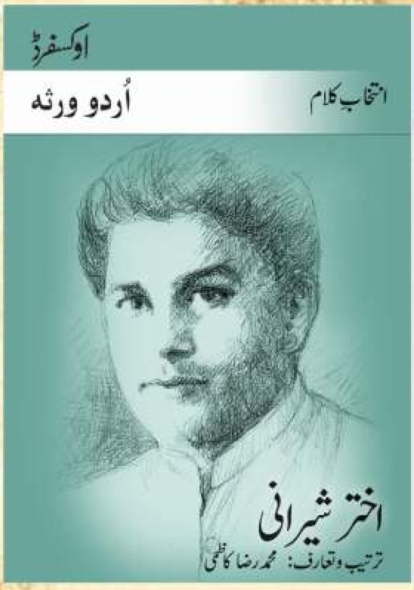

چڑیاں خوش ہے چہک رہی ہے
کلیاں کیسی مہک رہی ہے
باغوں میں بہار آرہی ہے
ہر شئے پر خوشی سی چھارہی ہے

بچوں میں لڑکے اور لڑکیاں دونوں شامل ہوتے ہیں۔ اختر شیرانی لڑکیوں کو نظر انداز نہیں کرسکے:

جہاں اونچے پہاڑوں کی گھٹائیں گھر کے آتی ہیں
ہوا کی گود میں نیلم کی پریاں مسکراتی ہیں
اور اپنے نیلگوں ہونٹوں سے موتی سے لٹاتی ہیں
وہاں میں ہوں میری ہم جولیاں ہوں اور جھولا ہوں

اختر شیرانی مرحوم نے ان سے بھی زیادہ کامیاب نظمیں لکھی ہیں وہ خواتین کے لیے لکھی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کے اردو داں طبقے میں اختر شیرانی کو مردوں سے زیادہ عورتیں جانتی ہیں اور کیوں نہ جانے جو کہ پورا مجموعہ 'نغمہ حرم' ان کے لیے ہی مخصوص کردیا گیا ہے۔ موضوع کے لحاظ سے 'جوگن ماں'، 'جھولا'، 'ساون کی گھٹا'، 'اندھی لڑکی' وغیرہ یہ سب خواتین سے متعلق ہیں۔ ان میں آپ نے عورتوں کے حقوق کی وکالت بھی کی ہے۔ اختر شیرانی نے حسن معصوم سے اپنی عقلی اور حسی جذبات اور احساسات کے چراغ کو روشن کیا و مرئی اور غیر مرئی نقوش جو کبھی مدھم تھے، زیادہ اُجاگر ہوگئے۔ یہ شاعر جذب دل سے مجبور ہوکر یوں پکار اٹھتا ہے:

محبت کے لیے ہوں میں دنیا کی محفل میں
محبت خون بن کے لہلہاتی ہے میرے دل میں
محبت ابتدا میری محبت انتہا میری
محبت سے عبارت ہے، بقا میری فنا میری
محبت آرزو میری محبت جستجو میری
محبت خاموشی میری محبت گفتگو میری

یہ محبت سرشت اختر شیرانی میں موجود ہے۔ مگر اس کا رجحان غیر فطری نہیں ہے۔ وہ 'سلمیٰ' سے محبت کرتا ہے۔ مگر ناکام رہتا ہے۔ پھر بھی یہی کہتا ہے:

محبت ہی میری طاقت محبت ہی جوانی ہے
محبت گر نہ ہو ویران میری زندگانی ہے

اس محبت میں ابتذال کا عنصر بہت کم ہے۔ اس فراریت ابتذال اور یاس وحزن کے باوجود حقائق روزگار سے غافل نہیں رہتے:

کسی کا حال دنیا میں کبھی یکساں نہیں رہتا
جہاں دیکھو تغیر ہی تغیر کی حکومت ہے
تغیر اصل ہستی ہے تغیر اصل فطرت ہے
تغیر ہو نہ جس انساں میں وہ انساں نہیں رہتا

جہاں تک انداز بیان اور طرزِ شاعرانہ کا تعلق ہے انھیں زبان پر قدرت حاصل ہے۔ اختر شیرانی لکھتے ہیں:

شبستان جوانی کا تو ایک زندہ ستارہ ہے
تو اس دنیا میں بحرِ حسن فطرت کا کنارہ ہے

سلمیٰ دل کشی اور جاذبیت اختر شیرانی مرحوم کے کلام کا جزو اعظم ہے مگر یہاں تلمیحات سے کام لیا ہے۔ کلام سرتاپا دلچسپ ہوگیا ہے۔ ایجاز کم تفصیل زیادہ رکھی ہے۔ عامیانہ روش سے بھی گریز کرنے کی کاوش کی ہے:

میں فضائے عرش کا ٹوٹا ہوا سیارہ تھی
جلوہ ہائے نو بہ نو میں مائل نظارہ تھی
ذوق موسیٰ بن کے تھی خود حیرتی جلوہ میں
خود ہی محو نور بن کر طور پر آوارہ تھی
آتش نمرود تھی جب آسمان تک شعلہ زن
خلد بن کر تب میں ابراہیم کا گہوارہ تھی
دیدۂ یعقوب میں تھی جلوۂ امید میں
نوح کی کشتی میں حسن چارا بے چارہ تھی
شکل یوسف میں برنگ حسن جانا نہ تھی میں
سینۂ عیسیٰ میں قم کا ساز مستانہ تھی میں

اختر شیرانی مرحوم کی آخری ایام میں لکھی گئی یہ غزل پڑھیے اور اس کی زمین اور کلام کی بلندی وتشبیہات کا مطالعہ کیجیے:

تمھیں ستاروں نے بے اختیار دیکھا ہے
شریر چاند نے بھی بار بار دیکھا ہے
بہار صبح کی رنگینیوں میں کھوئے ہوئے
نسیم نے تمھیں مستانہ وار دیکھا ہے
سنہری دھوپ کی کرنوں نے بام پر تم کو
بکھیرے گیسوئے مشکیں بہار دیکھا ہے
سنہرے پانی میں چاندی سے پاؤں لٹکائے
شفق نے تم کو سرِ جوئبار دیکھا ہے
ہمیشہ رات کو محو مطالعہ تم کو
نگاہ شمع نے پروانہ وار دیکھا ہے
کسی خیال میں کھوئے ہوئے ہمیشہ تمھیں
سحر نے محو گل و شاخسار دیکھا ہے
بہشتِ حسن کی تازہ کلی کے دھوکے میں
کلی نے بھی تمھیں دیوانہ وار دیکھا ہے
نسیم باغ نے زیب النسا سمجھ کے کبھی
تمھیں یہ گل کدۂ شالا مار دیکھا ہے
مگر مری نگہ شوق کو شکایت ہے
کہ اس نے تم کو فقط ایک بار دیکھا ہے

اختر شیرانی مرحوم ایک رومانی شاعر تھے۔ جدید اردو ادب میں ان کی اہمیت اور خدمات مسلم ہیں۔ 43 سال کی عمر پائی۔ لاہور میں 1948 میں رحلت پائی:

کسی مغرور کے آگے ہمارا سر نہیں جھکتا
فقیری میں بھی اختر غیرت شاہانہ رکھتے ہیں

نوٹ: راقم نے اس تحقیقی مضمون کو تحریر کرنے کے لیے حسب ذیل کتب سے استفادہ کیا ہے:

(1) اختر شیرانی انتخاب کلام، مرتب: آل احمد سرور مرحوم
(2) ماہ نو کراچی، جلد نمبر 1، شمارہ نمبر 9، 1949
(3) مجلّہ شاہکار، لاہور 1935

Syed Talha Naqshbandi Al-Qadri
Khankah-e-Naqshbandia, Balapur, Distt Akola - 444302 (MS)

حسن نواب حسن

نامور شاعر سریر کابری

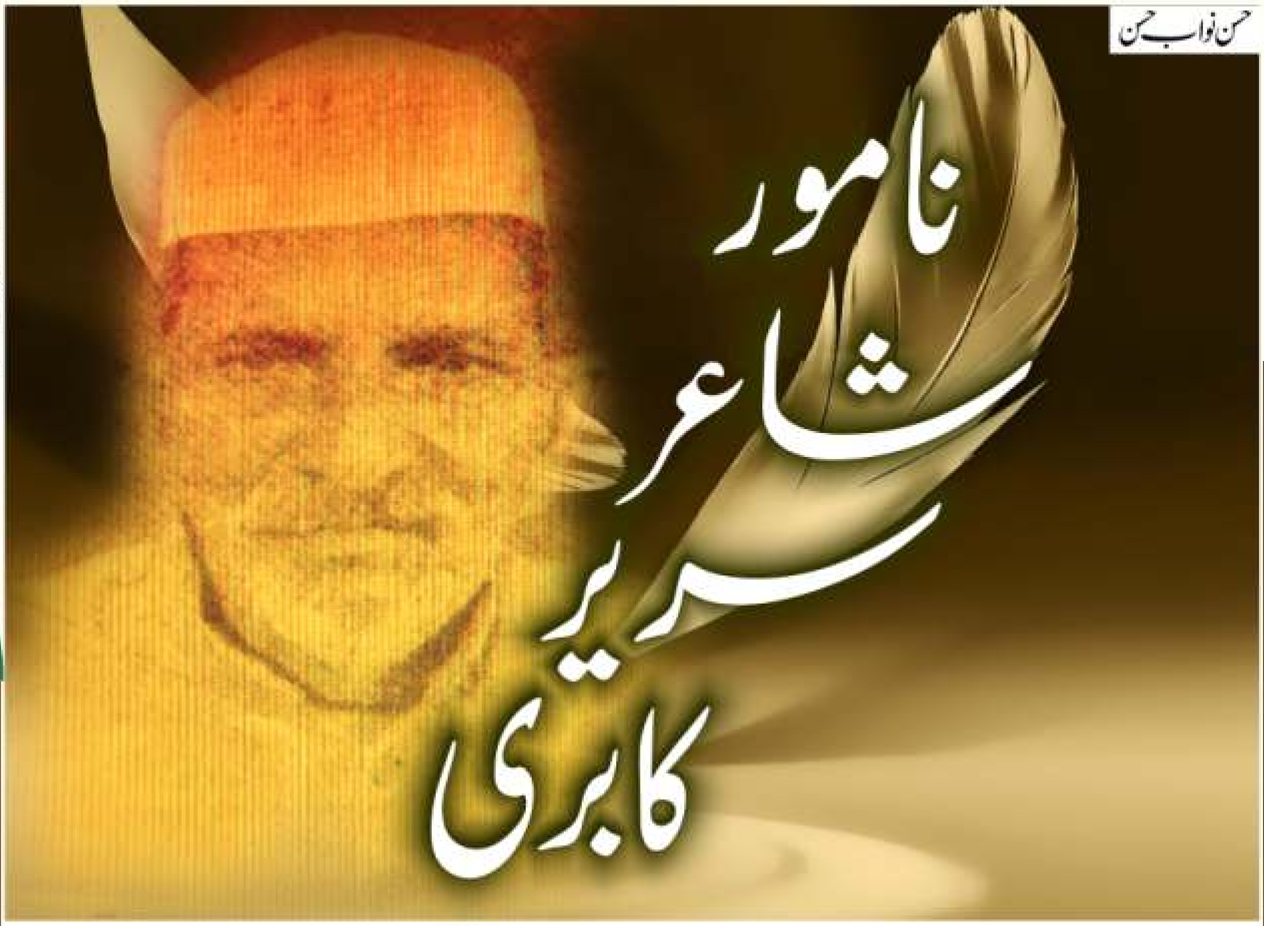

شاہنامہ ہند' اور خیابان سخن جیسے شعری مجموعے کے تخلیق کار ہیں سید منظور علی عرف سریر کابری۔ پرانے گیا ضلع کی تحصیل رفیع گنج موجودہ موضع کابر ضلع اورنگ باد جائے پیدائش (1963-1887) ہے۔ درس وتدریس کے سلسلے میں مستقل سکونت گیا شہر میں رہی۔ ان کا شمار باکمال استاد شاعروں میں ہوتا تھا۔ ان کے شاگردوں کی فہرست بھی طویل تھی۔ مگر مشہور شاعروں میں مختار احمد عاصی، ادیب حسن ادیب وغیرہ نے اردو شاعری میں اچھا مقام حاصل کیا۔ راقم کو بھی کالج کے زمانے میں ان کی صحبت کا شرف حاصل رہا۔ دراصل میرے باقاعدہ استاد مظفر حسین ضبط کاظمی کی جائے پیدائش بھی موضع کابر موجودہ اورنگ باد ہے۔ مظفر حسین ضبط کاظمی مرحوم مدرسہ سلیمانیہ (قدیم مدرسہ پٹنہ سٹی سے فارغ تھے۔ ان کی علمی لیاقت سے میرے والد صاحب مرحوم واقف تھے۔ لہٰذا مستقل طور پر مجھے اور دیگر بھائی بہنوں کی ابتدائی تعلیم (الف ب سے لے کر) اور آگے کے لیے بھی ان کی سہولت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اپنے مکان کا باہری کمرہ مستقل طور پر دے رکھا تھا۔ ان کی شاگردی میں اسکول کی ابتدائی تعلیم کے علاوہ فارسی اردو کی تعلیم ناچیز اور دیگر بھائی بہنوں نے حاصل کی۔ وہ شاعری میں اچھی مہارت رکھتے تھے۔ ان کے صرف ایک شعر سے قارئین ان کے معیار کا اندازہ کر سکتے ہیں ملاحظہ ہو"کسی سے ذکر نہ کرنا مرے فسانے کا۔ ابھی مذاق بہت پست ہے زمانے کا" میرا موضوع اس وقت سریر کابری کی شاعری ہے۔ میں جس قدر اپنے استاد موصوف سے متاثر رہا اس سے کہیں زیادہ جناب سریر کابری کی شاعری نے مجھے متاثر کیا۔ ملازمت سے سبکدوشی کے بعد موصوف سریر صاحب مرحوم کا یہ معمول تھا کہ گیا کے مشہور بازار چھتہ مسجد روڈ پر جناب ادریس سنسہاروی مدیر 'سہیل' کے ایڈیٹر کے نسبتی بھائی معین الدین مرحوم کی کتاب کی دوکان 'کتاب منزل' کے نام سے مشہور تھی اس دکان کی چوڑائی کے برابر لب سڑک ایک پختہ چبوترے پر دری کا فرش بچھا ہوتا تھا اسی چبوترے پر کتاب کے شوقین کتابوں اور رسالوں کا معائنہ کر کے کتابیں خریدا کرتے تھے۔ وہیں پر کچھ ادبی محترم ہستیاں جن میں سریر صاحب بھی شامل تھے عموماً نماز عصر اور مغرب کے درمیان وہاں تشریف رکھتے تھے ان کے چاہنے والوں اور شاگردوں کو بھی ان سے ملنے کا وقت اور مقام معلوم تھا چنانچہ عموماً ایک چھوٹی موٹی ادبی بیٹھک سریر صاحب کے طفیل میں ہو جایا کرتی تھی۔

کسی شاعر کے یا اپنے ہی کسی شعر میں مجھے کوئی فنی غلطی کا شبہ ہوتا تو میں سریر صاحب سے رجوع کر کے اسے دور کر لیا کرتا تھا۔ ان کے حافظے کا یہ عالم تھا کہ اگر میں ان کو کوئی ایک شعر سناتا تو وہ اسی سے متعلق کئی اشعار بے جھجک سنا دیتے تھے۔ مذکورہ کتاب کی دکان کے ٹھیک سامنے گیا کے ایک مشہور حکیم ظہیر صاحب کا مطب تھا۔ شام کو کچھ دیر خوش گپی کے خیال سے حکیم صاحب کے مطب کی بیٹھک میں میرے علاوہ کئی مقامی ادبی ہستیاں ذوق تسکین کے لیے شامل ہوتیں۔ ان میں قابل ذکر ہستیاں شاہ لال قادری مرحوم، قیوم اثر، معین شاہد، قیوم خضر، شاغل قادری، طیب عثمانی، حافظ مسعود کے علاوہ بھی تھیں۔ ریلوے ملازم منیر واحدی مشہور شاعر اور دو ایک ریلوے کے گارڈ مثلاً عالم صاحب اور ایک بنگالی مسلمان جن کا عرف کھوکھا تھا پُر مذاق اور دلچسپ گفتگو کرنے والے آدمی تھے۔ اس سبھوں میں سب سے بزرگ ایک حامد بھائی مرحوم بھی تھے۔ گویا اس غیر رسمی ادبی کلب کے ہم لوگ بنا فیس کے ممبر تھے۔ اور تقریباً سبھی شرکا کو روزانہ حکیم ظہیر صاحب کے بیٹے حکیم سعد اللہ صاحب کی جانب سے ایک کپ چائے مطب کے پچھم جانب سامنے کے ہوٹل سے صرف

ہاتھ کے اشارے سے مفت مل جایا کرتی تھی۔ لیکن جناب سریر کابری مرحوم کی روزانہ بیٹھک 'کتاب منزل' کے چبوترے پر ہوا کرتی تھی جہاں عموماً سریر صاحب کے عقیدت مندان اور شاگردان آ کر شریک ہوا کرتے۔ ایک قابل ذکر بات یہ بھی ہے کہ مذکورہ حکیم صاحب کے مطب کی بالائی منزل پر ایک بڑا کمرہ جسے چھوٹا ہال بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس میں کبھی کبھی جناب ادریس سنبھاروی صاحب مرحوم (ایڈیٹر سہیل) کے والد جناب بسمل سنبھاروی مرحوم جو ایک کہنہ مشق شاعر تھے، کبھی کبھی اسی کمرے میں طرحی غزلوں کا مشاعرہ منعقد کیا کرتے تھے۔ چونکہ کتاب منزل والی دوکان جہاں سریر صاحب موجود ہوا کرتے تھے۔ ان کے شاگرد مصرع طرح لے کر کچھ بعد دیگرے ان سے غزلیں لکھوا کر سامنے ہی حکیم صاحب کے مطب کے اوپر والے کمرہ میں بھی نشست میں شریک ہو کر غزلیں سناتے تھے اور دیگر شعرا کے مقابلے میں بازی مارلے جاتے تھے۔ جب میری باری غزل سنانے کی ہوتی تو میں صاف صاف اعلانیہ کہہ دیا کرتا تھا کہ جو کچھ مرے پاس اشعار ہیں وہ سو فیصد خالص میرے ہی ہیں اور اس میں کوئی ملاوٹ نہیں میرا اشارہ وہ لوگ سمجھ جایا کرتے تھے اور قہقہہ بھی لگاتے تھے۔ ایک دن کا واقعہ ہے کہ اتفاقاً سریر صاحب رکشے پر میرے گھر کے باہری برآمدے کے سامنے سے گزر رہے تھے میری نظر جیسے ہی ان پر پڑی میں نے دوڑ کر سڑک پر ان کے رکشے والے کو رکنے کا

اشارہ کیا اور مودبانہ سلام کر کے ان سے گذارش کی کہ کم از کم دو منٹ اندر چل کر تشریف رکھیں اور ایک کپ چائے پینے کی زحمت گوارا کریں۔ سریر صاحب نے بڑے شفقت آمیز لہجے میں شکریہ ادا کرتے ہوئے جواب دیا کہ میں تقریباً ہر جمعرات کو اسی راستے سے عصر کے بعد اور مغرب سے پہلے قبرستان اپنے کچھ اعزہ مرحومین کی قبر پر فاتحہ پڑھنے اور کربلا میں شبیہ روضہ امام حسین پر حاضری دینے جایا کرتا ہوں۔ چونکہ قبرستان وہاں سے بہت قریب تھا تو اُدھر سے واپسی میں اُن سے گذارش کی کہ میں آپ کا منتظر رہوں گا کہ آپ ضرور غریب خانے پر تشریف لائیں چنانچہ میرے بہت اصرار پر سریر صاحب کو وعدہ کرنا ہی پڑا اتنی دیر میں جب تک وہ اُدھر سے لوٹ کر آتے مجھے کچھ پر تکلف ناشتے کے انتظام کا موقع مل گیا۔ کتاب کی دکان پر بھی میں نے غور کیا تھا وہ اکثر سوکھی بالائی چائے والے بسکٹ کے ساتھ بڑے شوق سے کھایا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ سرائے محلّہ کے موسیٰ حلوائی کی امرتی ان دنوں پورے شہر میں مشہور تھی تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد سریر صاحب کا رکشہ مرے گھر کے سامنے رکا۔ میں پہلے سے منتظر تھا تو دوڑ کر ان کو رکشہ سے اترنے میں سہارا دیتے ہوئے گرم جوشی سے مصافحہ کیا اور مکان کے باہری حصے والے کمرے میں جہاں پہلے سے ٹیبل پر ناشتہ سجا ہوا تھا وہیں کرسی پر ان کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ان کے چہرے سے خوشی اور مسرت کا اظہار نمایاں تھا کہ میں نے اتنے کم وقت میں ان کی پسند کی مرغوب چیزیں کیسے اکٹھا کر دیں۔ جب وہ ناشتہ کر رہے تھے تو اسی کمرے میں ایک

چوکی پر کچھ سفید کپڑوں کے ٹکڑوں پر نظر پڑی جس پر میں نے پنسل سے اپنی آپا کی فرمائش پر تکیہ کے لیے کچھ اشعار لکھ ڈالے تھے جو پرانے طرز کے گھسے پٹے اشعار تھے، جو مجھے بھی پسند نہیں تھے۔ مگر آپا کی ضد نے مجھے مجبور کر دیا۔ سریر صاحب کی جیسے ہی نظر پڑی تو انھوں نے بھی اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ میں نے ان کی حمایت کرتے ہوئے کہا کہ آج کل تکیہ کے لحاظ سے مناسب برمحل اشعار ملتے ہی نہیں تو کیا لکھا جائے۔ اتنے میں آپا (بڑی بہن) چائے کی ٹرے لے کر اندر داخل ہوئیں اور ٹیبل پر رکھ کر سریر صاحب کو سلام کرتے ہوئے واپس اندر چلی گئیں۔ میں نے اتنی دیر میں سریر صاحب سے فرمائش کی کہ تکیہ کے مناسبت سے کچھ آپ ہی عنایت کر دیں تو کیا ہی اچھا رہے گا۔ سریر صاحب تھوڑی دیر کے لیے سوچ میں پڑ گئے اور پھر مجھ کو قلم اُٹھا کر لکھنے کی ہدایت کی:

یوں تو آتی ہی نہیں لیکن جب آ جاتی ہے نیند
کیا کہوں کیا کیا نہ بند آنکھوں سے دکھلاتی ہے نیند
جب نہیں آتی تو فرشِ گل پہ بھی آتی نہیں
اور آتی ہے تو انگاروں پہ بھی آتی ہے نیند
ہم سناتے ہیں تمھیں کو داستانِ دردِ دل
تم یہ کہتے ہو کہ رہنے دو ہمیں آتی ہے نیند

میری تو خوشی سے باچھیں کھل گئیں اس قدر برجستہ برمحل اور رنگِ تغزل سے بھرپور اشعار دو منٹوں میں انھوں نے مجھے عنایت کر دیے۔ میں ان کا شکریہ ادا کرتا رہا۔ ان کو رخصت کرتے ہوئے مجھ پر یہ احساس طاری رہا کہ میں ان کے شایانِ شان تواضع نہ کرسکا۔ اب آپ کو اس سے بھی دلچسپ اور ناقابل فراموش ادبی حکایت سنانا چاہتا ہوں۔ جس کا چرچا ان کے زمانے میں تمام محبانِ اردو اور اربابِ ادب کے حلقے میں برسوں ہوتا رہا۔ آج بھی اُس دور کے دو چار بزرگ بقیدِ حیات ہوں گے تو اس واقعہ کو پڑھ کر زیادہ محظوظ ہوں گے۔ میں نے اپنے والد صاحب کی ڈائری میں سے بھی اشعار اتارے تھے۔ کافی دنوں تک اپنے احباب کو سناتے بھی رہے۔ ایسے واقعہ کو قلم بند کرنا بھی میں ضروری سمجھتا ہوں۔ یہ آزادیِ ہند کے قبل کا زمانہ تھا۔ ان دنوں جگر مرادآبادی، فراق گورکھپوری، ملک زادہ منظور، مجنوں گورکھپوری، اور حسرت جے پوری، مجروح سلطان پوری وغیرہ مشاعروں کی جان ہوا کرتے تھے۔ اور ان لوگوں کی سارے ملک میں بڑی دھوم مچی ہوئی تھی۔ چنانچہ گیا کے ادبی حلقوں میں جو لوگ اچھے سرکاری عہدوں پر فائز تھے، گیا کی کچہری کے علاوہ دیگر سرکاری دفاتر سے منسلک تھے۔ ان میں سے کئی باذوق

میری تو خوشی سے باچھیں کھل گئیں اس قدر برجستہ برمحل اور رنگِ تغزل سے بھرپور اشعار دو منٹوں میں انھوں نے مجھے عنایت کر دیے۔ میں ان کا شکریہ ادا کرتا رہا۔ ان کو رخصت کرتے ہوئے مجھ پر یہ احساس طاری رہا کہ میں ان کے شایانِ شان تواضع نہ کرسکا۔ اب آپ کو اس سے بھی دلچسپ اور ناقابل فراموش ادبی حکایت سنانا چاہتا ہوں۔ جس کا چرچا ان کے زمانے میں تمام محبانِ اردو اور اربابِ ادب کے حلقے میں برسوں ہوتا رہا۔

حضرات نے ایک میٹنگ بلا کر یہ فیصلہ کیا کہ گیا میں ایک لمبے عرصے سے کوئی بڑے مشاعرے کا انعقاد نہیں ہوا ہے۔ لہٰذا ایک بہت ہی شاندار اور یادگار مشاعرے کا اہتمام ہونا چاہیے جسے آنے والی صدی میں بھی لوگ یاد کرتے رہیں۔ چنانچہ اعلیٰ پیمانے پر بڑے بڑے افسران، رئیسوں اور تجارت پیشہ لوگوں سے بھی موٹی رقم بطور چندہ وصول کی گئی۔ گیا شہر کا ریلوے سنیما ہال جو ان دنوں اتفاق سے خالی پڑا تھا کرایہ پر بک کرایا گیا۔ بڑے بڑے شاعروں کے نام سے اشتہار چھپوا کر تمام شہروں میں تقسیم کیے گئے۔ جن میں صرف غیر مقامی شاعروں کے نام تھے۔ اور بہت کم تعداد میں مقامی شعرا مدعو کیے گئے تھے جن میں سریر کابری بھی شامل کیے گئے تھے۔ چنانچہ امید کے مطابق ویسا ہی ہوا بڑے بڑے شاعروں کے نام پر بے پناہ بھیڑ جمع ہو گئی اور سنیما ہال دیکھتے دیکھتے چند لمحوں میں کھچا کھچ بھر گیا۔ دستور کے مطابق چند مقامی شعرا کو ابتدا ہی میں پڑھنے کے لیے بلایا گیا۔ لیکن مجمع کسی مقامی شعرا کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ ہر طرف سے شور اٹھنے لگا جگر کو بلایئے، مجروح کو بلایئے اور فلاں فلاں ،غرض کہ کسی طرح بھی ناظم مشاعرہ نے سمجھا بجھا کر دو تین مقامی شعرا کو بردا
شت کرنے کے لیے آمادہ کیا مگر کوئی شاعر اپنی مکمل غزل نہیں سنا سکا۔ یہاں تک کہ غیر مقامی شاعروں میں بھی جو ترنم سے نہیں پڑھ سکے انھیں بھی حاضرین کی ہوٹنگ سنی پڑی۔ جلسے کی صدارت جگر مرادآبادی کر رہے تھے۔ چنانچہ ان کو سب سے آخر میں پڑھوایا گیا۔ کلام شاعر کے اعتبار سے کم مگر ہنگاموں کے اعتبار سے مشاعرہ زیادہ یادگار ثابت ہوا۔ پھر بھی جگر مرادآبادی نے اپنی ایک مشہور غزل نہایت اثر انگیز ترنم سے سنائی جو بہت دنوں تک لوگوں کی زبان پر جاری رہی۔ جس کا مطلع یوں ہے:

اللہ اگر توفیق نہ دے انسان کے بس کا کام نہیں
فیضانِ محبت عام تو ہے عرفانِ محبت عام نہیں

روداد مشاعرہ بہ زبانِ سریر کابری

مشاعرے کے دوسرے ہی دن گیا شہر کے ایک مشہور رئیس جناب مظفر نواب مرحوم جو کسی سبب سے مشاعرے میں شرکت نہ کر سکے تھے انھوں نے اپنے دولت کدے پر مہمان شاعروں کی دعوت رکھی جس میں دو ایک مقامی شاعر سریر کابری کے علاوہ بھی مدعو تھے۔ چنانچہ دستور کے مطابق پہلے مقامی شاعروں میں جب سریر کابری صاحب سے گذارش کی گئی تو انھوں نے نواب صاحب موصوف سے اجازت چاہی کہ میں کل کے مشاعرے کی منظوم روداد سنانا چاہتا ہوں۔ نواب صاحب نے بڑی خوشی سے وہ نظم سنانے کی گذارش کی اور اس طرح سریر کابری نے مشاعرے کی روداد سنانا شروع کی:

کچھ اہل وطن نے چندہ سے اک بزم سخن ترتیب جو دی
کچھ اس میں بہاری شاعر تھے کچھ باہر کے قوال بھی تھے
اسٹیج سے لے کر پھاٹک تک مجمع تھا عدالت والوں کا
کچھ منصف تھے کچھ افسر تھے قانون کے کچھ دلال بھی تھے
اسکول کے ٹڈی دل لڑکے شیطان کا جن سے دل دھڑکے
کچھ بانکے ترچھے کالج کے غنڈوں کے گروگھنٹال بھی تھے
جب شعر بہاری پڑھتا تھا کچھ لوگ بجاتے تھے سیٹی
ہڑتان پہ یو پی والوں کی کچھ وجد بھی تھے کچھ قال بھی تھے
اٹھا جو کوئی مطلع پڑھنے ایک شور اٹھا مقطع پڑھیے
کچھ لوگ بجاتے تھے بغلیں کچھ منہ پر دھرے رومال بھی تھے

اب تو مت پوچھیے نواب صاحب کے بڑے ڈرائنگ روم کے بڑے ہال میں جہاں کافی لوگ مدعو تھے سبھوں کا ہنستے ہنستے برا حال تھا۔ نظم کے کئی اشعار مجھے یاد نہیں اور نہ والد صاحب مرحوم کی ڈائری اس وقت دستیاب ہے۔ مگر آپ مذکورہ اشعار سے ہی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس وقت نواب صاحب کے یہاں کیا ماحول رہا ہوگا۔ بقیہ شاعروں کو بادلِ نخواستہ سنانا پڑا۔ آخر میں جگر مرادآبادی سے اسی غزل کی فرمائش کی گئی جسے گزشتہ شب مشاعرے میں سنا کر مشاعرہ لوٹ لیا تھا:

اللہ اگر توفیق نہ دے انسان کے بس کا کام نہیں
فیضانِ محبت عام تو ہے عرفانِ محبت عام نہیں

بہت دنوں تک گیا کے ادبی حلقوں میں سریر کابری کی نظم روداد مشاعرہ کی یاد تازہ کر کے لوگ محظوظ ہوتے رہے۔ اب ایک دوسرا واقعہ جہاں تک مجھے یاد آتا ہے غالباً 1950 کی دہائی کی درمیانی مدت کی بات ہے۔ گیا کے سب سے بڑے گیا کالج میں وقتاً فوقتاً اچھے مشاعرے بھی شعبہ اردو کے زیر اہتمام منعقد ہوا کرتے تھے۔ ان دنوں پروفیسر شکیل احمد مرحوم صدر شعبہ ہوا کرتے تھے۔ جن کی قیادت میں ایک طرحی مشاعرے کا اہتمام کیا گیا۔ جس میں عالمی شہرت یافتہ دو چار شعرا کرام بھی مقامی شعرا کرام کے ساتھ مدعو کیے گئے اور جناب جگن ناتھ آزاد جیسے عظیم شاعر کو مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے مدعو کیا گیا اور مشاعرے کا مصرع طرح تمام مہمان شاعروں کو دعوت نامہ کے ذریعے بھیج دیا گیا۔ مصرع طرح پورا ذہن میں محفوظ نہیں ہے، مگر قافیہ (یہاں، وہاں، جہاں)، ردیف (رکھ دی) اچھی طرح یاد ہے۔ مشاعرے کے آخر

اس طرح شکوہ کے انداز میں انھوں نے کچھ اور بھی اشعار سنائے تھے جو مصرع طرح کے مطابق تھے۔ آپ اندازہ لگا سکتے ہیں ان اشعار سے جگن ناتھ آزاد کو کس قدر خفت محسوس ہوئی ہوگی۔ پھر بھی وہ یہ اعتراف کرنے سے باز نہیں آئے کہ شہر گیا کی سرزمین بھی کیسی کیسی عظیم ہستیوں سے آباد ہے اور انھوں نے مشاعرے کے اختتام پہ سریر صاحب کو گلے لگا لیا۔

میں جب جگن ناتھ صاحب سے گزارش کرنے کی باری آئی تو مصرع طرح پر لکھنے کی معذرت چاہتے ہوئے انھوں نے اپنے لمبے سفر کا عذر پیش کیا اور بنارس ہندو یونیورسٹی میں دو دن قبل جو نظم تقسیم ہند انھوں نے لکھی تھی اسے سنانے کی اجازت چاہی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ نظم ان کی بہت ہٹ ثابت ہوئی اور پورے مجمع سے انھوں نے داد و تحسین حاصل کی۔ دستور کے مطابق دو چار خاص مہمان شاعروں سے دوبارہ سنانے کی فرمائش کی گئی۔ جس میں سریر صاحب قبل ہی اپنی طرحی غزل سنا کر داد و تحسین حاصل کر چکے تھے، انھوں نے دوبارہ اسی مصرع طرح میں جگن ناتھ آزاد کو مخاطب کرتے ہوئے حسب ذیل اشعار سنائے:

جو پرسادی چڑھائی تھی وہاں کاشی کے مندر میں
وہی پس خوردہ وشنو پد کے چرنوں میں یہاں رکھ دی
گیا جب پہلی بار آئے نیا کچھ تحفہ لانا تھا
یہ باسی کھیر تم نے لا کے پیش میہماں رکھ دی؟

اس طرح شکوہ کے انداز میں انھوں نے کچھ اور بھی اشعار سنائے تھے جو مصرع طرح کے مطابق تھے۔ آپ اندازہ لگا سکتے ہیں ان اشعار سے جگن ناتھ آزاد کو کس قدر خفت محسوس ہوئی ہوگی۔ پھر بھی وہ یہ اعتراف کرنے سے باز نہیں آئے کہ شہر گیا کی سرزمین بھی کیسی کیسی عظیم ہستیوں سے آباد ہے اور انھوں نے مشاعرے کے اختتام پر سریر صاحب کو گلے لگا لیا۔

■

Hasan Nawab Hasan
H/No- 305, 2nd Floor, Haroon Nagar Sec-2,
Phulwari Sharif
Patna - 801505 (Bihar)

اردو کے اہم ڈراما نگار 1980 کے بعد

قرۃ العین

اردو اصناف ادب میں ڈراما ایک مقبول صنف ہے۔ عالمی سطح پر جس کی تاریخ دو ہزار سال پرانی بتائی جاتی ہے۔ جس میں اس نے کئی ملکوں کا سفر کیا۔ طرح طرح کی زبانوں کا مزہ چکھا۔ رنگ برنگ پردوں اور اسٹیج کے عجیب عجیب مناظر دیکھے۔ سین سینری کی آرائش اور زرق برق لباس کی زیبائش سے گزر کر کتاب اور الفاظ کی قید میں بند ہوا۔ ان دو ہزار سالہ طویل تاریخ میں اُردو ڈراما کی صرف ایک صدی کا ذکر آتا ہے۔

اُردو ادب میں جس وقت ڈرامے کی بنیاد پڑی اس وقت ملک کی فضا سازگار نہ تھی۔ لکھنؤ کا شاہی اسٹیج ہو یا اندر سبھا کا عوامی اسٹیج۔ ڈرامے کو اس کے فنی اقدار پر پرکھ کر اس کی فکری وفنی صلاحیت کا لحاظ کیے بغیر پیش کر دیا گیا۔ یعنی جس اسٹیج پر ڈرامے کی بنیاد رکھی گئی اس کا مقصد صرف اور صرف ناچ اور گانے کی محفل آراستہ کرنا تھا۔ اس لیے پیش کش کی کوئی واضح تکنیک کا سراغ نہیں ملتا۔ ابتدا میں اُردو ڈراما کے عدم فروغ کی ایک وجہ عام طور پر اُردو کے ادیبوں کا شامل نہ ہونا تھا۔ اس لیے کہ وہ اسے اپنی شان کے خلاف سمجھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ آخری دور تک وہ لوگ ڈراما نگاری کو خلاف تہذیب سمجھتے تھے۔ لیکن اب صورتِ حال تبدیل ہو چکی ہے اور اُردو ڈراما ایک مقبول عام صنف کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔

اسّی (80) کے بعد دوسری زبانوں کے مقابلے اُردو میں اسٹیج ڈرامے کم ہیں لیکن ڈرامے کی مقبولیت نے اُردو زبان کو متاثر کیا ہے اور اب اُردو میں ڈرامے اتنے بھی کم نہیں ہیں جتنا کہ سمجھا جاتا ہے۔ اُردو ڈرامے کے ارتقا میں خاص طور پر اسّی کے بعد تھیٹر اور اسٹیج نے اہم کردار ادا کیا۔ تکنیکی سطح پر مشرقی روایت کے ساتھ مغربی تکنیک کو بھی اپنانے کی کوشش کی ہے چنانچہ آج کا تھیٹر مشرق کی تہذیبی روایت سے اپنا تعلق رکھتے ہوئے موجودہ زمانے کے ذہن وفکر سے کافی مطابقت رکھتا ہے، جس کی وجہ سے ہندوستانی ڈرامے کو مزید تقویت ملی اور اس طرح بہت سارے اُردو کے ڈراما نگار سامنے آئے اور اُردو کے متعدد ڈراما گروپ کو بھی پھلنے پھولنے کا موقع ملا۔

1980 کے بعد کا عہد اُردو ڈرامے کی تاریخ کا ایک اہم دور ہے۔ کئی اہم ڈراما نگاروں نے شاہکار ڈرامے لکھے اور کھیلے گئے۔ ان تمام ڈراما نگاروں اور ان کے ڈراموں پر گفتگو کرنا قدرے مشکل تھا لہٰذا چند اہم ڈراما نگاروں اور ان کے ڈراموں کا انتخاب کر کے اس پر مقدور بھر گفتگو کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ تاکہ اس عہد کے ڈراما نگاروں کی ڈراما نگاری پر روشنی پڑ سکے۔

اس ضمن میں محمد حسن کا نام سرفہرست ہے۔ ان کا شمار ایسے ڈراما نگاروں میں ہوتا ہے جو 80 سے قبل اور اس کے بعد بھی ڈرامے لکھتے رہے۔ ان کے ڈراموں میں تنوع ہے۔ ایک طرف انھوں نے تاریخی ڈرامے تحریر کیے ہیں تو دوسری جانب علمی وادبی شخصیتوں پر بھی کئی ڈرامے لکھے۔ علاوہ ازیں حالات کے مطابق سیاسی وسماجی ڈرامے بھی منظر عام پر آئے دراصل ان کے ڈراموں کا بنیادی موضوع باطنی اور بیرونی دنیاؤں کے باہمی رشتے کی تلاش ہے۔ ان کے ڈراموں میں نہ خارج سے دامن بچایا جا سکتا ہے نہ باطن سے۔ ان کے تخلیق کردہ ڈرامے کی ایک طویل فہرست ہے۔ ان میں 'مور پنکھی'، 'داراشکوہ'، 'اکبر اعظم'، 'تماشا اور تماشائی'، 'کہرے کا چاند' اور 'ضحاک' وغیرہ کافی اہم ہے۔ محمد حسن کے ڈراموں میں ضحاک سب سے زیادہ مشہور اور متنازع ڈراما ہے۔ اس ڈرامے کو ان کے فن کا کامیاب ترین نمونہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ ڈرامے میں ایک ظالم اور جابر بادشاہ کی کہانی کو عصری تناظر میں رکھتے ہوئے اسٹیج کے ترسیلی میڈیم کو بڑی ہنرمندی سے استعمال کیا اور اردو ڈرامے کی روایت کو مزید تقویت دی اور علامتی ڈراما نگاروں کے لیے ایک نئی راہ متعین کی۔ محمد حسن نے علمی وادبی شخصیتوں سے متاثر ہو کر 'نظیر اکبرآبادی'، 'میر تقی میر' اور غالب کے حالات زندگی پر بھی ڈرامے لکھے۔

1980 کے بعد اردو ڈراموں کے حوالے سے ساگر سرحدی کا ایک بلند مقام ہے انھوں نے کئی اچھے ڈرامے تحریر کیے۔ ساگر سرحدی کا اسٹیج سے گہرا رشتہ ہے۔ انھوں نے ڈرامے لکھے، ہدایت کاری کی اور فلمی ڈائیلاگ لکھنے کا کام بھی انجام دیا۔ اردو ڈراما نگاری میں سرحدی کا مقام بلند ہونے کی وجہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے مراٹھی، گجراتی، کنڑ، تیلگو، پنجابی اور اڑیہ ڈراموں کو ترجمے کے ذریعے

اردو میں منتقل کیا۔

ساگر سرحدی کے ڈراموں کا مجموعہ 'خیال کی دستک' ہے جس میں چھ ایکانکی ڈراما خیال کی دستک، مسیحا، بھوکے بھجن نہ ہوئے گوپالا، مرزا صاحب، ایک بنگلہ بنے نیارا، کسی سیما کی ایک معمولی سی گھٹنا ہے۔ اس کے علاوہ تنہائی، دوسرا آدمی، گرو، ہندوستان ہمارا، عورت، بھگت سنگھ کی واپسی، انٹرنیشنل کلب، راج دربار، دائرہ، ایک شام گزر گئی، زمانہ، دیش، نگرم، شوالہ، میرے دیس کے گاؤں، احساس کی چبھن، کوئی اکیلا نہیں، اجنبی، ہنگامہ، کفن جیسے ڈرامے بھی ہیں۔ ساگر سرحدی کو تھیٹر کے ساتھ فلم سے بھی لگاؤ تھا ان کی لکھی کامیاب فلموں میں کبھی کبھی، وری، کہونہ پیار ہے، لوری، دیوانہ، سلسلہ، تیرے شہر میں، دوسرا آدمی' چاندنی' ہیں۔

سید محمد مہدی 1980 کے بعد سامنے آنے والے اردو کے ان ڈراما نگاروں میں سے ہیں جنھوں نے باضابطہ طور پر ڈرامے کو اپنے لیے مخصوص کیا اور ڈرامے کی بہت خدمت کی۔ انھوں نے اس فن کے ساتھ پورا انصاف کیا اور کئی اچھے ڈرامے لکھے۔ جن میں 'غالب کون ہے؟' غالب کے اڑیں گے پرزے، منی بائی حجاب، مارے گئے گلفام، اقبال، جان غزل، گاندھی کی لاٹھی اور مرزا غالب وغیرہ ہیں۔ اس کے علاوہ مہدی نے ابراہیم القاضی کے لیے یونانی ڈراموں کو اردو روپ بھی دیا۔

بلقیس پروین بحیثیت شاعرہ و افسانہ نگار کسی تعارف کی محتاج نہیں ہیں۔ انھوں نے اپنے ادبی سفر کا آغاز شاعری سے کیا۔ ان کی غزلوں اور نظموں کے دو مجموعے 'گیلا ایندھن' اور 'شعلوں کے درمیان' ہے۔ اس کے بعد انھوں نے افسانے کی طرف رخ کیا اور کئی افسانے لکھے۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ 'ویران آباد گھروں کے' منظر عام پر آیا۔ اس کے علاوہ دنیا کی دوسری زبانوں کے نمائندہ افسانوں کو اردو میں منتقل کیا۔ بچوں کی تربیت اور اس کی ضرورتوں کا خیال رکھتے ہوئے 'دلچسپ' نام کی ایک کتاب لکھی۔

بلقیس پروین یوں تو ایک شاعرہ اور افسانہ نگار ہیں لیکن ڈرامے سے بھی کافی دلچسپی رکھتی ہیں۔ انھوں نے کئی ڈرامے لکھے۔ علاوہ ازیں بہت سے اچھے غیر ملکی ڈراموں کے ترجمے بھی کیے۔ ان کا ڈراما 'بجھی ہوئی کھڑکیوں میں کوئی چراغ' نہایت اہم ہے۔ اس ڈرامے میں شمالی ہندوستان کے مسلم گھرانے کی تہذیب خاص طور پر آزادی کے بعد کے ہندوستان کا معاشرتی نقشہ پیش کیا گیا ہے۔

تہذیبی اختلاف دکھا کر یکجہتی کا سبق سکھاتا ہے۔ بلقیس نے اپنے فن کے ذریعے سماجی زندگی کے مختلف پہلوؤں مثلاً عورتوں کی کشمکش اور ان کے ذاتی مسائل کے علاوہ غنڈہ گردی و بدحالی، تقسیم وطن کا کرب، انسانی استحصال وغیرہ کو آسان اور سلیس الفاظ میں کردار کی مناسبت سے خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

یوگ راج کا تعلق پیشہ ورانہ طور پر ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے رہا ہے لیکن تھیٹر اور اسٹیج سے بھی لگاؤ اور دلچسپی ہے بلکہ یوں کہا جائے کہ تھیٹر سے ان کو ایک طرح کی فطری مناسبت ہے۔ اس لیے انھوں نے ریڈیو، ٹی۔ وی یا اسٹیج کا جو بھی میڈیم اختیار کیا ان کی کارکردگی لائق تحسین رہی۔

یوگ راج کے اسٹیج ڈراموں کا مجموعہ 'رنگ زندگی کے' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے ریڈیو ڈراموں کا مجموعہ 'آواز کے رنگ' بھی شائع ہو چکا ہے۔ ان کا مجموعہ 'رنگ زندگی' کے پہلے تین ڈرامے، 'بھٹی'، 'آخری رات' اور 'گونگا ساز' قیام بمبئی کے دوران لکھے گئے۔

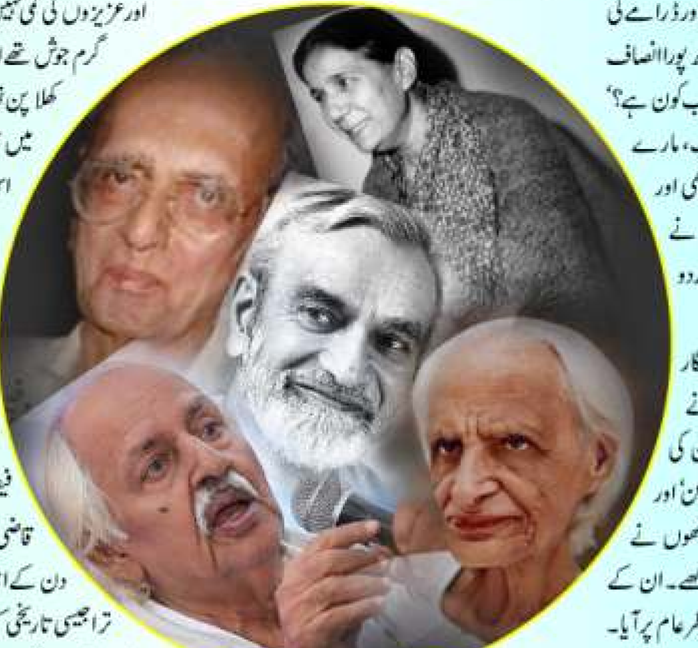

یوگ راج اپنے ڈراموں میں کردار کی زبان سے جو مکالمے ادا کرواتے ہیں ان سے ایک قسم کے کھلے پن کا اظہار ہوتا ہے۔ وہ زندگی کی زبان بولتے ہیں۔ کتابی زبان اور تصنع آمیز اسلوب سے حتی المقدور اپنے آپ کو محفوظ رکھتے ہیں۔ ان کے مکالموں کی ایک خاص خوبی یہ ہے کہ وہ طویل نہیں ہوتے ہیں۔ ان کے ڈراموں کی کہانیوں سے کردار تخیلی اور فرضی نہیں ہوتے بلکہ آس پاس کی زندگی سے ماخوذ ہوتے ہیں۔ یوگ راج کو پرتھوی تھیٹر سے وابستگی کے دنوں میں پرتھوی راج کپور کو بہت قریب سے جاننے اور ملنے کا موقع ملا جس سے متاثر ہو کر انھوں نے ایک کتاب 'تھیٹر کے سرتاج پرتھوی راج' لکھی۔ جو اردو اور ہندی میں شائع ہو چکی ہے۔

جتیندر ناتھ کوشل کی پیدائش 4 فروری 1936 کو سرگودھا پاکستان میں ہوئی اور انتقال 19 اپریل 2004 کو دلی میں ہوا۔ 1962 میں نیشنل اسکول آف ڈراما سے ڈپلوما کیا۔ کوشل اردو زبان بہت اچھی جانتے تھے یہی وجہ ہے کہ NSD کے قیام کے بعد کے دنوں میں اسٹیج ہونے والے کئی غیر ملکی ڈراموں کو اردو میں منتقل کیا۔ وہ نیشنل اسکول آف ڈراما کی کئی کمیٹیوں کے متحرک و سرگرم ممبر تھے۔

جے این کوشل تھیٹر کے کئی شعبوں مثلاً روشنی، موسیقی، ریکارڈنگ، منظر نگاری، اداکاری اور ہدایت کاری میں بہت ہی ماہر تھے۔ ان کے دوستوں، رفیقوں اور عزیزوں کی کمی نہیں تھی۔ وہ آپسی رشتوں میں بڑے گرم جوش تھے ان کی فکر اور سوچ میں ایک طرح کا کھلا پن تھا۔ انھوں نے کئی ڈرامے لکھے جن میں ہم سفر، ایک سوال، آندھیاں، اور اس کے بعد، تاریک راہیں اور وادیاں اور ویرانہ وغیرہ اہم ہیں۔ اس کے علاوہ کئی مقبول غیر ملکی ڈراموں کے اردو اور ہندی میں ترجمے بھی کیے۔ جن میں دی سینڈ، جے بابا گوپی ناتھ، موت کے سائے میں، الہ دین، آفتاب فیض آبادی، نہلے پہ دہلا، کیا کرے گا قاضی، دلیر ماں، بیگم اور باغی، پناہ گاہ، دن کے اندھیرے وغیرہ۔ انھوں نے رنگ یاترا جیسی تاریخی کتاب بھی مرتب کی۔ اس کے علاوہ بادل سرکار اور شیو بٹالوی کے لکھے ڈراموں کی ہدایت کاری بھی کی۔

زیر بحث موضوع کے اعتبار ایک اہم نام شیلا بھاٹیا کا ہے۔ انھوں نے موسیقی، اوپیرا نگاری، تھیٹر فنکاری، ہدایت کاری اور ڈراما نگاری کے میدان میں شاندار کارنامے انجام دیتے ہوئے سیالکوٹ، لاہور، کشمیر اور دلی تک کے سفر کیے۔ اس میں شہرت بھی حاصل کی۔ 1959 میں شیلا نے NSD سے وابستگی اختیار کر لی۔ اسی دوران انھوں نے 49 ڈرامے لکھے اور چھ ڈراموں کی ہدایت کاری کی نیز اداکاری اور موسیقی کے کام بھی انجام دیے۔ ان کے

مقبول ڈراموں کی فہرست کافی طویل ہے۔ ان کی پہلی مقبول پیش کش 'کال آف دی ویلی' (وادی کی گونج) تھی جس کو 1951 میں پیش کیا گیا۔اس کے علاوہ روکھے کھیت (1953)، ہیر رانجھا (1956)، پرتھوی راج چوہان (1963)، چنن بدلاں دا (1966)، قصہ عورت کا ہوا سے بہی تک (1972)، نادر شاہ (1977)، ہاسمین (لورکا کے ڈراما پر مبنی) (1978)، جگنی (1978)، درد آئے گا دبے پاؤں (1980)، یہ عشق نہیں آساں (1981) مانسرور (1981)، شہنشاہ اکبر (1983)، سلگتے دریا (1985)، کاغذ کے کینوس (1985)، تیرے میرے لیکھ۔ لورکا کرت بلڈویڈنگ (1985)، عمر خیام۔جنون راگ ہے (1990)، شبنم (1993)، مقدر (والٹر کی زندگی پر مبنی) (1995)، دھوتی (1977)، میں اور وہ (1999) جیسے مقبول ڈراموں کے علاوہ کئی دوسرے ڈراموں کی بھی ہدایت دی جن میں 'رائی تے پہاڑ (بلونت گارگی 1951) غالب کون ہے (سید محمد مہدی 1971)، جان غزل (سید محمد مہدی 1983)، امیر خسرو (نیاز حیدر 1987)، دروپدی (کمال احمد صدیقی بھارت بھوشن 1983) ہیں۔ اس لحاظ سے ہم دیکھتے ہیں کہ شیلا نے اُردو تھیٹر کو زندہ رکھنے نیز اسے اپنے تھیٹر کے تجربات سے ہم آہنگ کرنے کی کامیاب کوششیں کیں۔

1980 کے بعد اردو ڈرامے کو جن لوگوں نے ایک نیا رخ دیا ان میں جاوید صدیقی کا نام اہم ہے وہ قومی نائب صدر کی حیثیت سے اپٹا سے وابستہ رہے۔ان کا لکھا ہوا 'تمھاری امرتا' سپر ہٹ ڈراما تھا۔ ان کے مقبول ڈرامے آپ کی سونیا، سالگرہ، شیام رنگ، بیگم جان، ہمیشہ، کچے لمحے، اندھے چوہے اور پی کے سیٹھ نے پی کے بولا ہیں۔ان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ان میں غیر معمولی تخلیقی صلاحیت ہے۔ وہ کبھی فلم لکھتے ہیں تو کبھی ڈراما اور کبھی ٹی وی سیریل۔ جاوید صدیقی کے تقریبا 25 ڈرامے مختلف ڈراما گروپس نے اسٹیج کیے ہیں۔ان کا خیال ہے کہ اردو تھیٹر کی ترقی اور اس کی بقاء کے لیے کچھ اہم تبدیلیوں کی ضرورت ہے جیسے ناٹک کو ایسا ہونا چاہیے کہ ہر جگہ آسانی سے اسٹیج کیا جاسکے۔ یہ آسانی اسٹیج میں ہونے والے اخراجات، کم کاسٹ اور ساز و سامان میں شو کرنا شامل ہے۔ بلکہ یوں کہا جائے کہ جاوید صدیقی کم سے کم کاسٹ اور کردار سازی میں فضول خرچی کے بجائے کفایت سے کام لینے کو ترجیح دیتے ہیں۔

جاوید صدیقی نے اردو تھیٹر کو تقریباً دو درجن سے زائد ڈرامے دیے ہیں۔ ان کے تمام ڈرامے کے موضوعات عصر حاضر کے مسائل سے تعلق رکھتے ہیں۔

1980 کے بعد اگر ہم بنگال کے اُردو ڈرامے پر نظر ڈالتے ہیں تو وہ بہت ہی اہم نام اس دور میں نظر آتے ہیں جن کی شناخت

بنگال ہی نہیں بلکہ ہندوستانی سطح پر ہے۔ایک کمال احمد اور دوسرے ظہیر انور۔ کمال احمد نے ڈراموں کی جو فضا تیار کی ہے اس سے ڈرامے کے امکانات کو تقویت ملی ہے۔ ان کے ڈراموں کے کئی مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔انھوں نے بہت ہی مختصر مدت میں چالیس سے زائد ڈرامے تحریر کیے جو کئی مرتبہ اسٹیج کی زینت بھی بنے۔ان کے ڈراموں کے مجموعے 'کشکول'، 'مور کے پاؤں'، 'گرداب'، 'الٹی گنگا'، 'اور ایسا نہیں تھا وہ' ہیں۔ اس کے علاوہ 'پد یاترا'، 'ایک تھا راجا' 'مرض بڑھتا گیا'، 'اور پھر بیاں اپنا'، 'ریلیف'، 'کوئی تعبیر نہیں' وغیرہ ڈرامے ہیں۔

کمال احمد کے ڈاموں کی طاقت اس بات میں پوشیدہ نظر آئی کہ انھوں نے عام فہم انداز میں سیاسی شعور، سماجی حقیقت نگاری اور طنزیہ مکالموں میں اپنی منفرد راہ بنائی ہے۔کمال احمد کی کردار نگاری کی اپنی فنی خوبی ہے۔ ان کے ڈرامے کو پڑھنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ وہ اسٹیج کے فن سے پوری واقفیت رکھتے ہیں۔

اردو ڈراما اور تھیٹر کو فروغ دینے میں جو لوگ کوشاں ہیں ان میں ایک نمایاں نام نادرہ ظہیر ببر کا ہے۔ نادرہ نے 1981 میں ایک جٹ کے نام سے ممبئی میں اپنا ایک تھیٹر گروپ قائم کیا۔ انھوں نے ممبئی میں رہ کر اسی کے بینر تلے کئی کامیاب ڈرامے اسٹیج کیے۔ جس کی پہلی پیشکش 'یہودی کی لڑکی' تھی جو پارسی تھیٹر کے اسٹائل میں تھا۔ یہ پیشکش بہت عمدہ تھی اور پچھلے 30 سالوں سے ایک جٹ نے متعدد کامیاب ڈرامے پیش کیے جن میں تلچھٹ، راجہ کا سپنا، چرن داس چور، سندھیا چھایا، آؤ پتنگ چلیں، چندن پور کی چمپابائی، پنکھ ہوتے تو اڑ جاتی، انصاف اور نہ نقد نہ ادھار خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

نادرہ نے اس کے علاوہ کئی ڈرامے لکھے اور ہدایت کاری بھی کی جن میں شرافت چھوڑ دی میں نے، دیا شنکر کی ڈائری، سکو بائی، امن اور سنا، دل ہی تو ہے، اور جی جیسے آپ کی مرضی وغیرہ کافی اہم ہیں۔

عصر حاضر کا ایک اہم ڈراما نگار ہدایت کار اور نقاد ظہیر انور ہے۔ان کے طبع زاد ڈراموں پر مشتمل 'انگاروں کا شہر' (1993)، انتظار اور ابھی، سحر ہونے تک، قیدی، صلیب (1985)، آخری موڑ، نقارہ، فیصلے آسمانوں کے، نئے موسم کا پہلا دن ہیں۔ ان کے ترجمہ کیے ہوئے ڈراموں میں ایک انارکسٹ کی اتفاقیہ موت، نیلامی ایک سلطان کی، چاہوں گا میں تجھے اور شہزادی توراندوٹ، سلیم شیروانی کی شادی، انصاف، اور شادی ایک دیوانے کی جیسے ڈرامے شامل ہیں۔ان کے چار ڈراموں کے مجموعے 'انگاروں کا شہر' صلیب، فرانسیسی ڈرامے اور نئے موسم کا پہلا دن شائع ہو چکے ہیں۔ان کی مقبول ٹیلی فلموں میں 'خوابوں کا سویرا' ہے۔ ظہیر انور نے اس کی ہدایت کاری کی ہے۔

مجموعی طور پر ظہیر انور کو فن ڈراما پر قدرت حاصل ہے۔ انھوں نے ہندوستانی سماج سے اپنا کردار تراشا ہے۔ جیسے سماج میں ہو رہے استحصال، کسانوں پر ڈھائے جانے والے مظالم، آئے دن ہو رہے فسادات، مہنگائی، بے روزگاری اور انسانی استحصال کو ڈراما نگار نے اپنایا ہے۔ ظہیر انور کو زبان پر مکمل دسترس ہے۔ وہ نہایت ہی آسان اور عام فہم الفاظ میں کردار کی مناسبت سے ایسے مکالمے گڑھتے ہیں کہ وہ مکالمہ خود بخود بولتا ہوا نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر اصغر ندیم نے انھیں تھیٹر کی دنیا کا Activist

اور بناض کہا ہے۔

تری پراری شرما کی پیدائش 31 جولائی 1956 کو ہریانہ کے کروکشیتر میں ہوئی۔ 1976 میں دہلی یونیورسٹی سے انگریزی ادب میں گریجویشن کیا اور ہدایت کاری میں ڈپلوما کی سند نیشنل اسکول آف ڈراما سے حاصل کی۔ وہ ایک مشہور و معروف ڈراما نگار ہیں۔ انھوں نے متعدد ڈراما گروپس سے وابستہ رہ کر بے شمار ڈرامے لکھے اور ہدایت کاری بھی کی۔ ان کے مشہور ڈرامے بہو، کاٹھ کی گاڑی، برسامنڈا، عکس پہیلی، سزا، ریشمی رومال، پوشاک، دائرے اور عزیز النساء، سن ستاون کا قصہ وغیرہ۔ تری پرارا شرما نے بہت سے انگریزی اور ہندی ڈراموں کے ترجمے بھی کیے جن میں ''اندھا یگ اور اوتھیلو (Othello) ہیں۔

درس و تدریس کے پیشے سے وابستہ اقبال نیازی کی پیدائش 10 مئی 1960 کو بمبئی میں ہوئی۔ ہندوستان کے دوسرے بڑے شہروں دہلی اور کلکتہ کی طرح ممبئی بھی تھیٹر کے لیے بہت ساز گار شہر رہا ہے۔ اس شہر میں اردو کے متعدد ڈراما نگار ساگر سرحدی، جاوید صدیقی، نادرہ ببر وغیرہ سرگرم ہیں۔ تو دوسری طرف ممبئی اور پورے مہاراشٹر میں اقبال نیازی بھی کردار آرٹ اکادمی کے بینر تلے اپنے لکھے ڈرامے اسٹیج کرتے رہتے ہیں۔

ڈراما اور اسٹیج سے محبت اس قدر بڑھی کہ اب تھیٹر کرنا ان کا محبوب مشغلہ بن چکا ہے۔ پچھلے بیس پچیس برسوں میں اردو کے جن ڈراما نگاروں نے وقت کی نبض کو محسوس کر کے سماج کو بدلنے کی خواہش سے یا پھر مروجہ سماجی ڈھانچے کے چیلنج کو قبول کرتے ہوئے ڈراما لکھا ان میں ایک اہم نام اقبال نیازی کا آتا ہے۔ محمد حسن نے ڈراما 'ضحاک' اور کمال احمد نے 'ایک تھا راجہ' لکھ کر ایمر جنسی کی لائی ہوئی آفات کا سختی سے احتساب کیا۔ بالکل اسی طرح اقبال نیازی نے اس روایت کی پاسداری کرتے ہوئے اپنا ڈراما 'جلیانوالا باغ' تحریر کیا۔ جس کو غیر معمولی کامیابی، پذیرائی اور انعام و اعزاز ملے ہیں۔

اس کے علاوہ ان کا طبع زاد ڈراما 'ہم صرف کیپور مائز کرتے ہیں' مہاراشٹر اردو اکادمی کے ڈراما مقابلے میں انعام پا کر ہندی اور مراٹھی میں ترجمہ ہو کر داد پا چکا ہے۔ ان کے لکھے دیگر ڈرامے 'سب ٹھیک ہے'، 'خصی کرالو' اور 'ڈاکو آرہے ہیں' وغیرہ اہم ہیں۔ آج اردو ڈراما اقبال نیازی کو بڑی پر امید نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ غالب انسٹی ٹیوٹ نے حال ہی میں انھیں غالب ڈراما ایوارڈ سے نوازا ہے۔

شاہد انور یوں تو صحافت سے منسلک تھے لیکن ان کا اصل میدان ڈراما تھا۔ ڈرامے لکھنے اور انھیں اسٹیج کرنے کی سرگرمی سے شاہد انور کی دلچسپی پختہ ہوئی۔ دہلی آنے کے بعد پہلے تو انگریزی، ہندی اور اردو کے نامور اور اہم اخبار و رسائل میں مسلسل ڈرامے پر تبصرہ، تجزیہ اور تنقید لکھتے رہے۔ ان کی تنقید زمانے کی رائج تنقید سے مختلف نظر آتی ہے۔

شاہد انور نے اپنی ڈراما نگاری کی شروعات ایڈپٹیشن سے کی۔ انھوں نے اردو کی اہم کہانیوں پر مبنی ڈرامے لکھے۔ جن میں ایک اہم ڈراما شوکت احمد کی کہانی 'سنگھار دان' پر مبنی ہے۔ اس ڈرامے کو اردو اکیڈمی دہلی کے ڈراما نگاری مقابلے میں نہ صرف پہلا انعام ملا تھا بلکہ اسے نہایت ہی طمطراق سے پیش کیا گیا تھا اور اسے حبیب تنویر نے اپنی ہدایت میں دوبارہ پیش کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ اس کے بعد کئی اہم ڈرامے منظر عام پر آئے جن میں درج ذیل ڈرامے شامل ہیں: سنگھار دان، فائنل سولوشن، دیکھ تماشا دیکھ، کالے کوے نے کہا، زہر قند، ایک کہانی ایسی بھی، غیر ضروری لوگ، سونا کا سپنا، شیرنی نے کہا، ہمارے سے میں اور بی تھری وغیرہ۔ شاہد انور نے کئی تھیٹر کے میگزین کی ادارت بھی کی جن میں بہروپ تھیٹر ڈائجسٹ شامل ہے۔ اس کا ہر شمارہ ایک خاص موضوع پر مبنی ہوتا ہے یہی اس رسالے کی خوبی ہے۔

موجودہ دور میں ڈاکٹر سعید عالم ایک منفرد ڈراما نگار، ادا کار، ہدایت کار ہیں جو عملی طور پر اس صنف سے وابستہ ہیں۔ موجودہ سماجی اور سیاسی حالات پر ان کی گہری نظر ہے۔ وہ سماج میں ہونے والی تبدیلیوں کو بہت قریب سے دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں اور عہد حاضر کے بدلتے ہوئے سیاسی، سماجی اور اقتصادی حالات کو اپنے ڈراموں کا موضوع بناتے ہیں۔

ڈاکٹر سعید عالم کا دہلی میں Pierrots Troupe نام کا اپنا ایک تھیٹریکل گروپ ہے۔ جس کو 1989 میں اشوک پورن نے قائم کیا تھا۔ بعد میں وہ بمبئی چلے گئے اور تب سے ڈاکٹر سعید عالم اس گروپ کے سکریٹری ہیں۔ انھوں نے زیادہ تر ڈرامے اسی بینر تلے اسٹیج کیے۔ ان کے ڈراموں کی ایک لمبی فہرست ہے جو کامیابی سے اسٹیج کیے جاتے رہے ہیں۔ جن میں غالب، مولانا آزاد، غالب ان نیو دہلی، بیگم اختر، رہے نام، زندگی نام ہے جیے جانے کا، تم کو چاہوں کہ نہ آؤ، پڑے گر بیمار، پولیوشن حاضر ہو، غالب کے خطوط، کون سنتا ہے کہانی میری، شریک غالب، لال قلعہ کا آخری مشاعرہ، میں ابو سلیم ہوں، اور 1947 اہمیت کے حامل ہیں۔ ڈاکٹر سعید عالم ٹی وی سیریل سے بھی وابستہ رہے ہیں حسرت موہانی، غبار خاطر، جو دل پہ گزری اور غزل اس نے چھیڑی ہے ان کے ہدایت کردہ عمدہ سیریل ہیں۔

مذکورہ بالا ڈراما نگاروں کے علاوہ بھی بہت سے ایسے لوگ ہو سکتے ہیں جنھوں نے گاہے گاہے اُردو ڈرامے لکھے ہوں گے اور یہ ممکن ہے کہ بعض نام چھوٹ بھی گئے ہوں گے۔ میں نے حتی المقدور 1980 کے بعد کے نمائندہ ڈراما نگاروں او رأن کے ڈراموں کو شامل کرنے کی کوشش کی ہے۔ مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ 1980 کے بعد ڈرامے سے وابستہ ڈراما نگاروں نے موضوع اور اسلوب کی سطح پر اُردو ڈرامے کے دامن کو وسیع کیا جس کی وجہ سے یہ تمام تخلیقات اُردو ڈرامے کی تاریخ میں اہم اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ یہ سلسلہ ابھی جاری و ساری ہے اور ان دنوں بہت سے اچھے اور سنجیدہ ڈراما نگار اپنے طور پر اُردو ڈرامے کی آبیاری کر رہے ہیں۔

مذکورہ بالا ڈراما نگاروں کے علاوہ بھی بہت سے ایسے لوگ ہو سکتے ہیں جنھوں نے گاہے گاہے اُردو ڈرامے لکھے ہوں گے اور یہ ممکن ہے کہ بعض نام چھوٹ بھی گئے ہوں گے۔ میں نے حتی المقدور 1980 کے بعد کے نمائندہ ڈراما نگاروں او رأن کے ڈراموں کو شامل کرنے کی کو شش کی ہے۔ مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ 1980 کے بعد ڈرامے سے وابستہ ڈراما نگاروں نے موضوع او راسلوب کی سطح پر اُردو ڈرامے کے دامن کو وسیع کیا جس کی وجہ سے یہ تمام تخلیقات اُردو ڈرامے کی تاریخ میں اہم اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ یہ سلسلہ ابھی جاری و ساری ہے او ران دنوں بہت سے اچھے اور سنجیدہ ڈراما نگار اپنے طور پر اُردو ڈرامے کی آبیاری کر رہے ہیں۔

کتابیات

1۔ مورپنکھی اور دوسرے ڈرامے۔ محمد حسن
2۔ اردو تھیٹر کل اور آج۔ انیس اعظمی
3۔ عصری ہندوستانی تھیٹر (اردو ہندی تھیٹر کے حوالے سے): زبیر رضوی
4۔ صلیب (ڈراما قیدی) ظہیر انور
5۔ الفاظ علی گڑھ، اطہر پرویز

Qurratul Ain
Research Scholar, Dept of Urdu
Jamia Millia Islamia
New Delhi - 110025

میر وسودا کے عہد کی اردو شاعری پر فارسی کے اثرات

غلام اختر

اردو شاعری کی اٹھارھویں صدی میر وسودا کے حوالے سے جانی جاتی ہے جسے اردو کا عہد زریں کہنا درست ہے۔ اردو شاعری کو میر وسودا سے جو غیر معمولی فروغ ملا ہے اسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ میر وسودا نے اردو کی جو خدمات کی ہیں ان کا بدلا تو نہیں ہوسکتا، تاہم ان محسنین اردو میں سودا کو 'پہلوان سخن' اور میر کو 'خدائے سخن' کے القاب سے یاد کیا جانا فقط احسان مندی کہلائے گا۔ اتنے عظیم ومہتم بالشان القاب وخطابات سے سرفراز ہونا ہی اس بات کی بین دلیل ہے کہ میر وسودا کو ان کے عہد کے قدردانوں نے اپنی زبان کا مربی مان لیا تھا، ورنہ عام طور پر ہم عصر فضلا کسی بڑے دانشور کو وہ مقام نہیں دیتے جس کے وہ اہل ہوتے ہیں، اس لحاظ سے میر وسودا کی اہمیت مزید بڑھ جاتی ہے کہ ان کے ہم عصروں نے یہ خطابات تسلیم کر لیے تھے۔ سودا و میر کے عہد کو اردو زبان وادب کے عہد زریں سے اس لیے تعبیر کیا جاتا ہے کہ اس وقت اردو فارسی سے استفادہ کرتے ہوئے ترقی کر رہی تھی، بعد میں اگرچہ اردو سے فارسی اثرات کم ہوئے۔ اردو نے اپنے الفاظ ومصطلحات خود وضع کیے، فارسی محاورے وضرب الامثال کو بعینہ یا ترجمہ کرکے یا تھوڑی بہت تبدیلی کے ساتھ اپنے قالب میں ڈھال کر استعمال کیا، تاہم اس زبان کو ہر سطح پر ترقی کرنے کے لیے فارسی خطوط ہی رہنما کی صورت میں کام آئے اور یہ انھیں پر چل کر پلی بڑھی۔ چونکہ اردو زبان سودا و میر کے عہد میں مکمل طور پر فارسی سے مستفید ہورہی تھی اس لیے اردو کا فارسی اثرات سے متاثر ہونا فقط میر وسودا تک ہی محدود نہیں ہے، بلکہ اس عہد کے بھی شعرا نے فارسی کے زیر سایہ اردو میں تخلیقات پیش کیں۔

سودا (1706-07پ) اور میر (1722-23پ) کے عہد کو اردو زبان کا عہد زریں کہنا اس لیے بھی درست ہے کہ اردو نے جس زبان فارسی کے اثرات کو عہد بہ عہد قبول کیا ہے اس میں سودا اور میر کا عہد اہم ہے یہی وجہ ہے کہ بہ زبان آغا محمد باقر ''سودا اور میر نے حافظ وسعدی سے استفادہ کیا ہے۔'' تذکرہ نویسوں نے ان کو اقلیم سخنوری کا شہنشاہ اور اردو کا خاقانی اور انوری مانا ہے۔ اس لیے ان دونوں شعرا کے کلام میں جا بہ جا فارسی الفاظ و تراکیب، محاورے وضرب الامثال کی افراط نظر آتی ہے اس سلسلے میں آغا محمد باقر کا یہ اقتباس سودا کے سلسلے میں مذکورہ دعوی کا اثباتی آئینہ ہے:

'' مرزا صاحب نے ہندی الفاظ کی درشتی کو دور کرکے فارسی کی آمیزش سے زبان میں حلاوت پیدا کر دی اور اردو زبان کو ادبی زبان بنایا۔ فارسی الفاظ کو اس خوبصورتی سے زبان میں داخل کیا کہ وہ اصل زبان کا جزو بن گئے۔''

مذکورہ بالا رائے پر بین ثبوت ذیل میں درج کیے گئے۔ سودا کے یہ اشعار ہیں ملاحظہ ہو:

حافظ:

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز
ورنہ در محفل رنداں خبرے نیست کہ نیست

(ترجمہ: مصلحت یہ نہیں کہ راز سے پردہ اٹھا دیا جائے، ورنہ رندوں کی محفل میں کوئی ایسی خبر نہیں ہے جو ظاہر نہیں ہے۔)

سودا:

راز دیر وحرم افشاں نہ کریں ہم ہرگز
ورنہ کیا چیز ہے یاں اپنی نظر سے باہر

درج بالا حافظ وسودا کے اشعار سے واضح ہوگیا کہ سودا نے حافظ کے مضمون کو بعینہ اپنی شاعری میں برتا ہے، سودا کی اس ماہرانہ قدرت پہ جتنی داد دیجیے کم ہے، کہ انھوں نے حافظ کے شعر سے مضمون تو ضرور لیا ہے لیکن ان کی تعبیر وتوقیر کو ہاتھ نہیں لگایا ہے ورنہ اسے استفادہ نہیں بلکہ ترجمہ کہا جاتا۔ سودا کے اندر جہاں یہ خوبی تھی کہ وہ فارسی شعرا کے مضامین کو اپنے اسلوب تعبیر میں ڈھال کر پیش کرتے تھے وہیں انھوں نے فارسی کی اس قدر بھی تقلید کی ہے کہ فارسی کے شعر کو ہی ذرا سی تبدیلی کے ساتھ من وعن اردو میں پیش کر دیا ہے۔ مثال میں قدسی مشہدی کا درج ذیل شعر دیکھا جاسکتا ہے، جسے سودا نے خان آرزو کے گھر پر منعقد محفل مشاعرہ میں فی البدیہہ کہا تھا۔

سودا:

آلودۂ قطرات عرق دیکھ جبیں کو
اختر پڑے جھانکے ہیں فلک پر سے زمیں کو

دراصل قدسی مشہدی نے فارسی میں کچھ اس طرح کہا تھا۔

قدسی مشہدی:

آلودۂ قطرات عرق دیدہ جبیں را
اختر ز فلک می نگرد سوئے زمیں را

(ترجمہ: پیشانی کو پسینے میں اس قدر آلودہ دیکھا، گویا چاند آسمان سے زمین کی طرف دیکھ رہا ہو)

قدسی مشہدی کا درج بالا شعر دیکھیے اور اسے سودا کے شعر سے ملایئے، آپ کو سودا کے شعر میں صرف اتنی تبدیلی ملے گی کہ انھوں نے قدسی مشہدی کے ہی شعر کے مصرع اول میں لفظ 'دیدہ' کو اردو لفظ 'دیکھ' سے اور 'را' کو 'کو' سے بدل کر فارسی الفاظ کو محض ترجمہ کر دیا ہے، ویسے ہی دوسرے مصرع میں فارسی الفاظ وتراکیب کو اردو میں ترجمہ کر دیا ہے۔ سودا کے مذکورہ اشعار فارسی سے متاثر ہونے کا بہترین نمونہ ہیں۔ اب ذیل میں سودا کے مرثیے سے چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں یہ بھی فارسی سے فیض یاب ہیں۔

سودا:

لے برادر تا پدر عم ابن عم
غرق لوہو میں پڑے ہیں یک قلم
بہہ گئی دریائے خوں میں ہے ستم
کشتی آل نبی آ منجھ دھار
باپ کو میرے محمد یک زماں
دیکھیے تنہا نہ زیر آسماں
ذبح کر ڈالا یہ بیکس کرکے واں
جس جگہ کوئی نہ یاور ہے نہ یار

سودا کے درج بالا اشعار میں مستعمل الفاظ برادر،

پدر، عم، ابن عم، غرق، یک قلم، دریائے خوں، ستم، یک زماں، زیر آسماں، ذبح، بیکس، وواں، یاور اور یار جیسے الفاظ وتراکیب میں ایک دو عربی کے ہیں جبکہ سارے کے سارے فارسی کے ہی ہیں جن کو سودا نے اپنی اردو شاعری میں اس طرح برتا ہے جیسے وہ سارے کے سارے اردو کی اپنی وضع کردہ تراکیب ہوں۔ ان سے یہ بخوبی ظاہر ہوتا ہے کہ سودا نے اپنی شاعری میں فارسی سے کافی حد تک استفادہ کیا ہے۔ فارسی سے استفادے کی یہ روایت سودا پہ ہی ختم نہیں ہو جاتی ہے بلکہ سودا کے علاوہ میر نے بھی اپنے کلام میں فارسی الفاظ وتراکیب کو برتا ہے مثال ملاحظہ ہو!

میر:

چمن میں صبح جو اس جنگجو کا نام لیا
صبا نے تیغ کا آب رواں سے کام لیا
شہاں کہ کحل جواہر تھی خاک پا جن کی
انھی کی آنکھوں میں پھرتے سلائیاں دیکھیں
فکر معاش یعنی غم زیست تابہ کے
مر جایئے کہیں کہ تک آرام پایئے

میر کے مذکورہ بالا اشعار میں چمن، صبح، جنگجو، صبا، تیغ، آب رواں، شہاں، کحل جواہر، خاک پا، فکر معاش، غم زیست تابکے جیسے الفاظ وتراکیب اور جملے پورے طور پہ فارسی کے ہی ہیں جن کو میر نے اپنی اردو شاعری میں بے تکلفانہ استعمال کیا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ سودا کی طرح میر نے بھی اپنی شاعری کو فارسی خطوط پر چلایا ہے۔ ان دونوں مذکورہ شعرا کے علاوہ درد، قائم، میر سوز، میر اثر اور میر حسن بھی اس عہد زریں کے وہ نامور شعرا ہیں جنھوں نے اردو شاعری کی قابل قدر خدمات انجام دی ہیں اور جن کے کلام پر فارسی کے اثرات واضح طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔

درد:

اپنے تئیں تو کام کچھ خرقہ وجامہ سے نہیں
درد اگر لباس ہے دیدہ عیب پوش ہے
زنہار ادھر کھولیو مت چشم حقارت
یہ فقر کی دولت ہے کچھ افلاس نہیں ہے
اے درد مثل آئینہ ڈھونڈ اس کو آپ میں
بیرون در تو اپنی قدم گاہ ہی نہیں
مانند فلک دل متوطن ہے سفر کا
معلوم نہیں اس کا ارادہ ہے کدھر کا

درد کے درج بالا اشعار میں بھی فارسی الفاظ وتراکیب اور جملوں کی کثرت ہے مثال کے طور پر ان کے اشعار میں مستعمل خرقہ وجامہ، دیدہ عیب پوش، زنہار، چشم حقارت، فقر، افلاس، مثل آئینہ، بیرون در، قدم گاہ، مانند فلک، دل، متوطن جیسے الفاظ وجملے فارسی وعربی کے ہیں جو براہ راست فارسی میں مستعمل ہیں یا عربی سے ماخوذ ہیں جن کو درد نے اپنی شاعری میں روانی سے استعمال کیا ہے۔ درد کے ان اشعار میں مستعمل فارسی الفاظ وتراکیب کی کثرت سے بھی عہد میر وسودا میں فارسی سے کثرت استفادہ سمجھ میں آتی ہے۔ اب ذیل میں قائم کے چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں ملاحظہ فرمائیں!

قائم:

گہ ہوئی صبح گاہ شام ہوئی
عمر انھیں قصوں میں تمام ہوئی
قائم نہیں یہ سختی دوراں دو روز پیش
کرتا ہے کیوں گلہ تو غم روزگار کا
خاک ہے اس مہر گردوں پر کہ یوں مائی کے بیچ
صورتیں کیا کیا دیں اتنی خرم وشاداب داب
تعبیر از قیس قائم دشت اک مدت سے ویراں تھا
سو بارے اس خرابے کو میں اب آباد کرتا ہوں

عہد میر وسودا کے معتبر شاعر قائم کے درج بالا اشعار کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد ہمیں اس بات کا ادراک ہوتا ہے کہ اردو کے عہد زریں میں فارسی نے اردو کو اپنے الفاظ وتراکیب سے کتنا نوازا ہے۔ قائم نے اپنے مذکورہ اشعار میں لفظ گہہ وگاہ، سختی دوراں، دو روز پیش، گلہ، غم روزگار، خاک، مہر گردوں، خرم، شاداب، داب، تعبیر از قیس قائم دشت، مدت، ویراں، خرابہ اور آباد جیسے الفاظ کو تسلسل کے ساتھ استعمال کیا ہے جو دراصل فارسی کے ہیں۔ یہ تفصیلات بھی فارسی سے اثر پذیری کی طرف اشارہ ہیں۔ اب ذیل میں میر سوز اور میر اثر کے چند اشعار دیکھیں!

سوز:

ہے شوخ مزاج سوز واللہ
چھیڑے گا اسے برا کرے گا

میر اثر:

نہ رہا لطف زندگانی کا
کچھ نہ پایا مزا جوانی کا
وہ ترا بے حجاب مل جانا
وہ ترا آپ ہی آپ شرمانا

میر سوز کے شعر میں لفظ 'شوخ مزاج' اور میر اثر کے اشعار میں استعمال شدہ ترکیب 'لطف زندگانی' اور 'بے حجاب' خالص فارسی ہیں۔ میر سوز اور میر اثر کے مذکورہ بالا اشعار میں قائم کے بہ نسبت فارسی کے اثرات کم ہیں اور یہی حال ان کے دیگر اشعار کا بھی ہے، لیکن یہی استعمال جب میر حسن کے یہاں پہنچتا ہے تو فارسی کا زور بڑھ جاتا ہے اور ان کی شاعری فارسی سے زیادہ متاثر ہوتی ہے۔ انھوں نے اپنے اشعار میں کچھ اس طرح فارسی الفاظ وتراکیب کا استعمال کیا ہے۔

میر حسن:

سخن داں، سخن سنج، شیریں بیاں
وزیر جہاں و وحید زماں
کی نہیں اس سے پوشیدہ بات
غوامض ہیں سب سہل اس کے نکات
سدا سیر پر اور تماشے پہ دل
کشادہ دلی اور خوشی متصل
بہت حشمت وجاہ و مال ومنال
بہت فوج سے اپنی فرخندہ حال

فارسی:

دریغا! کہ عہد جوانی گذشت
جوانی مگو، زندگی گذشت

فارسی:

زہے بے تمیزی و بے حاصلی
کہ از فکر دنیا زدیں غافلی

میر حسن کے درج بالا اشعار میں پہلا شعر مکمل فارسی ہے جبکہ دیگر اشعار میں استعمال شدہ الفاظ وتراکیب اور جملے فارسی کے ہیں، مثلاً لفظ سخن، پوشیدہ، غوامض، سہل، نکات، کشادہ دلی، متصل، حشمت، جاہ ومال ومنال، فرخندہ وغیرہ الفاظ وجملے مکمل طور پر فارسی کے ہیں۔ اخیر کے دونوں شعر مکمل فارسی کے ہیں۔ میر حسن کے درج بالا اشعار میں فارسی الفاظ وتراکیب اور جملوں کے استعمال سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہوگئی کہ میر وسودا، درد، سوز اور میر اثر سمیت میر حسن نے بھی فارسی سے خاصا استفادہ کیا ہے۔

سودا اور میر کے عہد کے چند قابل ذکر شعرا کے کلام کے طائرانہ مطالعے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اردو کا خاصا حصہ فارسی سے متاثر ہے کیونکہ اردو کا وہ دور جسے خالص اردو کا دور کہا جاتا ہے، اس دور میں بھی اردو اپنے اندر فارسی کے سیکڑوں الفاظ وتراکیب، محاورے اور ضرب الامثال نیز بحریں سموئے ہوئے ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اردو کے فارسی اثرات قبول کرنے کا تناسب کتنا غیر معمولی ہے۔ اس طرح کے سیکڑوں اشعار ہیں جن سے فارسیت صاف جھلکتی ہے، جس سے یہ اندازہ لگانا آسان ہو گیا ہے کہ اردو نے اپنے عہد زریں میں بھی فارسی سے کافی استفادہ کیا ہے۔

■

Ghulam Akhtar
Room No.: 008-E, Mahanadi Hostel
Jawaharlal Nehru University
New Delhi - 110025

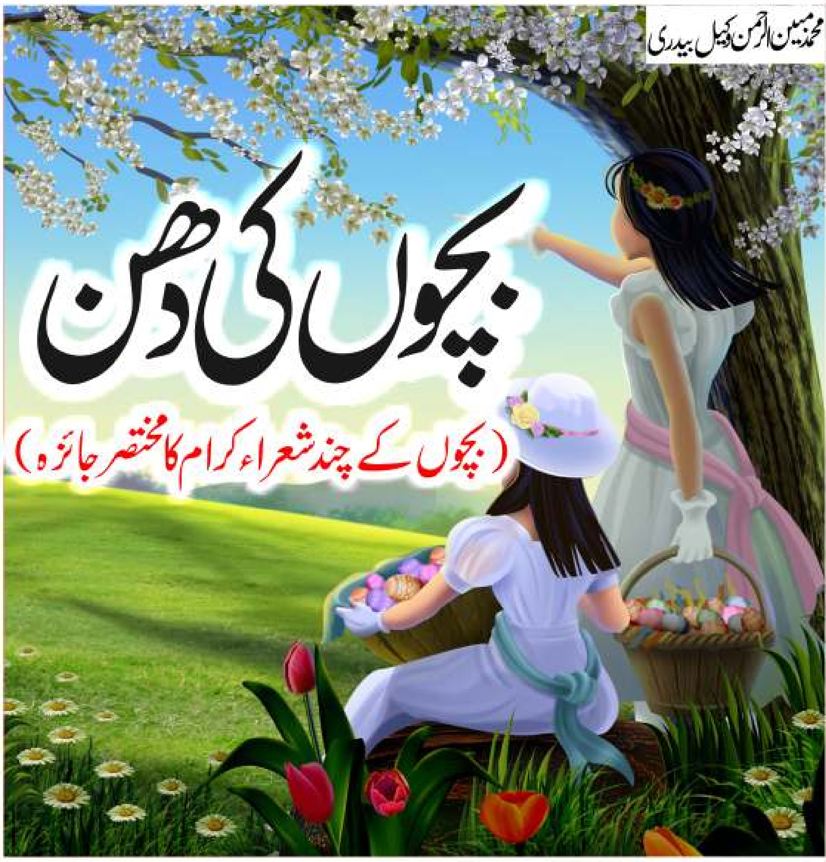

محمد مبین الرحمن وکیل بیدری

بچوں کی دھن

(بچوں کے چند شعراء کرام کا مختصر جائزہ)

بچے کسی بھی قوم کی سب سے بڑی دولت ہوتے ہیں۔ ہمیشہ سے یہ کہا جاتا ہے کہ بڑوں کے لیے لکھنا آسان ہوتا ہے لیکن بچوں کے لیے لکھنا بہت مشکل ہے کیونکہ بچوں کے لیے لکھتے وقت ان کی ذہنی استعداد، مزاج، زبان اور بچوں کی دلچسپی کو مدنظر رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ بچوں کی تربیت بڑوں کے ذمے ہوتی ہے۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ ان کی پسند و ناپسند کے مطابق ادب اطفال کی تخلیق و اشاعت کی جائے۔ چھوٹے بچوں کی نظمیں بہت زیادہ پسند آتی ہیں۔ نظموں میں اصلاح کا عنصر بھی ہوتا ہے اور دلچسپ و معلوماتی باتیں بھی۔ بچے قدرت کے شاہکاروں، پہاڑ، جنگل، آسمان، خلا، چاند، ستاروں وغیرہ سے متعلق موضوعات پڑھنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ اردو زبان کے آغاز سے ہی بچوں کے ادب کی تخلیق کا آغاز ہوجاتا ہے۔ محمد حسین آزاد اور مولانا حالی نے پہلے پہل بچوں کے لیے نظمیں تحریر کی تھیں۔ حالانکہ بچوں کے لیے لکھنے والوں میں امیر خسرو (اوّلین شاعر) کو ہی اولیت حاصل ہے۔ انھوں نے پہیلیوں، کہہ مکرنیوں سے بچوں کو محظوظ کیا۔ ان کے بعد اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر قلی قطب شاہ کے یہاں بھی بچوں کی نظمیں ملتی ہیں۔ نظیر تو بچوں کے شاعر کے طور پر معروف ہی ہیں ان کے علاوہ میر تقی میر، غالب، اقبال، اکبر، حفیظ جالندھری، جمیل مظہری، جاں نثار اختر، تلوک چند محروم، اسمٰعیل میرٹھی، شفیع الدین نیر وغیرہ نے بھی بچوں کے لیے اچھی اور سبق آموز نظمیں تخلیق کی ہیں۔

اردو میں بچوں کے شعرا کی ایک معتدبہ تعداد ہے۔ ان میں بہت سے شعرا نصاب میں بھی شامل ہیں۔ ان میں ایک نام مولوی اسماعیل میرٹھی کا بھی لیا جاتا ہے۔ جن کی شعری تخلیقات کو بچوں کے علاوہ طلبہ ذوق وشوق کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ آپ کی تخلیقات میں حمد، نظمیں، نصابی کتابوں کا حصہ ہیں۔ خاص طور پر آپ کی مشہور حمد کے مطالعے سے ایمان کو نئی حرارت ملتی ہے۔ اس کی ایک وجہ الفاظ اور زبان و بیان کی سادگی ہے جس سے عام قاری بھی الفاظ کے معنیٰ و بیان کے مفہوم کو آسانی سے سمجھ لیتا ہے۔ اشعار میں ایسی تاثیر ہے جو ہر عمر کے قاری کو اپنی طرف راغب کرتی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

تعریف اس خدا کی جس نے جہاں بنایا
کیسی زمیں بنائی کیا آسماں بنایا
خوش رنگ خوشبو گل پھول ہیں کھلائے
اس خاک کے کھنڈر کو کیا گلستاں بنایا

اسماعیل میرٹھی نے زبان و بیان میں بچوں کا خاص خیال

رکھا ہے جس کی وجہ سے بچے ان کے شعری پیغام سے بآسانی واقف ہوتے ہیں۔

مولوی الطاف حسین حالی اگرچہ نقاد کی حیثیت رکھتے ہیں لیکن حالی کی شعری تخلیقات میں نعت اور نظمیں بچوں کے ادب کا حصہ ہیں۔

نعت کے چند اشعار:

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا
مرادیں غریبوں کی بر لانے والا
مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا
وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا

نظم کے چند اشعار:

اے بھولے بھالے بچو! کہنا بڑوں کا مانو
سر پر بڑوں کا سایہ سایہ خدا کا جانو
چاہو اگر بڑائی کہنا بڑوں کا مانو
تم کو خبر نہیں کچھ اپنے بھلے برے کی
جتنی ہے عمر چھوٹی اتنی ہے عقل چھوٹی
چاہو اگر بڑائی کہنا بڑوں کا مانو

حالی کو بچوں سے حد درجہ انسیت ہے۔ حالی نے حمد اور نظم میں اصلاحی پہلو سمیٹنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ آج بھی حالی کی نظمیں بچوں میں مقبول ہیں۔

اقبال دنیائے ادب میں عظیم شاعر کہلاتے ہیں لیکن ان کے شعری عنوانات میں بچوں کے عنوانات بھی ملتے ہیں۔ اقبال نے بچوں کے لیے بہت ساری نظمیں لکھی ہیں۔ اقبال کی بچوں پر تخلیقات میں دعا، نظم، ترانہ خاص اہمیت کی حامل ہیں۔ بچوں کی دعا جس کو اردو مدارس میں دعا کے طور پر پڑھا جاتا ہے طلبہ دعا کے اشعار پڑھتے ہوئے جذباتی دکھائی دیتے ہیں۔ دعا کے علاوہ ترانہ ہندی بھی اقبال کی اہم تخلیق ہے نظم میں بھی اقبال کا شعری فن بچوں کو متاثر کرتا ہے۔ دعا کے چند اشعار:

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری
زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری
ہو میرے دم سے یوں ہی میرے وطن کی زینت
جس طرح پھول سے ہوتی ہے چمن کی زینت
زندگی ہو میری پروانے کی صورت یارب
علم کی شمع سے ہو مجھ کو محبت یارب

نظم کے چند اشعار:

کیا غم ہے رات ہے اندھیری
میں راہ میں روشنی کروں گا
اللہ نے دی ہے مجھ کو مشعل
چمکا کے مجھے دیا بنایا
ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے
آتے ہیں جو کام دوسروں کے

اقبال کے اشعار پڑھنے سے اُن کے شعری رجحان کا اندازہ ہوتا ہے۔ اقبال نے بچوں کے لیے لکھی نظموں میں جن باتوں کا ذکر کیا ہے وہ تمام باتیں بچوں کے لیے اہم ہیں اور بچوں کی اصلاح کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔

اردو ادب میں بچوں کے شعرا کی فہرست میں ایک نام مائل خیرآبادی کا بھی لیا جاتا ہے، مائل خیرآبادی کو بچوں سے حد درجہ لگاؤ تھا یہی وجہ ہے کہ آپ کو چچا مائل کا لقب ملا آپ نے نظم گو شاعر کی حیثیت سے بچوں کے لیے مختلف عنوانات پر نظمیں لکھی ہیں۔ آپ نے اصلاحی عنوانات پر بچوں کے لیے کہانیاں بھی تحریر کی ہیں۔ بچوں کا ماہانہ پرچہ نور کے بھی آپ طویل عرصے تک مدیر رہے۔ شاعر کی شاعری پر شخصیت کا عکس نمایاں رہتا ہے۔

مائل خیرآبادی کو بچوں سے حددرجہ لگاؤ تھا یہی وجہ ہے کہ آپ کو چچا مائل کا لقب ملا آپ نے نظم گو شاعر کی حیثیت سے بچوں کے لیے مختلف عنوانات پر نظمیں لکھی ہیں۔ آپ نے اصلاحی عنوانات پر بچوں کے لیے کہانیاں بھی تحریر کی ہیں۔ بچوں کا ماہانہ پرچہ نور کے بھی آپ طویل عرصے تک مدیر رہے۔ شاعر کی شاعری پر شخصیت کا عکس نمایاں رہتا ہے۔ چنانچہ مائل خیرآبادی کی شاعری پر ان کی شخصیت کے اثرات دکھائی دیتے ہیں اور جب کبھی بچوں کے شعرا کا تذکرہ ہوگا مائل خیرآبادی بھی بچوں کے شاعر کی حیثیت سے اُس میں شامل رہیں گے۔

چنانچہ مائل خیرآبادی کی شاعری پر ان کی شخصیت کے اثرات دکھائی دیتے ہیں اور جب کبھی بچوں کے شعرا کا تذکرہ ہوگا مائل خیرآبادی بھی بچوں کے شاعر کی حیثیت سے اُس میں شامل رہیں گے۔

بچوں کے شعراء کرام میں شفیع الدین نیر، اطہر عزیز بھی مقبول رہے ہیں۔

اگر شعراء کرام بچوں کے مسائل کو شاعری کے ذریعے پیش کریں تو بچے شوق وذوق سے ایسی تخلیقات کا مطالعہ کریں گے۔

■

Mohd Wakeelur Rahman Wakeel Bedri,
House No.: T-99/45/69, Zam Zam Colony,
Gulbarga-585102(Karnataka)

مومن فہیم احمد عبدالباری

ڈیجیٹلائزیشن اور سائبر جرائم

موجودہ دور کو اگر ڈیجیٹل دور یا ڈیجیٹل دنیا کہا جائے تو کچھ غلط نہیں ہوگا۔ آج ہم کمپیوٹر اور انٹرنیٹ ٹیکنالوجی سے گھرے ہوئے ہیں۔ اس تکنیک نے ہمارے آپسی رابطوں کو آسان اور فاصلوں کو کم کردیا ہے اور یہ آج ہمارے طرز زندگی کا حصہ ہے۔

کیا آپ جانتے ہیں کہ سب سے پہلا کمپیوٹر 1930 میں بنا اور اس کی جسامت کا حال یہ تھا کہ اس کے پرزے ایک بڑے کمرے کا احاطہ کرتے تھے اور انتہائی بنیادی حساب ہی اس پر کیا جاسکتا تھا۔ بیس برس کا عرصہ لگا جب کمپیوٹر کا استعمال تجارتی اداروں اور بڑی تنظیموں میں کیا جانے لگا لیکن اس کے باوجود بھی ان کا استعمال صرف تعلیمی اور تجارتی مقاصد کے لیے کیا جاتا تھا۔ پہلا پرسنل کمپیوٹر 1970 میں تیار کیا گیا یہ ایک انقلابی قدم تھا جب کمپیوٹر ٹیکنالوجی نے پہلی مرتبہ ہمارے گھروں پر دستک دی۔ اس کے بعد بتدریج موڈیم (انٹرنیٹ کے لیے ٹیلیفون لائن سے کمپیوٹر کو جوڑنے والی مشین)، کیبل نیٹ، وائرلیس، راؤٹر اور بالآخر موبائل انٹرنیٹ وغیرہ وجود میں آئے۔ 1990 میں ورلڈ وائڈ ویب کا ارتقا ہوا اور دنیا کے کونے کونے سے لوگوں کے رابطوں اور ابتدا میں تار سے انٹرنیٹ کنیکشن اور موجودہ دور میں وائرلیس کنیکشن تک اس کے استعمال کرنے والوں کی تعداد میں زبردست اضافہ ہوا۔ ڈیسک ٹاپ، لیپ ٹاپ، موبائل فون اور موجودہ دور میں استعمال کیے جانے والے دیگر تمام ڈیجیٹل آلات اس ٹیکنالوجی سے آراستہ ہوگئے اور ہم بلاشبہ یہ کہہ سکتے ہیں "اب ہم ایک ڈیجیٹل دنیا میں رہتے ہیں"

لیکن جہاں اس ٹیکنالوجی نے افراد، اداروں اور حکومت کو ایک دوسرے سے رابطہ کرنے اور کام میں سہولت فراہم کی ہے وہیں اس کے منفی اثرات بھی ہماری زندگیوں پر پڑے ہیں۔ جہاں یہ تکنیک ہمارے لیے باعث رحمت ہے وہیں اس میں زحمت کے عنصر بھی پوشیدہ ہیں۔

گذشتہ دنوں کئی اہم شخصیات کے ٹویٹر اکاؤنٹ اور ای میل کو ہیک کرلیا گیا تھا۔ اس طرح کی خبریں ہمیں آئے دن اخبارات اور ٹیلی ویژن سے ملتی ہیں۔ 1980 کی دہائی سے کمپیوٹر وائرس کا آغاز ہوا جب یہ وائرس پروگرام کسی کے کمپیوٹر کے مشمولات کو برباد کردیا کرتے تھے موجودہ دور میں یہ سائبر خطرات نہ صرف افراد بلکہ کمپنیوں، بینکوں، حکومت اور فوجی معلومات تک رسائی کرکے متعلقہ اداروں کو بڑے نقصانات سے دو چار کرتے ہیں۔ اعداد و شمار کے مطابق گذشتہ چار برسوں میں تجارتی اداروں پر سائبر حملوں کی تعداد میں ایک سو چوالیس فیصد کا اضافہ ہوا ہے۔ ان سائبر حملوں سے سالانہ تین سو بلین سے ایک ٹریلین ڈالر کے نقصانات کا اندیشہ ہے۔ اکیانوے فیصد یہ حملے Phishing (لاٹری و انعام کی رقم کا لالچ دے کر پیسے اینٹھنا) سے متعلق ہوتے ہیں۔ 2014 میں نوے فیصد تجارتی اداروں نے اپنے حفاظتی نظام میں غیر قانونی آن لائن دخل اندازی کی شکایت درج کروائی تھی۔

ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ جب ہم ان آلات کا استعمال کرتے ہیں تو یہ مفروضہ ہمارے ذہنوں میں ہوتا ہے کہ ہماری شیئر کی گئی معلومات اس ٹیکنالوجی کے ذریعے مخفی رکھی جاتی ہیں اور ان کا غلط استعمال نہیں ہوسکتا۔ لیکن ایسا نہیں ہے یہ معلومات غلط ہاتھوں میں پڑسکتی ہیں اور آپ آن لائن فراڈ، سائبر حملے یا سائبر خطرات کا شکار ہوسکتے ہیں۔ آیئے ہم کچھ سائبر خطرات (Cyber Threats) کے بارے میں جانیں کہ وہ کس طرح اثر انداز ہوتے ہیں اور ان سے بچنے کے لیے کیا اقدامات کیے جانے چاہئیں۔

(1) **مال وئیر** (Malware): مال وئیر ایک وائرس، ٹروجن یا ورم ہوسکتا ہے جو غیر لائسنس یافتہ سافٹ وئیر بالخصوص کمپیوٹر گیمس اور مفت حاصل ہونے والے سافٹ وئیر کو ڈاؤن لوڈ کرنے یا وائرس سے متاثرہ پین ڈرائیو یا اسٹوریج ڈوائس استعمال کرنے پر آپ کے کمپیوٹر یا موبائیل میں داخل ہوجاتا ہے اور اس کے نظام کو متاثر کرتا ہے۔

احتیاط : اس سے بچنے کے لیے کبھی بھی ایسی کسی لنک کو کلک نہ کریں جس سے آپ واقف نہ ہوں، اپنے کمپیوٹر سسٹم کو اچھے اور جدید ترین اینٹی وائرس سافٹ وئیر سے لیس رکھیں، غیر متعلقہ اور نامانوس ای میل کو نظر انداز کریں، کسی بھی بیرونی ڈوائس (پین ڈرائیو، اسٹوریج ڈوائس) کو استعمال کرنے سے پہلے اسکین کرلیں۔

(2) **فیشنگ** (Phishing): موجودہ دور میں سب سے زیادہ آن لائن یا سائبر فراڈ کے واقعات فیشنگ کے ذریعے ہوتے ہیں جب آپ کو کسی بیرونی ملک سے متاثر کن نام رکھنے والی کمپنی یا ادارے کی جانب سے ای میل موصول ہوتا ہے کہ "مبارک ہو! آپ نے لاٹری جیت لی" آپ اس ای میل کو کھولتے ہیں اور اسکرین پر آپ کے نام سے لاٹری ٹکٹ کی ایک تصویر سامنے آتی ہے ساتھ ہی اس کے جیتنے کی خوشخبری بھی سنائی جاتی ہے اور آپ اسے پڑھ کر خوشی سے پھولے نہیں سماتے اور ای میل میں موجود لنک پر کلک کرتے ہیں اور نظر آنے والی ونڈو جو ایک فارم کی شکل میں ہوتی ہے اس میں درج سوالوں کے جواب دیتے ہوئے آپ اپنی ساری ذاتی معلومات، بینک اکاؤنٹ نمبر، IFSC کوڈ، موبائل نمبر وغیرہ ویب سائٹ کو فراہم کرتے ہیں جس کے ذریعے دھوکہ دھڑی کرنے والے افراد یا ادارے اس معلومات کا غلط فائدہ اٹھاتے ہوئے نقصان پہنچاتے ہیں۔

احتیاط: یاد رکھیے کسی لاٹری میں حصہ لیے بغیر آپ اسے جیت نہیں سکتے، ایسے پیغامات کا بھروسہ مت کیجیے جن میں بہ ظاہر غلطیاں نظر آتی ہوں، ہمیشہ ای میل بھیجنے والے کا ای میل ایڈریس جانچ لیجیے لاٹری ایجنسیاں فری میل سرور سے ای میل نہیں کرتیں، اس کے بعد بھی اگر آپ کو یہ پیغام سچ لگتا ہو تو سرچ انجن کے ذریعے لاٹری، ایجنسی کا پتہ اور فون نمبر وغیرہ جانچ لیجیے، اگر آپ نے اپنی بینک کی تفصیلات شیئر کرلی ہیں اور یہ احساس ہوگیا کہ یہ غلط تھا تو فوراً بینک سے رابطہ کیجیے اور ادائیگی رکوادیجیے۔

(3) **ای میل اسپوفنگ** (Spoofing): بظاہر مستند نظر آنے والے ذرائع سے ملنے والا ای میل جس میں آپ کی ذاتی معلومات پوچھی جاتی ہیں اور معلومات فراہم

کرنے پر آپ کو پتہ لگتا ہے کہ آپ کے کمپیوٹر کی اہم فائلس غائب یا لاک (Lock) ہوگئیں ہیں اور آپ کے کمپیوٹر اسکرین پر ایک میسیج نظر آتا ہے کہ فائلس کو دوبارہ حاصل کرنے یا اَن لاک (Unlock) کرنے کے لیے آپ کو رقم ادا کرنی ہوگی۔ اسے آن لائن تاوان بھی کہا جاتا ہے۔

احتیاط: کسی بھی ای میل میں منسلک (Attach) فائل کو کھولنے سے پہلے چیک کرلیں، اگر بھیجنے والے سے واقف نہ ہوں تو اسے نہ کھولیں، اگر کچھ مشتبہ نظر آرہا ہو تو بھیجنے والے کو دوبارہ تصدیق کے لیے کہیں، اہم فائلوں کے بیک اپ (Backup) رکھیں، اگر پھر بھی آپ اس سے متاثر ہوگئے تو رقم ادا نہ کریں بلکہ کسی ماہر سے رابطہ کریں، اپنے کمپیوٹر کو جدید ترین اینٹی وائرس سافٹ وئیر سے لیس رکھیں۔

(4) **خفیہ کوڈ (پاس ورڈ) کی چوری:** مسلسل غلط پاس ورڈ ڈال کر اور CAPTCHA امیج کے ذریعے ہیکر آپ کے پاس ورڈ کی چوری کرسکتے ہیں۔ ہیکرس آپ کے نام، تاریخ پیدائش اور موبائیل نمبر کے کئی مجموعات، ڈکشنری ورڈس اور ایسے پروگرام جو تمام ممکنہ مجموعات کو استعمال کرتے ہیں یا پھر کی بورڈ پر ٹائپ شدہ معلومات حاصل کرکے پاس ورڈ حاصل کرسکتے ہیں ایسے طریقوں کو Brute-Force Method کہا جاتا ہے جہاں تمام ممکنہ کامبینیشن ایک خاص پروگرام کے ذریعے استعمال کیے جاتے ہیں۔

احتیاط: طویل، محفوظ اور ہر اکاؤنٹ کے لیے علحدہ پاس ورڈ استعمال کریں، جہاں تک ممکن ہوسکے ورچوئل کی بورڈ کا استعمال کریں۔

(5) **درمیانی فرد کا حملہ** (Man-in-the-Middle Attack) **یا وائی فائی ہیکنگ:** کسی ہوٹل، ریسٹورنٹ، شاپنگ مال وغیرہ میں کھلے وائی فائی (Open Wi-Fi) نیٹ ورک کے استعمال میں اس طرح کا خدشہ رہتا ہے جب کوئی درمیانی شخص آپ کے اکاؤنٹ تک رسائی حاصل کرتا ہے اور اس دوران اگر آپ اس غیر محفوظ نیٹ ورک کنیکشن کے ذریعے بینک سے ربط میں ہیں تو آپ نقصان اٹھا سکتے ہیں کیونکہ درمیانی فرد آپ کے اور بینک کے درمیان تبادلہ ہونے والی حساس معلومات حاصل کرسکتا ہے۔

احتیاط: اس بات کو یقینی بنائیے کہ آپ صرف محفوظ وائی فائی کا استعمال کریں، اگر آپ کسی ویب سائٹ پر جائیں تو اس بات کو یقینی بنائیں کہ یہ ایک محفوظ ویب سائٹ ہے یعنی یہ HTTPS ہے، کھلے وائی فائی راؤٹر سے براہ راست نہ جڑیں۔

آپ بھی جرم میں ملوث ہوسکتے ہیں!!! انٹرنیٹ پر مشتبہ سرگرمی میں ملوث ہونا آپ کو مجرم بنا سکتا ہے۔ ہندوستان میں ان جرائم کی تشریح انڈین آئی ایکٹ 2008 میں کی گئی ہے۔ ان جرائم کی سزا انڈین آئی ایکٹ اور انڈین پینل کوڈ کے تحت دی جاسکتی ہے۔ انٹرنیٹ کی خدمات مہیا کرنے والے (انٹرنیٹ سروس پرووائیڈر)، ای میل سروس پرووائیڈر اور ٹیلیکوم آپریٹرس اس بات کے پابند ہیں کہ وہ آپ کی متعلقہ معلومات نفاذ قانون ایجنسی (لا انفورسمنٹ ایجنسی) کو فراہم کریں۔

وائی فائی پاس ورڈ ہیک کرنے کی سزا تین سال اور پانچ لاکھ روپے جرمانہ ادا کرنے تک ہوسکتی ہے، سائبر ہتک عزت -یعنی سماجی رابطے کی ویب سائٹ پر کسی کی تضحیک کرنا، مذہبی جذبات کو مجروح کرنا، کسی خاتون کے خلاف نازیبا الفاظ یا تصاویر کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرنا وغیرہ کی سزا انفارمیشن ایکٹ کے تحت دو تا تین سال کی جیل اور دس لاکھ روپے تک جرمانہ ہوسکتا ہے۔ سائبر فحش نگاری (Cyber Pornography) جس کے تحت فحش تصاویر کھینچنا، ویڈیو بنانا، اسے محفوظ رکھنا، ویب سائٹ پر شائع کرنا اور فحش مواد کو الیکٹرونک ذریعے سے منتقل کرنے کے لیے دو تا دس سال کی سزا اور دس لاکھ روپے تک جرمانہ ہوسکتا ہے۔

آن لائن کن باتوں میں احتیاط ضروری ہے؟

(1) **سوشل میڈیا:** سماجی رابطے کی ویب سائٹ پر انسان جذبات میں آکر اکثر اس طرح کے فراڈ کا شکار ہوجاتا ہے۔ اس لیے اس بات کا دھیان رکھیں کہ ہر سوشل میڈیا سائٹ کا پاس ورڈ علحدہ رکھیں، دوستی کی درخواست (Friend's Request) صرف انہی کی قبول کریں جنھیں آپ جانتے ہیں،، ایسی لنک پر کلک نہ کریں جو غیر معمولی اور مشتبہ ہوں اگر چہ وہ کسی دوست کی طرف سے بھیجی گئیں ہوں، پرائیویسی سیٹنگ چیک کریں اور جو سب سے زیادہ محفوظ ترین آپشن ہو اسے منتخب کریں، ایسی معلومات جو آپ کی کہیں موجودگی کی اطلاع دیتے ہوں انھیں اپنا اسٹیٹس نہ بنائیں مثال کے طور پر ''تعطیلات کے لیے جارہا ہوں''، ''گھر چھوڑ رہا ہوں''، ''گھر پر اکیلا ہوں'' وغیرہ، ایسی پوسٹ نہ کریں جن سے عوامی مسائل پیدا ہوں، حساس سیکیوریٹی معلومات پوسٹ نہ کریں، یاد رکھیے آپ کے ذریعے پوسٹ کیا گیا اسٹیٹس اپڈیٹ، تصاویر، ویڈیو مستقل طور پر سماجی رابطے کی سائٹ پر موجود رہتے ہیں چاہے آپ نے انھیں ڈیلیٹ کیوں نہ کردیا ہو۔

(2) **ای کامرس اور تجارتی ویب سائٹ پر احتیاط:** کسی بھی ای کامرس، آن لائن شاپنگ پورٹل پر خریداری سے قبل اس ویب سائٹ یا پورٹل کی تحقیق کرلیں، ویب سائٹ پر موجود دیگر استعمال کنندگان کے تاثرات پر نظر ڈال لیں، مختصر لنک والی ویب سائٹ پر کلک نہ کریں مبادہ کوئی وائرس نہ آجائے، اس بات کو یقینی بنائیں کہ ویب سائٹ محفوظ شدہ (انکرپٹیڈ) ہے اور اس پر پیڈ لاک نشان (ویب سائٹ کے نام سے قبل مربع میں ایک تالے کا نشان) نظر آرہا ہے، ای کامرس ٹرانزیکشن کے بعد اپنے بینک اسٹیٹمنٹ کی جانچ کرلیں اور کسی بھی شک وشبہ کی صورت میں متعلقہ بینک سے فوراً رابطہ کریں۔

(3) **دیگر حفاظتی اقدامات:** اپنے کمپیوٹر پر جدید ترین اینٹی وائرس سافٹ وئیر انسٹال کریں اور وقتاً فوقتاً اسے اپڈیٹ کرتے رہیں، مدت کار ختم ہونے سے قبل ہی اس کی تجدید کرالیں، اپنے کمپیوٹر میں لائسنس شدہ آپریٹنگ سسٹم ہی استعمال کریں، اپنے کمپیوٹر کی ہارڈ ڈسک میں موجود معلومات کو ان کرپٹ (پاس ورڈ کے ذریعے محفوظ کرنا) کریں تاکہ اگر کسی وجہ سے کسی اور کے ہاتھوں لگ بھی جائے تو وہ اس کا غلط فائدہ نہ اٹھا سکیں، فائر وال (کمپیوٹر پر آن لائن آنے جانے والی معلومات کی ترسیل کی اجازت دینے والا کنٹرول سسٹم) کو ہمیشہ قابل عمل رکھیں۔ کچھ اینٹی وائرس سافٹ وئیرس میں بھی فائر وال کی سہولت دستیاب ہوتی ہے۔

(4) **اسمارٹ فون کی حفاظت:** اپنے اسمارٹ فون کا پاس ورڈ یا پن (PIN) محفوظ ترین اور ایسا رکھیں جو آسانی سے اندازہ نہ لگایا جاسکتا ہو، صرف موبائیل کے آپریٹنگ سسٹم کے مارکیٹ اسٹور سے ہی سافٹ وئیر اور اپلیکیشنز ڈاؤن لوڈ کریں کیونکہ ان کی سیکیوریٹی کو یقینی بنایا جاچکا ہوتا ہے، کسی بھی اپلیکیشنز کو خود بخود انسٹال ہونے کے آپشن سے روکیں، انسٹال کرنے سے قبل کم سے کم ضروری اجازت کی جانچ کرلیں، ایسے ہی اپلیکیشن انسٹال کریں جن کے لیے اجازت ضروری ہے، اپنے اسمارٹ فون میں سیکیوریٹی اور چوری سے بچانے والے (Anti theft) اپلیکیشن ضرور رکھیں۔

مذکورہ بالا باتوں پر عمل کرنے کے علاوہ دیگر احتیاط اور بہ وقت ضرورت ٹیکنالوجی کا استعمال نہ صرف ہمیں وقت کے ضیاع سے بچاتا ہے بلکہ ہماری صلاحیتوں کو زیادہ سے زیادہ بروئے کار لانے میں بھی مددگار ہوتا ہے۔

نوٹ: اس مضمون کی تیاری میں مہاراشٹر گورنمنٹ کے کتابچے ''سائبر سیکیوریٹی بیداری'' سے استفادہ کیا گیا ہے۔

■

Momin Faheem Ahmad Abdul Bari, 441, Nw Gauri Pada, New Sahil Hote, Bhiwandi - 421302 (Maharashtrra)

سینی ٹیشن اور اُس کی دشواریاں

جمال نصرت

صفائی صحت کے لیے ضروری ہے۔ صفائی ہے تو صحت ہے۔ صحت ہے تو ترقی ہے۔ ترقی ہے تو خوشی ہے۔ یہ بات گھر، باہر، صوبے اور ملک سب کے لیے درست ہے۔ انجیل میں صاف درج ہے کہ ''صفائی ہے تو خدائی ہے۔''

Sanitation سینی ٹیشن یعنی ہوش مندی کی صفائی۔

شہری علاقوں میں سینی ٹیشن کا انتظام مناسب نہیں ہے اور قصبوں میں بھی خراب ہے۔ یو این او UNO نے 2008 میں یہ عہد لیا تھا کہ 2015 تک ہوشمندی کی صفائی میں خاطر خواہ بہتری آئے گی اور اس سال کو عالمی صفائی کے سال کا نام دیا تھا۔ اتنا وقت گزر چکا ہے مگر ہمارے ملک میں تھوڑے بہت بدلاؤ کے ساتھ حالات ویسے ہی ہیں۔ اس کی اصلی وجہ آبادی ہے۔

دنیا کی آبادی 7. ارب ہے اور ہماری 1.25 ارب۔ جس طرح دنیا کے گھنے آبادی والے ملک یہ طے نہیں کر پائے ہیں کہ غلاظت کو ہٹانے کا کون سا خاص طریقہ ہو اسی طرح ہم بھی اس کی تلاش میں ہیں۔ غلاظت دو طرح کی ہے ٹھوس یا بھوری اور رقیق یا پیلی۔ غریب ملکوں کی پریشانیاں اور بھی زیادہ ہیں کیونکہ ان کے یہاں اس کام کی ترجیح کم ہے اور اس مد میں پیسہ بھی کم ہے۔ اس کام کو اگر ٹکڑوں میں دیکھیں تو سب سے پہلے یہ بلا ناغہ ہونا ہے، غلاظت کو جمع کرنا۔ اس کو پائپ یا گاڑیوں سے لدوا کر بھیجنا۔ اس کا معقول انتظام کہ کھاد بنے اور صفائی رہے اور کسی قسم کی بیماری نہ پھیلنے پائے۔ یہاں یہ بات خاص ہے کہ 50% سے زیادہ بیماریاں گندے اور آلودہ پانی سے پھیلتی ہیں۔ انھیں بیکٹیریا یا جراثیم بدبو، کیڑے اور ان کے انڈے ہوتے ہیں۔ یہ سب کام اس وقت کرنا ہے جب کہ پانی کی کمی ہے اور اس پانی کو نکالنے، اٹھانے اور پہنچانے کے لیے پمپ چلانا ہے جس کے لیے بجلی بھی کم ہے۔ یہ مصیبت روز بروز گہری ہوتی جارہی ہے کیونکہ لوگ روٹی کپڑا اور کام کے لیے گاؤں کو چھوڑ کر شہروں کا رخ کرتے جارہے ہیں۔

سینی ٹیشن کے لیے علاقائی، تہذیبی، ثقافتی، مذہبی اور پسند، ناپسند بھی ایک مسئلہ ہے۔ شرم، حفاظت، عزت آبرو وغیرہ کی وجہ سے اس کو حل کرنے میں آرہی دقتیں اور بڑھ گئی ہیں۔ گھر، اسکول، دفتر، ہال، مال، بازار، ہوٹل، ریل، ہوائی جہاز وغیرہ کی الگ الگ ضرورتوں کے لیے ان کا انتظام بھی پیچیدہ ہوگیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مردوں اور عورتوں کے لیے الگ الگ انتظام بھی ہونا ہوتا ہے۔

دنیا کے قریب 50 ملک اور 180 جماعتیں اس کام میں لگی ہوئی ہیں جن میں یو این، یونی سیف، یونیسکو، ڈبلو بی، یا عالمی بینک اور ڈبلو ایچ او (UN, UNICEF, UNESCO, WB, WHO) اہم ہیں۔

2008 میں صفائی کے جو کوڈ یا اصول بنائے گئے تھے ان کو ہی سب جگہوں تک نہیں بھیجا جا سکا ہے۔ یہ کوڈ ہیں:

-1 غلاظت کا انتظام بلا ناغہ حفاظت سے ہو۔

-2 کھلے میں نہ جا کر اجابت خانے میں جایا جائے۔

-3 اجابت خانے سے آنے پر ہاتھوں کو بہت اچھی طرح صابن سے دھویا جائے اور بچوں کو بھی معقول ٹریننگ دی جائے۔

-4 صاف پانی کو ہمیشہ ڈھک کر رکھا جائے۔

-5 کھلا کھانا تو بیماری کی جڑ ہے۔ اسے ڈھک کر رکھیں۔

-6 رکھا ہوا کھانا ہمیشہ گرم کر کے ہی استعمال میں لائیں۔

-7 گھر کے دوسرے کوڑے کو بھی جلدی سے جلدی مناسب جگہ پر بھیجا جائے۔

-8 لوگوں کو صفائی کی تعلیم اور تربیت برابر دی جائے۔

یہ سب کوڈ اسی لیے ہیں کہ صحت کا خیال ہو۔ تہذیب اور ماحولیات کی بھی معقول پاسداری ہو۔ لیکن فنڈ اور بچت کو بھی حد میں رکھا جائے۔ عالمی جماعتوں نے کچھ تجاویز دی ہیں جن میں چند اہم یہ ہیں۔

تجاویز:

-1 ایک آدمی کی ایک روز کی پانی کی ضرورت 150 لیٹر مانی گئی ہے مگر یہ بھی زیادہ ہے۔ اسے 50 لیٹر تک محدود کیا جائے۔

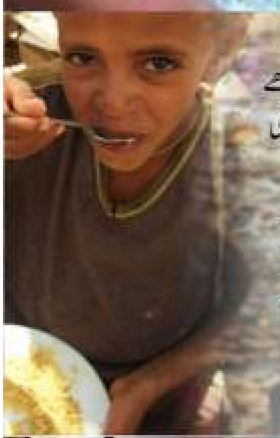

-2 نئے قسم کے فلش میں ساڑھے تین لیٹر پانی لگتا ہے اسے بھی گھٹانے کی کوشش کی جائے۔

-3 ایک نیا طریقہ یہ بھی ہے کہ فلش میں ایک ہوا کا پمپ بھی لگوایا جائے جس سے ساڑھے تین لیٹر کی جگہ صرف ڈیڑھ لیٹر پانی اور ہوا سے کام لیا جائے جیسا کہ ہوائی جہاز میں ہوتا ہے۔

-4 بنا پانی والے پاٹ بھی رائج کیے جائیں جن میں صرف ہوا اور کاغذ ہوتا ہے۔ یہ ہماری تہذیب کے خلاف ہے اس سے ممکن نہ ہوگا اور ان کی قیمت بھی زیادہ ہے۔

-5 سلبھ، شوچالیہ، جس کے بانی بندیشور پاٹھک جی ہیں۔ اس میں ایک کی جگہ دو سوک پٹ بنائے جاتے ہیں۔ جب ایک بھر جائے گا تو دوسرا کام میں لایا جائے گا۔ پہلے والے کو ایک خاص مدت کے بعد کھاد کے لیے لیا جائے گا۔ گیس پائپس سے بدبو دور کر کے کام میں لیا جائے گا اور غلاظت کو کھاد میں بدل کر استعمال میں لیا جائے گا۔ یہ خود کفیل ہوں گے اور مرمت وغیرہ کا خرچ بھی آمدنی سے ہی اٹھائیں گے۔ ان کی لاگت کم ہے اور کامیاب بھی ہیں۔

قریب کی مٹی اور پانی کو آلودگی کے لیے برابر ٹیسٹ کرانا ہوگا۔ اس میں احتیاط کی بہت ضرورت

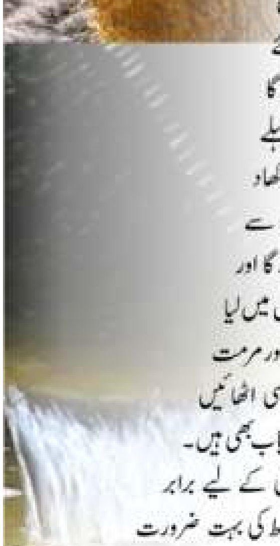

ہے۔

6- سویڈن میں ایک انجینئر نے ایک پلاسٹک کا تھیلا بنایا ہے جس میں ایک کیمیا کی پالش کی جاتی ہے جس سے جراثیم فوراً مرجاتے ہیں۔ یہ تھیلا "14"x6 کا ہے اور (Ecoflex) ایکو فلیکس کے نام سے قریب تین روپیوں کا ملتا ہے۔ اس کو ایک چھوٹے ڈبے میں رکھ دیا جاتا ہے اور بھوری اشیا اس میں جمع کردی جاتی ہیں۔ پیلی اشیا دوسرے ڈبے میں جمع کر کے سیدھے فروخت کردی جاتی ہیں۔ یہ تھیلا استعمال کے بعد قریب ایک روپے کا واپس ہو جاتا ہے۔ ان تھیلوں سے پھر کھاد بنالی جاتی ہے۔ پالش کی وجہ سے ان تھیلوں میں کسی قسم کی بدبو بھی نہیں ہوتی۔ پیلی اشیا منرل پانی کے دوگنے نرخ پر فروخت ہوتی ہے۔ یہاں ایک بات اہم ہے کہ جس طرح صابن ملے پانی کو صاف کرنا اور اسے کھیتی کے لیے استعمال کرنا دشوار طلب ہے کیونکہ صابن کی صفائی مشکل ہے اور صابن فصلوں کے لیے نقصاندہ بھی ہے۔ اسی طرح پیلی اشیا میں فاسفورس ہوتا ہے وہ کھاد کے لیے مناسب نہیں ہے اور دوسرے (Sewage Plant) سیوج پلانٹ کی کارکردگی میں دشواریاں پیدا کرتا ہے۔

7- اگر بھوری اشیا الگ ہوں گی تو غلاظت سے پانی سکھانے کا کام آسانی سے ہو سکتا ہے مگر موجودہ صورت میں دونوں اشیا کا الگ الگ رکھنا اور اس کی طرح تھیلوں کا استعمال ملک میں ہو پانا مشکل ہے۔ ہاں بڑے ہالوں اور مال وغیرہ میں پیلی اشیا الگ جمع کرنے کا کام کیمیا والے کرسکتے ہیں۔ ویسے یہ کام امیزن ندی کے کنارے کی کھلی زمین اور جنگلوں میں کیا جارہا ہے۔

دوسری تنظیموں نے بہت سے تجربات کیے ہیں، لیکن مشورہ ہے کہ سب سے کامیاب وہ طریقہ ہوگا جو اس علاقے کے لوگوں کو راحت دے اور وہاں ملنے والی چیزوں کو استعمال میں لایا جاسکے اور لوگوں کی مرضی کا بھی ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ ماحول آلودہ نہ ہو، صحت کو کسی قسم کا خطرہ نہ ہو۔ لوگوں کو آرام سہولت، ملے، اور یہ بھی کہ خرچ کم ہو۔

سینی ٹیشن کو عملی جامہ پہنانے میں جو دشواریاں ہوں گی ان میں یہ اہم ہیں:

دشواریاں:

* پانی تو ویسے ہی کم ہے زیادہ صفائی کے لیے پانی کہاں سے آئے گا۔
* پانی لانے اور اسی پانی کو دوبارہ استعمال کرنے کے لیے بجلی کی ضرورت ہوگی جو پہلے سے ہی کم ہے۔
* غلاظت کو ہٹانا، چاہے پائپ سے یا گاڑی سے اور وہ بھی جلد از جلد اور اس کام میں آنے والی دشواریاں، خاص مسئلہ صحت کا ہے۔
* پیلی اور بھوری اشیا ایک ساتھ ہی آتی ہیں اور پھر ان کو نہ ملنے دینا اور الگ الگ رکھنا اس سلسلے میں ایک خاص بات یہ بھی کہی گئی ہے کہ یہ ہمارے جسم میں بھی ایک دوسرے سے نہیں ملتیں اور دونوں کے اخراج کے راستے بھی ہر جاندار میں الگ الگ رکھے گئے ہیں۔ یہ ہمارے دستور اور مزاج کے خلاف بھی ہے۔
* اس انتظام میں بہت خرچ آئے گا اور اگر لوگ شامل نہ ہوئے تو مصیبت ہوگی۔ ملک کے کچھ حصے میں سب کچھ کیا گیا مگر لوگوں نے کھلے میں ہی اجابت کے لیے جانے کو ترجیح دی۔
* سیوج پلانٹ کو بنوانا، اس کا خرچ، اس کے لیے جگہ، اور پلانٹ کا مناسب رکھ رکھاؤ کہ یہ خراب نہ ہو۔ فاضل یا الگ دوسرا اپنانا تو اور مشکل ہوگا۔
* ماحول کو درست رکھنا۔ کتنی بھی کوشش کی جائے کچھ نہ کچھ اثر تو پڑتا ہے۔
* کسی قسم کی بیماری پھیلنے سے اس کے تعلق سے دوائیں، اور انتظام۔
* کیمیا کا چھڑکاؤ اور حفاظتی اقدام اور اس میں اضافی خرچ۔
* زمین اور جنگل ویسے ہی کم ہیں اور پلانٹ کے لیے زمین کا ملنا اور وہاں آبادکاری کو گھنا ہونے سے روکنا۔
* اجابت خانوں میں مراقی لوگوں کا ضرورت سے زیادہ پانی کا استعمال۔
* دو قسم کے پانی کے لیے دو قسم کی نالیاں اور لوگوں کو اس بارے میں بتانا۔
* ہر نئے کام میں لوگ مخالفت کرنے لگتے ہیں، یہ تو نجی راحت سے تعلق رکھتی ہے۔ شروع شروع میں دشواریاں تو ضرور آئیں گی۔
* صفائی کے بارے میں لوگوں کو تعلیم اور تربیت دیا جانا۔ یہ بھی قابل ذکر ہے کہ ہر نیا طریقہ رواج اور مذہب کے خلاف ہوتا ہے۔
* اجابت خانوں کا آرام دہ، اور کم قیمت میں بن بھی جانا۔ ویسے ان کا خرچ گھر کے کسی بھی دوسرے کمرے کے مقابلے میں بہت زیادہ ہوتا ہے۔
* اس کام سے جڑے اسٹاف کا کسی بھی حالت میں ہڑتال پر جانے سے روک اور اس کی مشکلیں۔
* مندر، مسجد اور اسپتالوں میں تو ان کی حالت اچھی ہونی چاہیے مگر افسوس وہاں بھی حالت بہت خراب ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

سینی ٹیشن بہت اہم اور بہت ضروری ہے۔ یہ ہماری صحت اور ملک کی صحت سے جڑا ہے۔ اس سلسلے کے کچھ حل اس طرح ہو سکتے ہیں۔

حل

1- لوگوں کو سنجیدگی سے اہمیت بتا کر تعلیم اور تربیت دی جائے۔ اخلاقی رہنماؤں سے بھی اور مذہبی گروہوں سے بھی مدد درکار ہوگی۔ ان کو خود بھی بتانا ہوگا۔

2- شہروں میں بے روک ٹوک بسنے پر پابندی ہو کیونکہ تھوڑے آدمی پورے سسٹم کو خراب کرسکتے ہیں۔

3- سلبھ شوچالیہ قسم کے اجابت خانے زیادہ سے زیادہ بنوائے جائیں اور کھلے میں جانے پر روک ہو۔ کچھ لوگ پورے ماحول کو آلودہ نہیں کرسکتے۔

4- پانی کے دوبارہ استعمال پر احتیاط ہو۔ بیجا صفائی کا مراق کم ہو۔

5- پانی کو زمین کے اندر بھیجا تو جائے مگر ان جگہوں پر نہیں جہاں سوک پٹ ہوں۔ زمین کے پانی کو آلودگی سے بچایا جائے اور اس کی برابر جانچ بھی کرائی جائے۔

6- صحت کے اصول بھی لوگوں کو معلوم ہوں اور علاقے کے لوگوں کو دوا اور چھڑکاؤ کی جانکاری ہو۔ ایسا نہ ہو کہ مچھروں سے تو کچھ نہیں ہوا مگر ان کو مارنے والی دواؤں نے بیمار کردیا۔

7- کہاں پر ہینڈ پمپ نہیں لگوانا ہے کہ جانکاری اچھی طرح سے ہو۔

8- سیور کی لائن اور پانی کی لائن اکثر ایک دوسرے کے اوپر نیچے سے جاتی ہیں ان خاص صورتوں سے بچنا اور اگر مجبوری ہو تو پھر پوری ہی نہیں خاص احتیاط کا کیا جانا۔

9- پیڑ اور جنگل لگانا جس سے آلودگی کو کم کیا جاسکے۔

10- ایک ہی اصول اور ایک ہی طریقہ ہر جگہ کے لیے معقول نہیں ہوتا۔ اس لیے مقامی لوگوں کی بھی رائے لینا۔ کبھی سورج پلانٹ، کبھی سوک پٹ، کبھی چھوٹا کبھی بڑا۔

11- عموماً سینی ٹیشن کے مد میں بجٹ کا ایک بہت چھوٹا حصہ رکھا جاتا ہے جبکہ یہ بہت اہم کام ہے۔ اگر یہ سہی ہوگا تو بیماریاں کم ہوں گی اور صحت اچھی ہوگی۔ اس کا بھی خیال رکھا جانا ضروری ہے۔

■

Prof. Jamal Nusrat
Roshni, 509/148, Old Hyderabad
Lucknow - 226007 (UP)
Mob.: 9415029050

راج کپور

ف س اعجاز

پیدائش: 14 دسمبر 1924 پیشاور (غیر منقسم ہندوستان)، موت: 2 جون 1988، دہلی (سبب: حملۂ قلب اور گردوں کی ناکامی)

موت اور آخری انعام راج کپور کے لیے ایک ساتھ پہنچے۔ مئی 1988 کی بات ہے۔ صدر جمہوریہ شری وینکٹ رمن سے دہلی میں دادا صاحب پھالکے ایوارڈ حاصل کرنے سے قبل ہال میں بیٹھے بیٹھے راج کپور کو دمہ کا دورہ پڑا اور ایوارڈ لیتے ہی وہ آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز میں داخل کر دیے گئے جہاں ایک ماہ زندگی اور موت کی کشمکش کے بعد 2 جون 1988 کو انتقال فرما گئے۔

راج کپور لوگوں کے چہیتے اداکار تھے اور باذوق فلم بینوں میں اپنی تکنیکی صلاحیتوں، ترقی پسندی، اور کہانی کے موضوع کے ساتھ کامیاب برتاؤ کی وجہ سے بے حد مقبول تھے۔ وہ ایک منجھے ہوئے اداکار ہی نہیں زبردست خلاقانہ صلاحیت رکھنے والے فن کار تھے۔ جتنا کچھ راج کپور ہمیں دے گئے اُس سے سوا اور اس سے بہتر دینے کا ارمان ان کے دل میں تھا۔

ایک کلیپر بوائے (Clapper Boy) سے لے کر ہیرو بننے تک کا سفر انھوں نے بڑے پُر پیچ راستوں سے طے کیا اور ہیرو کا مقام حاصل کرنے سے پہلے سنیما تکنیک کے ہر ہر پہلو پر دسترس حاصل کر لی تھی۔ اس علم نے بعد میں اداکاری، ہدایت کاری، منظر نامہ نگاری، صدا بندی، ادارت، موسیقی اور فوٹوگرافی کے شعبوں میں اُن کی بہت مدد کی۔ اپنے والد پرتھوی راج کپور یا اساتذہ کیدار شرما اور وی شانتا رام وغیرہ کے لیے راج کپور ساری عمر ایک سعادت مند بیٹا اور شاگرد ہی بنے رہے۔ اور پرستاروں کی نیک خواہشات کے علاوہ باپ اور بزرگوں کی دعاؤں کے طفیل دولت اور عظمت بیک وقت حاصل کرتے رہے۔

راج کپور نے جب پورا ہوش سنبھالا اور 'آگ' اور 'آہ' فلم کے تجربوں کے ناکام پہلوؤں پر غور کیا تو اپنی اداکاری اور ہندوستانی فلم سازی میں ایک نئی طرز کو جنم دیا جسے فلمی تجارت میں فارمولا کہتے ہیں اور جس کی بدولت بعد میں انھیں ہندی فلمی صنعت کے 'شومین' کا لقب دیا گیا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ 'فارمولا' اور 'شومین' سنجیدہ کام کرنے والوں کے لیے یہ کچھ غیر مناسب اور محض تجارتی اصطلاحیں ہیں۔ کیونکہ فلسفہ فارمولا نہیں ہوتا اور زندگی کو زندگی کی طرح پیش کرنا 'شومین شپ' یا دکھاوا نہیں بلکہ آرٹ ہے۔ راج کپور کو شومین کہنا ایک طرح سے عظیم فلم ساز و اداکار کی ذہانت کو پس پشت ڈال دینا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ راج کپور نے اپنے تئیں شومین نہیں کہلانا چاہا بلکہ اپنے کیریئر کے ذریعے یہ بتانا چاہا ہے کہ یہ دنیا 'شو ورلڈ' ہے۔ یا بقول شیکسپیئر دنیا ملنے اور بچھڑنے کا اسٹیج ہے۔

راج کپور نے اداکاری کو تخلیق کیا، اسے پہنایا اوڑھا نہیں۔ ان کا جوتا جاپانی، پتلون انگلستانی اور ٹوپی روسی ضرور تھی لیکن ان کا دل ہندوستانی ہی تھا۔ جب انھیں یہ ادراک ہوا کہ ہندوستان کے لاکھوں اور کروڑوں معصوم اور ناخواندہ لوگوں سے ان کا واسطہ پڑنے والا ہے اور ان کے دلوں میں انھیں گھر کرنا ہے تو سب سے پہلے انھوں نے اپنے ہم وطنوں کی سادگی اور معصومیت پر غور کیا۔ پھر اس پر غور کیا کہ کس طرح وہ خود کو اور اپنی فلموں کو ان سادہ لوح عوام کے لیے قابل قبول بنائیں۔ انھوں نے ضرور یہ سوچا ہوگا کہ وہ اپنی فلموں میں آج کے 'سپر مین' کے برخلاف پردۂ فلم پر ایک معمولی انسان کے روپ میں نظر آئیں گے تو عوام ان کے بارے میں پُر مسرت ہو کر کہیں گے کہ "یہ ہم میں سے ایک ہے۔ اور ہمارے جیسا ہے"۔ راج کپور کو اپنے ناظرین کی مسرت اور محبت سے اٹوٹ رشتہ قائم کرنا تھا۔ اس کے لیے انھوں نے اپنی ذہانت کو بروئے کار لا کر مشہور زمانہ مزاحیہ اداکار چارلی چپلن کے انداز کی ٹوپی اور پتلون کا استعمال کرنا شروع کیا۔ یہ استعمال اس وقت بہت مقصدی اور تخلیقی ثابت ہوا۔ راج کو کردار کی باطنی سادگی اور معصومیت کے اظہار کے لیے ایک موثر لباس مل گیا جسے آج اُن کی ایک لازمی پہچان قرار دیا جاتا ہے۔ یہی لباس جب کامیڈین نور محمد چارلی نے ٹھیک چارلی چپلن کی نقالی کے لیے استعمال کیا تو وہ انھیں چپلن کے نقال کی حیثیت سے تو مشہور کر گیا لیکن نور محمد چارلی کے کردار میں کوئی مستقل اور دیرپا تخلیقی رنگ نہیں بھر سکا۔ دوسری طرف راج کپور نے چارلی چپلن سے مستعار لی ہوئی ٹوپی اور پتلون کے بغیر بھی سادگی اور معصومیت کا راست اظہار 'جاگتے رہو' اور 'تیسری قسم' فلموں میں انتہائی کامیابی سے کیا ہے۔ ان فلموں میں وہ دھوتی پہنے ہوئے گنوار نظر آتے ہیں۔

رومانس اور راج کپور!..... اس موضوع کا ذکر راج کپور کے حوالے سے 'برسات' فلم سے لے کر آج تک ہوتا چلا آ رہا ہے۔ حالانکہ خود راج کپور کو رومانس کے ذکر سے زیادہ پردۂ فلم پر دکھائے جانے والے رومانس کی فکر رہا کرتی تھی۔ انھوں نے ایسے ہیرو اور ہیروئن تخلیق کیے جو لوگوں کا خواب اور آئیڈیل ہوتے ہیں۔ جوان، خوبصورت، ایک دوسرے پر فدا ہونے اور مر مٹ جانے والے، دیوار دولت کو محبت کے بیچ سے گرا دینے والے، دنیاوی رسم اور مصلحت کی حدوں کو پار کرنے والے ہیرو اور ہیروئن۔ لاکھوں کروڑوں نا آسودہ نوجوانوں کے دلوں کا ارمان کہ وہ کسی کو چاہیں اور خود انھیں چاہا جائے۔ اس خواب کے پورا ہونے سے تسکین و مسرت اور ناکام ہونے سے حزن و ملال کی کیفیت کو پردۂ فلم پر راج کپور نے دیدنی بنا کر پیش کیا۔ راج کپور نے پیار کرنے والوں

کے جذبۂ محبوبیت کو سمجھا تھا۔ اور محبتیں جی کر اپنے کردار نبھائے تھے۔ ادھوری محبت زندگی میں افسانوی رنگ بھر دیتی ہے۔ راج کپور نے نرگس کے ساتھ اپنے نشاط قرب کو فلم میں منتقل کیا اور پھر برسات، آوارہ، شری 420 کے بعد اپنی ناکام اور کھوئی ہوئی محبت کی بازیافت میں سرگرداں رہے۔ سنگم، جس دیش میں گنگا بہتی ہے وغیرہ میں انھوں نے بھرپور نسائیت ضرور دکھائی لیکن نرگس کی محبوبانہ نرگسیت کو وہ دوبارہ پیش نہ کر سکے۔ حالانکہ ان کی یہ کھوج برابر جاری رہی۔ ڈمپل کپاڈیہ کے چہرے میں نرگس سے تھوڑی سی مشابہت ان کی فلم 'بوبی' میں کسی حد تک کام بھی آئی اور 'بوبی' سے بہ حیثیت پروڈیوسر انھوں نے بے پناہ دولت کمائی لیکن اس کھوئے ہوئے چہرے کا انبساط وہ کبھی نہ پا سکے جو ایک دفعہ زندگی میں آ کر غائب ہو چکا تھا اور بعد میں انھیں ٹکڑا ٹکڑا تو ہر کہیں ملتا رہا لیکن مجسم ایک شکل اور ایک روپ میں دوبارہ میسر نہ ہوا۔ اگر ''میرا نام جوکر'' کے بعد آر کے فلمز کے ہیرو نہ بدل گئے ہوتے تو لوگوں کو اس کا احساس بہتر طور پر ہوتا اور اس کا نفسیاتی ردِعمل یقیناً ظاہر ہوتا۔ مگر راج کپور نے اچھا کیا کہ 'میرا نام جوکر' کے بعد لوگوں پر اپنے آپ کو تھوپا نہیں۔ اور یہ بھی اچھا ہوا کہ انھیں اپنی بڑھتی ہوئی عمر کا احساس ہو گیا اور اس کے بعد انھوں نے کیرکٹر رول نبھانا شروع کر دیے، جن کے لیے ان کی ایک دم سے سنجیدہ ہو جانے والی شخصیت خوب کام آئی حالانکہ 'کل آج اور کل'، 'دھرم کرم' وغیرہ کے سنجیدہ رول کے علاوہ 'دو جاسوس' میں کافی دلچسپ اور تفریحی رولز ادا کیے۔

راج کپور میں تازگی اور نئے پن کے لیے ایک زبردست للک پائی جاتی تھی۔ گرچہ ان کی ہر فلم محبت کے تھیم پر بنتی تھی لیکن ہر محبت کے پس منظر میں ایک جیتا جاگتا اور سچا ماحول ایک نہ ایک سماجی پرابلم کے ساتھ ضرور دکھایا جاتا تھا۔ آوارہ اور شری 420 میں یہ خصوصیات واضح ہیں جن میں محبت کے پس منظر میں سوسائٹی کے گرے ہوئے اور مفلس بنائے گئے لڑکوں کی نفسیات کو اجاگر کرنے کے لیے طبقاتی کشمکش کو سیلولائڈ پر کامیابی سے دکھایا گیا۔ ان دو فلموں نے راج کپور کو سوشلزم فلم ساز کے طور پر روس میں زبردست مقبولیت دلا دی۔ ہر چند کہ راج کپور کی فلموں میں سماجی شعور کی کارگذاری کو صرف اُن کی اپنی اپج نہیں کہا جا سکتا۔ وہ بیشتر خواجہ احمد عباس کے قلم کی دین تھی جن کی طرزِ فکر سے راج کپور ذہنی طور سے ہم آہنگ تھے۔ 'میرا نام جوکر' واقعی خواجہ احمد عباس کا ایک تحریری کرشمہ تھی۔

یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ خواجہ احمد عباس خود اپنے لیے کامیاب تجارتی فلمیں کیوں نہیں بنا سکتے تھے۔ عباس صاحب بھی مانتے تھے کہ وہ خود اپنی کہانی پر اتنی کامیاب فلم نہیں بنا سکتے تھے۔ وہ معترف تھے کہ سنیما کی مصلحتیں سمجھنے کے باوجود وہ اپنے آپ کو اس کی مصلحتوں میں نہیں ڈھال پاتے تھے۔ 50ء اور 60ء کے دہوں میں ترقی پسند ادب پورے شباب پر تھا۔ اسی دور میں راج کپور نے ترقی

راج کپور میں
تازگی اور نئے پن
کے لیے ایک زبردست للک
پائی جاتی تھی۔ گرچہ ان کی
ہر فلم محبت کے تھیم پر بنتی تھی
لیکن ہر محبت کے پس منظر میں ایک
جیتا جاگتا اور سچا ماحول ایک نہ ایک
سماجی پرابلم کے ساتھ ضرور دکھایا
جاتا تھا۔ آوارہ اور شری 420 میں یہ
خصوصیات واضح ہیں جن میں محبت
کے پس منظر میں سوسائٹی کے گرے
ہوئے اور مفلس بنائے گئے لڑکوں کی
نفسیات کو اجاگر کرنے کے لیے
طبقاتی کشمکش کو سیلولائڈ
پر کامیابی سے
دکھایا گیا

پسند نظریات کا خوبصورت تجارتی استعمال کیا مگر عباس صاحب یہ کام خود نہ کر سکے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ بعض آپریشن مریض کو بے ہوش یا سُن کرنے کے انجکشن لگانے کے بعد کرنا پڑتے ہیں، وہ راست آپریشن کرنے لگتے تھے۔ لہٰذا ان کی فلمی پیشکش کو اشتراکی پروپگنڈا سمجھ لیا جاتا تھا۔ راج کپور فلم بنانے کے دوران کسی ایک طبقے کو نہیں بلکہ مجموعی طور پر عام لوگوں کو ذہن میں رکھتے تھے۔ اس لیے تفریح اور رومانس کے ذریعہ سنیما بینوں کو پہلے ایک NEUTRAL نقطے تک لاتے تھے پھر انھیں وہ کچھ دیتے تھے جس کے لیے فلم بنانا ہوتی تھی۔ راج کپور نے اپنی فلموں میں طبقاتی کشمکش کو موثر ڈھنگ سے دکھایا ہے۔ لیکن انھوں نے پیغام کو پروپگنڈا نہیں بننے دیا۔ عباس صاحب اور راج کپور کی ترقی پسندی میں یہی فرق تھا۔ عباس صاحب سوچتے تھے کہ سوشلزم کا فرض کہاں ادا ہوتا ہے، راج کپور سوچتے تھے کہ نظریہ قبول کہاں اور کس حد تک ہوتا ہے؟۔ عباس صاحب اور ان جیسے کئی ڈائرکٹر فلمیں تیار کرتے وقت ناظرین کی کم اور ایوارڈوں کی زیادہ سوچتے تھے۔ 'چار دل چار راہیں' عباس صاحب کی ایک مقصدی ملٹی کاسٹ فلم تھی جس میں چار ہیروز میں سے مین ہیرو راج کپور تھے۔ مگر پھر بھی فلم تجارتی طور سے ناکام رہی۔ عباس صاحب سوشلزم کی منزل کے لیے سڑک کھودتے رہے اور راج کپور فرہاد کی صورت شیریں کے لیے نہر کھودنے کا کام کرتے رہے۔ شاید راج صاحب ادب کے ناقابلِ عمل حصہ کو فلم سے خارج کر دیا کرتے تھے۔ دستوئفسکی کے روسی ناول 'جرم و سزا' کے مرکزی خیال پر مبنی ہندی فلم 'پھر صبح ہوگی' میں راج کپور سے بڑا فائدہ اٹھایا جا سکتا تھا۔ لیکن اس فلم کا بیشتر حصہ ہیرو کے ارتکابِ جرم اور سزا کے اندیشوں کے مابین ضمیر کی کشمکش اور خیر و شر کے ٹکراؤ کے لیے وقف رہا۔ اس میں شک نہیں کہ راج کپور نے 'پھر صبح ہوگی' میں ایک مجرم کی ذہنی و جذباتی کشمکش کی اداکاری میں حقیقت کا رنگ بھر دیا تھا۔

راج کپور پر اپنی فلموں میں عریانیت کی نمائش کا الزام لگتا رہا۔ اور اگرچہ نیم عریاں مناظر کے لیے راج کپور چند پچویشنز ضرور نکالتے تھے جنھیں کہانی کی ضرورت اور رومانیت کے تقاضوں کی وجہ سے سنسر عام نمائش کے لیے منظور بھی کر لیا کرتا تھا۔ یہ بھی صحیح ہے کہ راج کپور ہر آنے والی فلم میں سیکس کو پہلے سے زیادہ استعمال کرتے گئے۔ سنگم، جس دیش میں گنگا بہتی ہے، میرا نام جوکر وغیرہ میں بعض جنسی مناظر تو غیر ضروری ہی تھے جو ظاہر ہے کہ فلم بیچنے کا حربہ تھے۔ لیکن آج کی فلموں میں عام طور پر واہیات عریانیت کا بول بالا ہے اور مقصدیت ناپید ہے۔

راج کپور کی فلموں میں لوکیشن، کیمرے کے زاویے، سنگیت اور گیت بڑی اہمیت رکھتے تھے۔ سنگیت پر راج کپور کو اچھا خاصا ملکہ حاصل تھا۔ رام کمار گنگولی اور شنکر جے کشن سے لے کر لکشمی کانت پیارے لال اور رویندر جین تک نے آر کے فلمز کے لیے جو موسیقی ترتیب دی اس قسم کی موسیقی وہ دوسرے پروڈیوسرس کی فلموں میں ترتیب نہ دے سکتے تھے اگرچہ دوسروں کے لیے بھی انھوں نے بہت اچھی اچھی دھنیں تیار کیں۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ راج کپور کے ہوم پروڈکشن میں سنگیت کا ایک علیحدہ مزاج روا رکھا جاتا تھا جو ان کی اپنی ہر فلم میں نمایاں رہتا تھا۔ یہ بات پس منظر کی موسیقی کے لیے اور بھی خصوصیت سے کہی جا سکتی ہے۔ یہ حقیقت مجھے خواجہ احمد عباس مرحوم سے ہی معلوم ہوئی تھی۔ راج کپور کو ایک ساز اکارڈین سے بڑی محبت تھی اگرچہ انھوں نے دف بھی اکثر و بیشتر استعمال کیا ہے۔ شاید ان دونوں سازوں کے استعمال کی ایک خاص وجہ یہ رہی ہو کہ یہ دونوں ساز روس میں ہندوستان سے زیادہ رائج تھے جہاں ان کے بینر کی فلمیں لوگ شوق سے دیکھتے تھے۔ راج کپور نے

اپنے لیے ایک مخصوص آواز کے انتخاب میں بھی بڑی سمجھداری سے کام لیا۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ مکیش کی آواز کو کے ایل سہگل کے اثر سے نکال کر راج کپور نے ایک الگ پہچان دے ڈالی۔ راج کپور کی فلموں میں گیت مقصدی اور ادبی کم ہوتے تھے۔ بہت معمولی اور آسان بول والے گیت جو ظاہر ہے کہ پچاس سے سو الفاظ پر مشتمل ہوتے ہیں ان کی کہانیوں اور چویشنوں میں پیوست ہوا کرتے تھے۔ ان گیتوں کو شاعری نہیں بلکہ تک بندی ہی کہا جاسکتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ حسرت جے پوری اور شیلندر تک بندہی تھے۔ لیکن آر کے فلمز کے گیتوں کے بولوں سے کسی بات اور کسی کیفیت کی ترسیل ضرور ہوتی تھی خصوصاً کامل گیت کار شیلندر کے گیت حسی سطح کو چھوتے تھے۔ حسرت جے پوری کی ایک خوبی یہ تھی کہ وہ صحیح اردو الفاظ کو مسخ کرکے مقبول گیت لکھنے میں کامیاب تھے۔

راج کپور نے آر کے فلمز کے علاوہ دیگر بینرز کی فلموں میں بھی کامیاب اداکاری کی ہے۔ مثلاً پرساد فلمز کی 'شاردا' کو لیجیے۔ جس میں محبوبہ مینا کماری ہیرو کی سوتیلی ماں بن کر گھر میں آتی ہے۔ محبوب خان کی فلم 'انداز' میں راج کپور نے دلیپ کمار کے مقابل نرگس کے حاسد عاشق اور پھر شکی مزاج شوہر کا کردار بڑی خوبی سے نبھایا۔ ایک اور مدراسی پروڈکشن 'نذرانہ' میں راج کپور نے دوسرے نصف حصے میں ایک بجھے ہوئے اور ناکام رومانی ہیرو کا اچھا تاثر پیش کیا۔ اس قسم کے سنجیدہ رولز کے علاوہ راج کپور نے رشی کیش مکھرجی کی ہدایت میں بنی 'اناڑی' میں نوتن کے مقابل اور ایک اور دوسرے ہدایت کار کی فلم 'دلہا دلہن' میں سادھنا کے مقابل سادہ اور چنچل کردار نبھائے (یہ فلم انگریزی فلم 'رومن ہولیڈے' سے اخذ کی گئی تھی)۔ اور پھر کئی ایک ہلکے اور سطحی رول بھی کیے۔

ان فلموں کے ذکر سے ہٹ کر ایک فلم ایسی ہے جو اس اداکار نے اپنی مختلف شناخت اور خاص اپنی تسکین کے لیے بنائی لیکن جس نے اسے نیلام کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ یعنی 'میرا نام جوکر'۔ یہ فلم راج کپور کا بڑا عزم تھی۔ اس کے ذریعے انھیں ناظرین سے بہت کچھ کہنا تھا، ایک باضبط، زخم خوردہ اور جہاں دیدہ محبت پیش کرنا تھی۔ میں نے شروع میں لکھا تھا کہ راج کپور کا ہیرو سادگی اور معصومیت کا اظہار ہوتا تھا۔ لیکن تب یہ بات میں نے سادگی اور معصومیت کے سامنے کوئی خط فاصل قائم کیے بغیر کہی تھی۔ جس طرح المیہ کے سامنے طربیہ اور مسرت کے مقابل غم اٹل ہوتا ہے اسی طرح شاطرانہ پن اور عیاری کے پس منظر سے نیک دلی اور محبت کی سچائی ایک نبرد آزما قوت کے طور پر ابھرتی ہے۔ 'میرا نام جوکر' خواجہ احمد عباس نے لکھی بھی خوب تھی اور راج کپور نے بنائی بھی خوب تھی۔ لیکن افسوس وہ بیشتر فلم بینوں کے لیے ناخوشگوار ثابت ہوئی۔ اس فلم نے یہ ثابت کر دکھایا کہ ہمارے فلم بین چارلی چیپلن کی ٹوپی اور لباس سے زیادہ دور اب تک نہیں جاسکے ہیں اور ایک جوکر کے رنگے ہوئے چہرے اور ہیئت کی معنویت تک پہنچنے میں انھیں اب بھی وقت لگے گا۔ اس میں شک نہیں کہ راج کپور کی اس ناکامی کے دکھ میں ان کے پرانے پرستار ان کے برابر کے شریک رہے۔ اور پھر اپنے ارادے کے برخلاف اس طویل فلم کا دوسرا حصہ راج کپور نے پروڈیوس نہیں کیا۔ شاید ہمارے فلم

بینوں میں ابھی وہ کامل شعور پیدا نہیں ہوا ہے جو ایسی فلموں کا متحمل ہو سکے۔ یا شاید یہ فلم ہندوستان میں قبل از وقت بن گئی تھی۔ اس فلم میں 'جوکر' کا کردار بہت معنی خیز اور بہ یک وقت 'حسیت' اور 'بے حسی' کا علامیہ تھا۔ تین ناکام محبتوں کے بعد عاشق محسوس کرتا ہے کہ وہ ایک مکمل جوکر بن چکا ہے۔ اس میں ایک سنگدلانہ قناعت پیدا ہو جاتی ہے۔ ایک دل پھینک کی طرح راجو کا دل اچھلتا رہتا ہے، ہر بار ایک کاری زخم لگتا ہے اور ہر صدمے کے بعد وہ اپنے دل کو بڑا ہوتا محسوس کرتا ہے۔ گزراں غم کو بھول جانے کی صورت..... نئی چوٹ کو درگذر یا محسوس نہ کرنے کی آمادگی.....اور پھر نئے میک اپ میں چھپا اپنا چہرہ لیے ایک نئی لبی مسکراہٹ کے ساتھ نئے تماش بینوں کا نیا استقبال!۔

فلم تین حصوں میں ہے۔ ہر حصے کے کلائمکس میں قدیم یونانی ڈراموں کی سی ایک دھیمی دھیمی اداسی پائی جاتی ہے۔ فلم کی ناکامی کا ایک سبب یہ تھا کہ اتنے منجھے ہوئے فن کی توقع لوگوں کو راج کپور سے نہیں تھی۔ اس فلم کے ہر ہر سین میں خاموش ہدایت کاری کے بہترین نمونے بھی دیکھے گئے۔ مثلاً جوکر کی کوششوں سے جب اس کی تیسری محبوبہ پدمنی ایک معمولی چورنی سے قوالہ اور پھر قوالہ سے فلمی ہیروئن بن جاتی ہے اور اسے اور جوکر کو پروڈیوسر راجندر کمار ہوائی جہاز سے بمبئی کی فلم نگری میں لے جاتا ہے تو اڑان بھرتے ہوئے جہاز میں پروڈیوسر (راجندر کمار) کے ہاتھ میں انگریزی رسالہ 'ٹائمز'۔ پدمنی کے ہاتھ میں 'فورچون' دکھایا گیا ہے جبکہ جوکر 'لائف' میگزین دیکھ رہا ہے۔ اسی طرح اولین جدائی میں جوکر کو روتا دکھایا گیا ہے لیکن بعد میں ہر جدائی کے منظر میں ناکام عاشق یعنی جوکر کی آنکھوں پر دھوپ کا رنگین چشمہ لگا دکھا کر مغمومیت کے تاثر کو بے پناہ کر دیا گیا ہے۔ ہر دو عشقیہ واردات کے درمیان منجھا ہوا بنگالی سنیما فوٹوگرافر رادھو کرمکار جسے بجا طور پر راج کپور کی تیسری آنکھ کہا جاتا ہے، راجو کی رنگین عینک پر سے جھلملاتا ہوا ایک رنگین بونا جوکر پردہ فلم پر لے آتا ہے جو اپنے وجود کی اداسی سمیت بڑھتے پورے اسکرین پر چھا جاتا ہے۔ یہاں خاموش سنیما فوٹوگرافی کا فن خود کو محسوس کراتا ہے۔

راج کپور نے 'میرا نام جوکر' کی ناکامی کے بعد شاید یہ طے کرلیا تھا کہ اب اونچا فن ہندوستانی فلم بینوں کے سامنے پیش نہیں کرنا ہے۔ اگلی فلم 'بوبی' خواجہ احمد عباس نے ہی لکھی اور 'میرا نام جوکر' کے نقصان کو عبور کرنے کے لیے بنائی گئی۔ نوجوان محبت کو لے کر اس فلم میں کچھ سماجی مسائل پیش کیے گئے اور اس کا تھیم قدرے جرأت مندانہ تھا لیکن 'ستیم شوم سندرم' اور 'رام تیری گنگا میلی' میں راج کافی سمجھوتہ پرست نظر آنے لگے۔ ان فلموں میں ضرورت سے زیادہ چمک دمک اور شہوانیت (EROTICISM) کے جذبے کے اظہار سے باذوق فلم بینوں نے راج کپور کے فن کو روبہ انحطاط ہوتے ہوئے دیکھا۔ شاید اس کے بعد فلم 'حنا' میں مسلم سوشل تھیم کی وجہ سے وہ کسی قدر حجاب و تکلف اور اسلامی کلچر کا نمونہ پیش کرتے اور انھیں ان کی کھوئی ہوئی فنی عظمت دوبارہ مل جاتی۔ فلم بہر حال بہت کامیاب رہی۔ لیکن اس کامیابی کو راج کپور کی آنکھیں نہیں دیکھ سکیں۔ البتہ یہ حقیقت ہے کہ اپنے زمانے کی ناکام باکس آفس فلم 'میرا نام جوکر' آج ایک بڑی کلاسک ہندی فلم سمجھی جاتی ہے۔

■

Fay Seen Ejaz Editor "Mahnama Insha'
25-B, Zakaria Street
Kolkata 700073 (West Bengal)

تبصرہ و تعارف

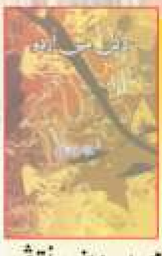

دکن میں اردو

مصنف: نصیرالدین ہاشمی

صفحات: 945، قیمت: 325 روپے، سنہ اشاعت: 2016

پبلشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

مبصر: امتیاز احمد علیمی، ریسرچ فیلو، شعبہ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی

اردو کے جن محققین نے اپنی تحقیقی کاوش کی بنیاد پر ادبی دنیا میں اپنے انمٹ نقوش چھوڑے ہیں ان میں نصیرالدین ہاشمی کا نام بے حد اہم ہے۔ یہ حیدرآباد کے ممتاز دانشور اور نامور محقق ہونے کے ساتھ ماہر دکنیات بھی تھے۔ انھوں نے ادبی دنیا میں اپنی تحقیقات، تالیفات اور تصنیفات کے ذریعہ ایک نمایاں مقام حاصل کیا۔ دکنی ادب کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا کر ساری زندگی اس پر عمل پیرا رہے اور دکنیات کے تمام تر سرمایے پر محققانہ نظر ڈال کر کتابی شکل میں اسے ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا تاکہ آنے والی نسلیں اس بیش قیمتی سرمایے سے استفادہ کر سکیں۔ نصیرالدین ہاشمی کی علمی، ادبی، تنقیدی، تاریخی، لسانی، مذہبی اور تحقیقی خدمات بہت ساری ہیں جن کا احاطہ یہاں ممکن نہیں، یہاں ان کی صرف ایک کتاب 'دکن میں اردو' کا تعارف مقصود ہے جو ہاشمی صاحب کی پہلی تالیف ہے۔ دکن کی ادبی تاریخ کے حوالے سے قومی اور بین الاقوامی سطح پر اس کتاب کی جس قدر مقبولیت ہے وہ کسی اور کتاب کو حاصل نہیں ہے۔ اردو کی ادبی تاریخ اس کتاب کے بغیر نامکمل تصور کی جائے گی۔ اس کتاب کی مقبولیت کا اندازہ جہاں اس کے مختلف ایڈیشنوں کی اشاعت سے کیا جا سکتا ہے وہیں ادب کے زبان زد خاص و عام سے بھی لگایا جا سکتا ہے نیز اس کتاب کا عنوان ایسا ہے جو دوسرے صوبوں کے محققین کے لیے مشعل راہ ہونے کے ساتھ اپنے صوبے میں اردو کی نشو و نما کس طرح ہوئی یا ہو رہی ہے اس پر تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے ایک بنیاد بھی ہے اور نمونہ بھی۔

اس کتاب میں کل سات ادوار قائم کیے گئے ہیں۔ پہلا دور (740ھ سے 900ھ) بہمنی عہد کا ہے جس میں اس عہد کی اردو کی نشو و نما کا تفصیل سے احاطہ کرتے ہوئے ان تمام شاعروں اور نثر نگاروں کی خدمات کا جنھوں نے اس زبان کی نشو و نما میں اہم کردار ادا کیا، سب کا تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے جبکہ دوسرا دور (900ھ تا 1100ھ) قطب شاہی دور ہے۔ بہمنی سلطنت کا شیرازہ بکھرنے کے بعد جو پانچ سلطنتیں قائم ہوئیں ان میں گولکنڈہ، بیجاپور، احمد نگر، برار، اور بیدر قابل ذکر ہیں۔ یہ سلطنتیں قطب شاہی، عادل شاہی، نظام شاہی، عماد شاہی اور برید شاہی کے نام سے موسوم تھیں۔ مصنف نے الگ الگ فصل قائم کر کے مذکورہ سلطنتوں کے ذریعے جس طرح اردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت ہوئی اور جن حکمرانوں نے اردو زبان و ادب کے فروغ میں عملی طور پر حصہ لیا ان سب کا مفصل اور مدلل انداز میں احاطہ کیا ہے، نیز اس عہد میں جس طرح کی شعری و نثری اصناف وجود میں آئیں ان سب کا بھرپور اظہار کیا گیا ہے۔ مذکورہ سلطنتوں نے علم و ہنر کی ترویج اور تہذیب و تمدن کو رواج دینے میں جس طرح کی کاوشیں کی ہیں وہ ناقابل فراموش ہیں۔ ان سلطنتوں نے اردو کی سرپرستی کی اور اس کو ترقی دے کر بار آور بنا دیا، یہی نہیں بلکہ اس کو اپنی سرکاری اور دفتری زبان قرار دے کر اس میں مزید روح پھونک دی۔ کتاب میں ان سلطنتوں کے ذریعے اردو ادب کی بیش بہا خدمات کا تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔

تیسرا دور (1101ھ تا 1136ھ) مغلیہ عہد کا ہے جس میں مغلیہ اردو کی نشو و نما پر تفصیلی مباحث ہیں جن میں ولی کی دہلی آمد کے بعد جو اردو پروان چڑھی اور جس زبان میں شاعری کی جانے لگی ان سب کے اسباب و علل کا محققانہ جائزہ لیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ نظم و نثر میں تبدیلی زبان سے جس طرح کی شفافیت آ گئی تھی مثالوں کے ذریعے اس کو واضح کیا گیا ہے۔

چوتھا دور (1136ھ تا 1220ھ) کا ہے جو سلطنت آصفیہ کے عہد حکومت کا زمانہ ہے، اس حکومت کی زبان اگرچہ فارسی تھی اور سارے دفتری امور فارسی میں ہی انجام دیے جاتے تھے لیکن فارسی کے ساتھ ساتھ اردو بھی قدم سے قدم ملا کر چل رہی تھی اور اس عہد کے شعرا و ادبا اپنی تخلیقات فارسی کے ساتھ اردو میں بھی پیش کرتے رہے اور رفتہ رفتہ اردو زبان میں انگریزی اور فرانسیسی کتابوں کے تراجم کی بھی ابتدا ہوئی۔ اردو کے پہلے علمی رسالے اور اردو یونیورسٹی کے قیام کا سہرا بھی سلطنت آصفیہ کے سر جاتا ہے۔ اردو زبان کی ترویج و اشاعت میں اس سلطنت نے جو خدمات انجام دی ہیں وہ ہماری تاریخ کا حصہ ہے۔ اردو زبان و ادب کی آبیاری میں اس سلطنت نے جو کردار نبھایا، مصنف نے مختلف تاریخی حوالوں سے اس عہد میں اردو زبان و ادب کی صورت حال کا بھرپور احاطہ کیا ہے۔

پانچواں اور چھٹا دور بھی سلطنت آصفیہ سے ہی متعلق ہے۔ اس عہد میں نظم و نثر میں لسانی اور موضوعاتی سطح پر تغیر و تبدل کا ذکر کرتے ہوئے اردو کے سرکاری زبان بننے تک کی تمام روداد رقم کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ مختلف انجمنوں کا بھی ذکر کیا گیا ہے جن کے ذریعے اردو زبان و ادب کا بہت زیادہ فروغ ہوا۔

ساتواں دور جس میں اردو کے عروج و زوال کی داستان رقم کی گئی ہے، 1336ھ تا 1374ھ پر مشتمل ہے۔ اس میں اردو زبان و ادب کے فروغ میں جامعہ عثمانیہ، کلیہ جامعہ عثمانیہ اور شعبہ تالیف و ترجمہ کا تفصیل سے ذکر کرتے ہوئے اس عہد کے شعرا اور نثر نگاروں کے ساتھ خواتین کے کارناموں کا بھی مفصل احاطہ کیا گیا ہے۔ نیز اردو زبان و ادب کے فروغ میں اردو اخبارات و رسائل اور مختلف انجمنیں مثلاً انجمن ترقی اردو، ادارہ ادبیات اردو، حیدرآباد اکیڈمی، اردو مجلس، انجمن ارباب اردو اور انجمن ترقی پسند مصنفین وغیرہ نے جو خدمات انجام دی ہیں ان سب کا الگ الگ ذکر کیا گیا ہے۔

مذکورہ سات ادوار کے بعد 'آندھرا میں اردو' کے تحت آندھرا پردیش میں اردو زبان و ادب کی صورت حال کا جائزہ لیتے ہوئے تقسیم ہند کے نتیجے میں اردو کی جو صورت حال ہوئی اس کو تاریخی تناظر میں پیش کرتے ہوئے لسانی سطح پر مختلف صوبوں کی تقسیم کا ذکر کیا گیا ہے اور مرد و خواتین شاعر اور نثر نگاروں کی تخلیقات پر مدلل گفتگو کی گئی ہے۔

مذکورہ تمام مباحث کو سامنے رکھ کر یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ یہ اپنی نوعیت کی منفرد کتاب ہے جس میں دکنی ادب کا بھرپور احاطہ کیا گیا ہے۔ قومی کونسل نے اسے کم قیمت میں شائع کرکے ادب کے طلبا کے لیے آسانیاں پیدا کردی ہیں۔

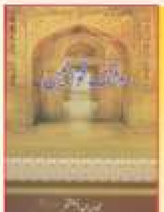

وقف قوانین

مصنف/مرتب: خواجہ عبدالمنتقم

صفحات: 213، قیمت: 110

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: ثوبان سعید

یسوسی ایٹ پروفیسر، خواجہ معین الدین چشتی، عربی-فارسی یونیورسٹی، لکھنؤ

اوقاف کا لفظ مسلمانوں کے روشن ماضی اور قوم وملت کے لیے مسلم صاحب حیثیت افراد کے دینی اور ملی جذبات کا استعارہ ہے کہ انھوں نے کس دردمندی اور صدق دلی سے ذاتی جائیدادوں کو بندگانِ خدا کی فلاح و بہبود کے لیے وقف کیا تھا، اور اپنی قوم کی بہتری کا خواب دیکھا تھا، اسی کے برعکس جب اوقاف کے معاصر منظرنامہ پر نگاہ جاتی ہے تو بے غیرتی، ناجائز قبضے اور ضمیر فروش ایمان داروں کی صورت سامنے آتی ہے جو پوری اجتماعی قوت اور منظم پروگرام کے ساتھ اوقاف کی بیش قیمت مالیات کو خورد برد کرنے میں مصروف نظر آتا ہے۔ ستم ظریفی کی بات یہ ہے کہ مستحق عوام ان سے بیگانہ محض بنے ہوئے ہیں اور انھوں نے حالات کے جبر کے آگے اپنی شکست تسلیم کرلی ہے۔ جسٹس شاسوت کمیٹی کی رپورٹ کے مطابق ہندوستان میں محکمۂ اوقاف کے پاس زمین کی ملکیت کی صورت میں ہندوستانی ریلویز اور محکمۂ دفاع کے بعد سب سے زیادہ زمین ہے۔ اسی کمیشن نے بتایا ہے کہ اوقاف کے پاس تقریباً چھ لاکھ ایکڑ سے زیادہ زمین کی ملکیت ہے۔ اسی سے اوقاف کی اہمیت اور اس کے تمول کا اندازہ بخوبی کیا جاسکتا ہے۔

وقف دراصل وہ شے ہے جس کی ملکیت کا حق خدا کے نام پر کیا جاتا ہے اور اس شے سے بندگانِ خدا منفعت حاصل کرتے ہیں۔ گویا وقف نام ہے اس عمل کا کہ کسی مسلمان کے ذریعہ مسلم قانون کی رو سے تسلیم شدہ مقدس، مذہبی یا خیراتی غرض کے لیے کسی منقولہ یا غیر منقولہ جائیداد کا مستقل طور پر نذر کردینا تاکہ اس مستقل نذر سے مسلم قوم کے افراد مستفید ہوتے رہیں۔

اوقاف کے انتظام و انصرام کے لیے مختلف اوقات میں حسب ضرورت قوانین بنائے جاتے رہے ہیں جیسے مسلمان وقف ایکٹ 1923، وقف ایکٹ 1954، وقف ایکٹ 1995 وغیرہ؛ موجودہ صورت حال یہ ہے کہ اب ہندوستان کے جملہ مرکزی و ریاستی اوقاف پر، سوائے جموں کشمیر کے، وقف ایکٹ 1995 نافذ العمل ہے۔ مذکورہ ایکٹ کو مزید فعال اور موثر بنانے کے لیے وقف (ترمیم) ایکٹ 2013 بھی نافذ کیا جاچکا ہے۔

خواجہ عبدالمنتقم کی یہ کتاب وقف جائیداد کے قوانین کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے۔ خواجہ صاحب نے اس کتاب کو مزید موثر بنانے کے لیے اس کو مختلف ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ چنانچہ اس کا پہلا حصہ 'وقف قوانین کی مختصر تاریخ و موجودہ صورت حال' کے نام کیا ہے جس میں موصوف نے وقف ایکٹ کی بے حد مختصر تاریخ بیان کی ہے جو ایک طالب علم کے لیے یقینی طور سے تشنگی کا باعث بنتی ہے۔ خواجہ صاحب نے وقف کی تاریخ نہیں بیان کی ہے بلکہ وقف کی تاریخ کا صدقہ اتارا ہے۔

کتاب کے دوسرے حصے میں 'وقف ایکٹ 1995 کا مکمل متن' مع وقف (ترمیم) ایکٹ 2013 کے تحت کی گئی ترامیم کے ساتھ اردو زبان میں موجود ہے۔ یقینی طور سے یہ حصہ وقف قوانین سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے مفید مطلب ہے۔ عام طور سے یہ ہوتا ہے کہ وقف کے تعلق سے سنی سنائی باتوں پر ہم ایمان لانے کے عادی ہیں اور ہندوستانی قوانین سے لاعلم رہ جاتے ہیں۔ میرا ماننا ہے کہ کتاب کا یہ حصہ وقف کے متعلق ہماری معلومات میں نہ صرف اضافہ کرے گا بلکہ کسی نہ کسی حد تک اس اہم اور نازک موضوع کے متعلق ہمارے اندر بیداری کی لہر بھی پیدا کرے گا۔

کتاب کا تیسرا اور چوتھا حصہ 'جموں کشمیر وقف ایکٹ 2001، اور جموں کشمیر مصرحہ اوقاف اور مصرحہ وقف جائیداد ایکٹ 2004 کے متن پر مشتمل ہے۔ چوں کہ جموں وکشمیر کو ہمارے آئین میں خصوصی درجہ حاصل ہے اسی شق کے تحت وقف قوانین میں بھی اس ریاست کے لیے علاحدہ وقف قانون وضع کیا گیا ہے۔ چنانچہ یہ دونوں ابواب جموں کشمیر کی اوقاف کے قوانین کا احاطہ کرتے ہیں۔ پانچواں حصہ 'درگاہ خواجہ صاحب ایکٹ 1955' کے متن پر مشتمل ہے۔ چھٹے حصے میں 'مرکزی وقف کونسل قواعد 1998 مع مرکزی وقف کونسل (ترمیم) قواعد 2015 کی بنیاد پر ترمیم شدہ صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ ساتویں حصے میں 'وقف جائیداد پٹہ قواعد 2014' کے تحت پٹہ قوانین کا متن شامل کیا گیا ہے۔ آٹھویں حصے میں 'اہم نظائر عدالت' کے عنوان کے تحت بعض ضروری اور اہم معلومات پیش کی گئی ہیں۔ ضمیمہ کے تحت وقف جائیداد بل 2014 کے اہم نکات کو درج کیا ہے اور اخیر میں وقف کی چند اصطلاحات کا ذکر کرکے کتاب کی افادیت کو دوچند کردیا ہے۔

پوری کتاب میں یہ بات کہیں لکھی نہیں گئی ہے کہ خواجہ عبدالمنتقم صاحب نے کتاب میں شامل مختلف قوانین اور ایکٹ کو اردو کے قالب میں ڈھالنے کا کام بھی کیا ہے۔ جب کہ یہ بات نمایاں طور سے لکھی جانی چاہیے تھی۔ اس طرح کی تکنیکی اور قانونی علوم پر مشتمل کتابوں کو ترجمے کے قالب میں پیش کرنا چیلنج بھرا کام ہوتا ہے، خواجہ صاحب مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اس کام کو بطریق احسن انجام تک پہنچایا ہے۔ وہ قانون کی باریکیوں اور اس کے رموز و نکات کے مختلف زاویوں سے بخوبی واقف ہیں اور اس کا اظہار ترجمے کی پیش کش کے دوران بہتر طریقے پر ہوا ہے۔ کونسل اس قسم کی تحقیقی اور عصری معنویت کی حامل کتابیں شائع کرکے اپنی افادیت کو ثابت کرتی رہی ہے۔ یہ کتاب ذاتی لائبریریوں میں بطور خاص اور پبلک لائبریریوں میں بطور عام رہنی چاہیے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے ادبیات، انسائیکلوپیڈیا لغات، تاریخ، تعلیم و تدریس، زبان و لسانیات، سائنس، تکنیک اور جغرافیہ، سیاست صحافت، طب و معالجات، فلسفہ، فنونِ لطیفہ، قانون، کتب خانہ داری، معاشیات، تجارت، نفسیات، بچوں کا ادب اور دیگر موضوعات پر بڑی اہم کتابیں شائع کی ہیں. کونسل کی تمام مطبوعات درج ذیل پتہ پر حاصل کی جاسکتی ہیں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی- 110066

NCPUL, West Block -8, Wing No. 7, R.K. Puram, New Delhi 110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

تحقیق وتنقید

انبساط فکر (تحقیقی وتنقیدی مضامین)

مصنف :۔ پروفیسر محمد علی اثر
صفحات:187، قیمت:225 روپے،
ناشر : ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی
مبصر : ڈاکٹر مقبول سلیم، صدر شعبۂ اردو
پرمیلا دیوی پاٹل آرٹس اینڈ سائنس کالج، نیکور، ضلع، بیڑ مہاراشٹر

دکنیات پر کئی محققین و ناقدین نے دکنی شعراء وادیب کے ادبی وعلمی کارناموں کو قلمبند کیا ہے اور نئے نئے انکشافات کے ساتھ اردو زبان وادب کو پروان چڑھاتے ہوئے ارتقائی منازل کو طے کیا ہے۔ دکنی ادب میں شعری اصناف ہوں یا نثری اصناف یہ تمام اہمیت کی حامل ہیں جس کی وجہ سے اردو زبان وادب گراں قدر ذخیرے کے ساتھ موجود ہے۔ اسی کے ساتھ دکن میں موجود جامعہ عثمانیہ ادب کا ایک ستون ہے جس کے ذریعے اردو زبان وادب کی ترقی واشاعت ہوتی رہی ہے۔ شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ کے اساتذہ نے اردو زبان وادب کی جو خدمات انجام دی ہیں اسے فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ انھیں اساتذہ میں ایک نام 'پروفیسر محمد علی اثر' کا ہے۔ جن کی علمی وادبی خدمات کا اندازہ ان کی تحقیقی وتنقیدی تصانیف سے ہوتا ہے۔ بقول ڈاکٹر محمد نسیم الدین فریس تحریر پیش گفت وہ ایک محقق، نقاد، شاعر، مدون، مرتب اور مورخ بھی کچھ ہیں۔ 'انبساط فکر' پروفیسر محمد علی اثر کی تازہ تصنیف ہے جو ان کے تحقیقی وتنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے تحقیقی مضامین حسب توقع دکنی ادب سے متعلق ہیں۔ تنقیدی مضامین میں جن شعرا اور ادیبوں پر قلم اٹھایا گیا ہے ان میں امجد حیدر آبادی، فانی بدایونی، شاذ تمکنت، راہی فدائی کے علاوہ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی اور آل احمد سرور شامل ہیں۔ پروفیسر محمد علی اثر نے اپنے مضمون میں دکن کے ان شعرا کے اشعار کو جو مدح اورنگ زیب میں لکھے گئے ہیں یکجا کیا ہے۔ عالمگیر کے دکنی مدح خوانوں سید مظفر (مثنوی ظفر نامہ عشق) شیخ داؤد ضعیفی (مثنوی ہدایات ہندی)، اولیا (مثنوی قصہ ابوشحمہ)، شاہ حسین ذوقی (مثنوی وصال العاشقین) اور قاضی محمود بحری (مثنوی من لگن) شامل ہیں۔ مصنف نے نہایت دیدہ وری اور ہنر مندی سے ان کی مثنویوں کے اشعار کو موضوعی وحدت کے رشتے سے منسلک کیا ہے۔ غواصی عبداللہ قطب شاہ کے دربار کا ملک الشعرا اور دکن کا بلند پایہ شاعر تھا جس کے قلمی اکتسابات میں مثنویات کے علاوہ دیوان غزلیات، قصائد اور رباعیات بھی شامل ہیں۔ ملک الشعرا غواصی اس کتاب کا ایک اہم مضمون ہے۔ غواصی کے اصل نام "وطن اور پیر ومرشد کے بارے میں سابقہ تحقیق نے بڑی ٹھوکریں کھائی تھیں۔ مصنف نے غواصی کا بیعت المصافحہ دریافت کرکے اس کی داخلی شہادتوں کی روشنی میں اس کے نام وطن اور پیر ومرشد کے بارے میں نئے انکشافات کیے۔ انھوں نے اپنے مضمون میں غواصی کا نو دریافت کلام بھی دیا ہے جو مطبوعہ کلیات غواصی مرتبہ محمد بن عمر میں شامل نہیں ہے۔ اس کتاب کے مضمون 'دکنی ادب پر تحقیقی کام' میں مصنف نے دکنی سخنوروں، دکنی ادب پاروں، دکنی زبان اور دکنی تہذیب کے مختلف پہلوؤں پر تحقیقی کام سر انجام دینے والے محققوں کے کارناموں کا نہایت تفصیل اور جامعیت سے احاطہ کیا ہے۔ مضمون سید ابوالحسن قربی کی اردو تصانیف "بارہویں صدی کے اس صوفی بزرگ کے سوانحی حالات اور ان کی اردو تصانیف کا بھرپور تعارف پیش کرتا ہے اور اپنی جگہ کافی اہمیت کا حامل ہے۔ دکنی ادب سے ہٹ کر دیگر جو مضامین اس کتاب میں شامل ہیں ان میں 'حیدرآباد اور اولیات اقبال' اس اعتبار سے نہایت اہم ہے کہ اس میں اقبال اور حیدرآباد کے رشتے کی نئی کڑیاں سامنے آئی ہیں۔ اقبال شناسی کے میدان میں اس مضمون کے حوالے سے نئی راہیں کھل سکتی ہیں۔ علاوہ ازیں اس تصنیف میں اردو کے ممتاز نقاد محقق اور خاکہ نگار پروفیسر خواجہ احمد فاروقی سے مصنف کے دیرینہ روابط تھے۔ خواجہ احمد فاروقی نے انھیں متعدد خطوط لکھے۔ ان خطوط کی روشنی میں مصنف نے فاروقی صاحب کی مکتوب نگاری کا تجزیہ کیا ہے جو بہ شکل مضمون شامل کتاب ہیں۔ اسی طرح پروفیسر آل احمد سرور سے بھی ان کی جو یادیں وابستہ تھیں اور ان کی شخصیت نے ان پر جو اثرات چھوڑے انھیں بھی مصنف نے نہایت قرینے سے مضمون کا روپ دیا ہے۔ کتاب کے دیگر مضامین میں جو مختلف شعرا کے کلام کے تنقیدی جائزے پر مشتمل ہیں۔ مصنف نے ناقدانہ کشادہ ذہنی، فنی بصیرت، درک وآگہی کا ثبوت دیا ہے۔ تنقید میں ان کا نقطۂ نظر کسی خاص دبستان تنقید یا ازم کا پابند نہیں بلکہ ادبی محاسن، فن کی جمالیات اور تہذیبی قدروں کی پاسداری کو ہدف نظر بنایا ہے اور ہر شاعر کے فن کی تفہیم وتحسین میں اپنی ذاتی رائے کو مقدم رکھا ہے۔ مصنف کا قلم نہایت سبک روی سے چلتا ہے۔ ان کے تحقیقی اور تنقیدی دونوں طرح کے مضامین میں وضاحت، شفافیت اور قطعیت پائی جاتی ہے۔ ان کا اسلوب سلیس اور رواں ہے وہ گھما پھرا کر سلسلہ کلام میں گرہیں ڈال کر بات کو ژولیدہ بنانے کے قائل نہیں ہیں۔ اسی لیے ان کے اسلوب میں ایک طرح کی دلکشی اور جاذبیت کا احساس ہوتا ہے۔ مجموعی طور پر یہ کتاب اردو ادب کے سرمایہ نقد وتحقیق میں ایک گراں بہا اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔

تار نظر

مصنف: وہاب عندلیب
صفحات:334، قیمت:200/روپے
ناشر: کنج نسیم، کے ایچ بی کالونی، گلبرگہ 585102
مبصر: ڈاکٹر سید وصی اللہ بختیاری عمری

وہاب عندلیب صاحب گلبرگہ کی ایک اہم ادبی شخصیت ہیں۔ اردو تدریس سے وابستہ رہے۔ کرناٹک اردو اکادمی کے چیئرمین رہ چکے ہیں۔ آپ کے مضامین ومقالات، کتابوں کے پیش ناموں، مقدموں اور تبصروں کا مجموعہ 'تار نظر' کی شکل میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے مالی تعاون سے شائع ہوا ہے۔

کتاب کی ابتداء میں ڈاکٹر محمد ضیاء الدین شکیب صاحب کے تاثرات موجود ہیں۔ آپ نے کتاب کا تعارف پیش کیا ہے اور امید ظاہر کی ہے کہ اہل علم اس کتاب کو قدر کی نگاہوں سے دیکھیں گے۔

پیش نظر کتاب 'تار نظر' میں حصۂ ادب کے تحت تیرہ مضامین شامل ہیں۔ جن میں فیروز شاہ بہمنی کے عہد میں دکنی ادب، جنگ آزادی میں مولانا محمد علی جوہر کا حصہ، گلبرگہ کا ادبی منظر نامہ، اردو کی ادبی تحریکیں اہمیت کے حامل مضامین ہیں۔ شخصیات پر مضامین میں ابراہیم جلیس، سلیمان خطیب، مظہر محی الدین، ڈاکٹر تابش مہدی، ڈاکٹر راہی فدائی اور محب کوثر وامجد علی فیض پر مضامین شامل ہیں۔

دوسرا حصہ 'مطالعے' کے لیے مختص ہے، جس میں چھ مضامین میں چھ کتابوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ پروفیسر خالد سعید کی کتاب 'شب رنگ نمو' اور رفیعہ منظور الامین کے افسانوں کے مجموعہ 'آہنگ' کے افسانوں کا تجزیہ کیا گیا ہے۔

تیسرا حصہ 'زبان، تعلیم وتدریس' ہے جس میں دس مضامین شامل ہیں۔ وہاب عندلیب کا تعلق تدریس سے ہے اور آپ نے مختلف مواقع پر جو تحقیقی مضامین شائع کیے تھے، وہ اس حصے میں شامل ہیں۔ ہندوی، ہندی، دکنی ایک زبان، کرناٹک میں اردو زبان کا ارتقا، میر عثمان علی خان آصف جاہ سابع کے دور میں اردو زبان وادب کی ترقی، جیسے مضامین کے ساتھ اردو زبان کے مسائل اور اردو تدریس کے مسائل و درسی کتابوں کے

جائزے پر مشتمل مضامین شامل ہیں۔ اردو میڈیا کے تجارتی امکانات و مواقع پر بھی ایک مضمون شامل ہے، جسے پریس کلب انڈیا کی ایک کانفرنس میں پیش کیا گیا تھا۔

کتاب کے مشتملات کی نوعیت کا چوتھا حصہ 'تبصرے' ہے۔ اس حصے میں تیس کتابوں پر تبصرے شامل کیے گئے ہیں۔ یہ تبصرے اختصار کے حامل ہیں، لیکن ان تبصروں سے ان کتابوں کے بارے میں ایک مختصر تعارف حاصل ہو جاتا ہے۔

تارنظر کا پانچواں حصہ 'پیش نامہ' ہے۔ اس حصے میں 36 کتابوں پر مصنف کے لکھے ہوئے مقدمے، تقاریظ اور پیش لفظ و پیش نامہ شامل ہیں۔ ان کتابوں میں اکثر گلبرگہ اور علاقۂ حیدرآباد کرناٹک کے اہلِ قلم کی کتابوں پر لکھے ہوئے فرمائشی مضامین ہیں۔ اس حصے میں شعری مجموعوں پر لکھی گئی تقاریظ ہیں، تحقیقی مقالات پر بھی آپ نے مقدمے لکھے ہیں، افسانوی مجموعوں اور مطبوعہ کتابوں پر لکھے گئے تاثراتی مضامین کی خوبی یہ ہے کہ اختصار کے باوجود تعارفی وتنقیدی اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔

اس کتاب کے مطالعے سے بہت سی کتابوں کا ایک تعارف اور کئی موضوعات پر معلومات حاصل ہو جاتی ہیں۔ تقریباً چالیس سالہ دور میں مختلف مواقع پر لکھے گئے مضامین ومقالات اور تبصروں وتقریظوں میں فکر کی بالیدگی اور اصابت رائے کا احساس ہوتا ہے۔ ہر جگہ نہایت حزم واحتیاط کے ساتھ رائے دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس مجموعہ مضامین کے مطالعے سے علاقائی ادب کے ساتھ ساتھ ہمعصر ادب کے بارے میں بہت سی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ تقریباً سو موضوعات اور کتابوں کا تعارف حاصل ہو جاتا ہے۔

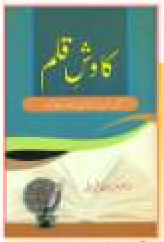

کاوش قلم

مصنف/ ناشر: ڈاکٹر عزیز اللہ شیرانی

ضخامت: 264، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: 2015

مبصر: سمیہ محمدی، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

ڈاکٹر عزیز اللہ شیرانی کا شمار ٹونک (راجستھان) کے ادیبوں کی اس فہرست میں ہوتا ہے، جنھوں نے اپنی تالیف وتصنیف سے ٹونک کا نام روشن کیا ہے، وہ شاعر بھی ہیں افسانہ نگار بھی، انھوں نے تذکرے بھی لکھے اور بچوں کے ادب پر بھی خامہ فرسائی کی ہے۔ ان کے دو شعری مجموعے سامنے آچکے ہیں، تحقیق وتنقید کے حوالے سے بھی ان کی کئی کتابیں منظر عام پر آکر داد وتحسین حاصل کرچکی ہیں۔ زیر نظر کتاب ''کاوش قلم'' بھی ان کی تنقیدی بصیرت کی عکاسی کرتی ہے۔

زیر تبصرہ کتاب 'کاوش قلم' میں اکیس مضامین شامل ہیں، اس کے علاوہ 'کاوش قلم بنام مہارت قلم' کے عنوان سے مسعود اختر خاں کی ایک تحریر اور مصنف کا ایک چھوٹا سا پیش لفظ 'مصنف کے قلم سے' شامل ہے۔ کتاب میں مختلف النوع مضامین شامل ہیں، ان مضامین میں چند کا تعلق ناول سے ہے تو بعض مضامین کا تعلق شاعری سے ہے، چند مضامین صحافت سے متعلق بھی ہیں۔

کتاب میں شامل پہلا مضمون 'اردو غزل میں قومی وتہذیبی عناصر' ہے۔ ڈاکٹر عزیز اللہ شیرانی نے ملا وجہی سے لے کر مظہر امام تک کی شاعری سے متعدد مثالیں پیش کی ہیں، انھوں نے لکھا ہے کہ اردو شاعری میں قومی یک جہتی اور اتحاد باہمی کا جذبہ ابتدا ہی سے ملتا ہے۔ کتاب کا دوسرا مضمون 'اردو شاعری میں تصوف کے عناصر' ہے۔ شاعری اور تصوف کے درمیان بہت گہرا رشتہ رہا ہے، اردو زبان کی ترقی میں صوفیائے کرام کا جو رول رہا ہے، اس کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

ایک مضمون 'اردو افسانے میں سماجی آگہی' ہے۔ موصوف نے ان افسانہ نگاروں اور ان کی تحریروں کو اپنے مطالعے کا محور بنایا ہے جن کے افسانوں میں سماجی آگہی کا احساس ملتا ہے۔

کتاب 'کاوش قلم' میں ایک مضمون 'جنگ آزادی میں اردو کا حصہ' ہے۔ ڈاکٹر عزیز اللہ شیرانی نے 1857 کی بغاوت سے لے کر 1947 تک کی جد و جہد میں اردو کے رول پر گفتگو کی ہے، انھوں نے اردو غزل سے مثالیں بھی پیش کیں ہیں اور صنف ڈرامہ اور اردو صحافت کی خدمات کا بھی احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے، ان کا خیال ہے کہ بحیثیت مجموعی اردو نے ہندستان کی جنگ آزادی میں ہر زاویے سے اپنا بہترین کردار ادا کیا ہے۔

'فراق کے تنقیدی اور شعری کارنامے' میں ڈاکٹر عزیز اللہ شیرانی نے فراق کے متعلق لکھا ہے کہ 'فراق کے یہاں ایسے نفسیاتی محرکات ہیں جہاں نظریۂ جنس جنم لیتا ہے اور وہ اپنے محبوب کا تصور بڑی دلکشی اور جاذب نظری سے کرتے ہیں۔' موصوف نے فراق کے چند اشعار بھی پیش کیے ہیں جن میں حسن و جمال اور وصال کی کیفیتوں کا اظہار ملتا ہے۔

'کاوش قلم' میں کئی دوسرے مضامین بھی شامل ہیں، جن میں چند کا تعلق شاعری سے ہے تو بعض صحافت کے حوالے سے تحریر کیے گئے ہیں چند مضامین کا تعلق فکشن سے بھی ہے۔ مجموعی طور پر مذکورہ کتاب میں شامل مضامین اچھے ہیں۔ کتاب کی قیمت مناسب اور طباعت خوبصورت ہے۔

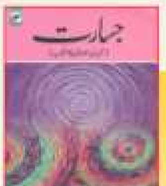

جسارت

مصنف: اسود گوہر

صفحات: 150 روپے، قیمت: 89 روپے، سنہ اشاعت: 2016

ناشر: عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی

مبصر: محمد شہاب الدین رحمانی قاسمی، ڈی 41، جے جے کالونی، اندر پوری، دہلی 25

زیر نظر کتاب میں مصنف نے گیارہ عنوانات قائم کیے ہیں۔ بات پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ سارے عناوین بہتر ہیں۔ اس کتاب کا پہلا مضمون 'تذکروں کی تنقیدی روایت' ہے۔ اردو ادب میں تذکروں کی اہمیت رہی ہے، تذکروں ہی سے اردو تنقید کی کرن پھوٹتی ہے۔ تذکروں کے مطالعے سے اردو تنقید کی رفتار کا اندازہ ہوا ہے۔ ان تذکروں سے ہی اردو کی ابتدائی تاریخ کا پتہ چلتا ہے اس لیے اس کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

اس عنوان کے تحت صاحب کتاب نے تذکرہ کے لغوی معنی، اس کی روایت، خاص طور پر اس کی ابتدا کیسے اور کہاں سے ہوئی، تذکروں کا تقاضا کیا ہے اصول تدوین اور ترتیب دینے میں کتنی چیزوں کا خیال رکھنا ضروری ہے، تاریخی وسوانحی مواد جو تذکروں کا فنی وصف ہے ان تمام گوشوں کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے اپنے اس مضمون میں فارسی کا پہلا تذکرہ 'لباب الالباب' کا ذکر کیا ہے۔

مذہبی تذکرے، ادبی تذکرے، سماجی تذکرے، صنفی تذکرے، آئینی تذکرے، انسائیکلو پیڈیائی تذکرے، تمام تذکرے کے لوازمات اور فنی خوبی پر بحث کی ہے۔ انھوں نے بتایا کہ 'مذہبی تذکرے' میں مذہبی رہنما صوفی وغیرہ کے کارناموں اور ان کی حالات و کوائف مذکور ہوتے ہیں۔ اس تذکرے میں شخصیت کی مذہبی مشغولیات، عبادات و ریاضت اور خطبات کا ذکر ہوتا ہے۔ میر کا تذکرہ 'نکات الشعرا' پر انھوں نے کافی زور دیا اور اس کا دوسرے تذکرے سے موازنہ کرکے دکھایا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ بعد کے تذکرے 'نکات الشعرا' سے ماخوذ ہیں اس لیے زیادہ معیاری نہیں ہوسکے۔ انھوں نے اس بحث کو چھیڑا ہے کہ 'نکات الشعرا' کے مقابلے میں 'تذکرہ ریختاں گویاں' فتح حسین گردیزی نے لکھا اور انھوں نے اپنے دیباچے میں وجہ تصنیف یہ بتائی کہ میر نے شعرا کے ساتھ زیادتی کی ہے اور بعض اہم شاعروں کو اپنے تذکرے میں شامل نہیں کیا۔ لیکن مصنف لکھتی ہیں کہ فتح حسین گردیزی نے بھی انصاف سے کام نہیں لیا اور جانب داری ان کے تذکرے میں بھی ہے۔ نواب مصطفیٰ خان شیفتہ کا تذکرہ 'گلشن بے خار' اور 'آب حیات' کا ذکر بھی اسی

باب میں لایا۔ میر حسن کا تذکرہ 'تذکرہ اردو شعرا'، قائم چاند پوری کا 'مخزن نکات' وغیرہ کا بھی سرسری جائزہ لیا ہے۔

اس کتاب کا دوسرا عنوان 'منٹو کی فن افسانہ نگاری' ہے جس میں مصنفہ نے سعادت حسن منٹو کے احوال و کوائف پر تفصیل سے روشنی ڈالنے کے بعد اس کے افسانوں کی فنی خوبیوں کا جائزہ لیا ہے۔ 'سرشار کی ناول نگاری' اس کتاب کا تیسرا موضوع ہے۔ جس میں پنڈت رتن ناتھ سرشار کے ناول کا بھرپور تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔

'سودا کی قصیدہ نگاری' کافی دلچسپ مضمون ہے جس میں سودا کے قصیدے میں پائے جانے والے تمام فنی پہلوؤں پر تنقیدی نگاہ ڈالی گئی ہے اور یہ بات واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ سودا کی قصیدہ نگاری کو میر، مصحفی، میر حسن جیسے پائے کے شعرا نے بھی تسلیم کیا ہے۔ 'میر تقی میر' مضمون میں مصنفہ نے میر کی شاعری میں پائی جانے والی فنی خصوصیات کا بہت تفصیل سے جائزہ لیا ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ ان کی زندگی کے گزرے ہوئے حادثات و واقعات کا اثر ان کی شاعری میں جا بہ جا نظر آتا ہے۔ 'دارہ شکوہ- ایک تجزیہ' اردو کے مشہور افسانہ نگار اور ناول نگار قاضی عبدالستار کے ناول کا تجزیہ ہے جس کو انھوں نے مختصر انداز میں پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ 'مولانا ابوالکلام آزاد کی صحافت نگاری' اس مضمون پر قلم اٹھانا ہی ہمت کی بات ہے کیوں کہ مولانا کی تحریر کو پڑھنا اور پھر اس کے صحیح نتائج تک پہنچنا ہر شخص کے بس میں نہیں ہے۔ مصنفہ نے اس عنوان کا انتخاب کیا اور مولانا کی صحافتی کاوشوں کی گرہیں کھولی ہیں جس سے مولانا کے صحافتی پہلو کو بآسانی سمجھا جا سکتا ہے۔

'اردو مثنویوں کا تنقیدی جائزہ' میں مثنوی کی فنی خوبیوں کی وضاحت کرنے کے بعد اردو ادب کے مشہور مثنوی نگاروں کی اہم مثنویوں مثلاً ملا وجہی کی قطب مشتری، نصرتی کی گلشن عشق اور علی نامہ، ابن نشاطی کی پھول بن، میر اثر کی خواب و خیال، میر حسن کی سحرالبیان، دیا شنکر نسیم کی گلزار نسیم، مرزا شوق کی زہر عشق کا مختصراً مگر جامع تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے۔ 'کچھ خطوط غالب کے بارے میں' اس مضمون میں غالب کے خطوط کی اہمیت و افادیت پر گہرائی و گیرائی کے ساتھ نظر ڈالی گئی ہے۔ 'اردو مرثیوں کا تنقیدی جائزہ' میں اردو مرثیہ نگاروں کے تمام مراثی کے ساتھ اردو مراثی کے خد و خال پر تنقیدی آراء پیش کی گئی ہے۔ کتاب کا آخری مضمون 'امتیاز علی تاج کی فن ڈرامہ نگاری' میں امتیاز علی تاج کے مختصر حالات پر روشنی ڈالنے کے بعد ان کے ڈرامہ انارکلی پر تنقیدی نگاہ ڈالی گئی ہے جس کے بارے میں اسود گوہر کا خیال ہے کہ فنی لحاظ سے یہ ڈرامہ اردو ادب میں شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے۔

اسود گوہر کی کتاب 'جسارت' (تنقیدی مضامین) کو دیکھنے کے بعد اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مصنفہ نے مضامین کے انتخاب میں نہ صرف کافی دلچسپی لی ہے بلکہ ہر ایک مضمون کا بغور مطالعہ کیا پھر کسی نتیجے تک پہنچی ہیں۔ کتاب کا سرورق عمدہ اور قیمت مناسب ہے۔

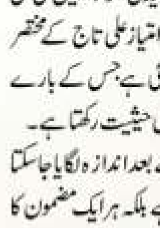

امعان نظر

مصنف: بدری محمد

صفحات: 152، قیمت: 251 روپے، سنہ اشاعت: 2015

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: امیر حمزہ، ریسرچ اسکالر: شعبہ اردو دہلی یونی ورسٹی، دہلی

بدری محمد کا شمار بہار کی ادبی صحافت میں عمدہ نثر نگار کی حیثیت سے ہوتا ہے۔ صحافتی مضامین کے علاوہ ان کے تنقیدی، ادبی و نیم ادبی مضامین رسالوں کی زینت بنتے رہے ہیں نیز گاہے بگاہے ان کے تخلیقی ذہن نے موزوں مصرعے بھی وضع کیے ہیں جس کا اچھا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ 2011 میں ایک غزل کا مجموعہ 'بنت فنون کار شنہ' شائع ہو کر قبولیت عام حاصل کر چکا ہے۔

زیر تبصرہ کتاب مصنف کی دوسری کتاب ہے جو اہمیت کی حامل ہے وہ اس طور پر کہ اب تک بہت ہی مشہور و غیر مشہور حضرات کے تبصرے شائع ہو چکے ہیں، تاہم ان میں تبصروں کا انتخاب اس طور پر نہیں جو انتخاب اس کتاب میں ہے۔ اس میں مصنف نے نہ کسی ناقد، نہ شاعر، نہ ہی افسانہ نویس کے افسانوی مجموعے، نہ کسی مزاح نگار کے خاکہ و انشائیہ اور طنز و مزاح کے مضامین پر اور نہ ہی کسی ڈرامہ نگار کے ڈراموں پر، نہ ہی سوانح نگار کی حقیقت بیانی پر اور نہ ہی کسی سیاح کے سفرنامہ تبصرہ کیا ہے بلکہ یہ تمام تبصرے ملک کے مشہور و معروف مجلات کے خصوصی شماروں پر ہیں جس میں ملک کے اعلی و ادنی قلم کاروں کی تحریریں شامل ہیں۔

اس کتاب میں مصنف نے ملک کے 11 اہم مجلات کے 24 خصوصی شماروں پر کیے گئے ان تبصروں کو شامل کیا ہے جو قومی تنظیم، پندار، راشٹریہ سہارا، سنگم اور فاروقی تنظیم میں شائع ہو چکے ہیں۔ یہ تمام تبصرے نہ تو مختصر ہیں اور نہ ہی طویل بلکہ متوازن ہیں۔

تبصرہ دراصل تنقید کی ہی ایک شاخ ہے جس میں تبصرہ نگار محض اس کتاب کو موضوع بناتا ہے جس پر وہ تبصرہ کر رہا ہے نیز اس کے مشتملات پر روشنی ڈالتا ہے اور قارئین کے سامنے خوش اسلوبی سے پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے تاکہ قارئین کی توجہ اس کتاب کی جانب ہو۔ ایسے تبصرے اکثر رسائل و جرائد میں پڑھنے کو مل جاتے ہیں۔ کچھ تبصرے ایسے ہوتے ہیں جو تقابلی ہوتے ہیں۔ وہ اس طور پر کہ جس کتاب پر وہ تبصرہ کر رہے ہیں اس موضوع سے متعلق دوسری کتابوں پر بھی ان کی نظر رہتی ہے اور وہ اس چیز کو واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ موجودہ کتاب ماقبل کی شائع شدہ کتابوں سے کس قدر مختلف ہے، اس نئی کتاب میں کن کن نئی چیزوں کو شامل کیا گیا ہے یا تخلیق میں کن کن نئے نظریات و مسائل کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ تاہم اس کتاب میں پہلے طریقے کو ہی اپنایا گیا ہے۔

اس کتاب میں زبان ادب، ماہنامہ انشا، نیا دور، کتاب نما اور آجکل کے کئی نمبروں کا تبصرہ شامل ہے۔ اس کے علاوہ مصنف نے کئی دیگر ماہناموں و سہ ماہی مجلات کے مضامین کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا ہے، اس کے بعد ان تمام مضامین کے اہم نکات کو تبصرہ میں شامل کر کے اس مضمون کی وسعت و محدودیت پر گفتگو کی ہے۔ ان تمام میں وہ صرف توصیفی پہلو کو ہی سامنے نہیں رکھتے ہیں بلکہ ان میں غیر پختگی اور ڈھیلے پن کی جانب بھی اشارہ کرتے جاتے ہیں۔ جیسے حفیظ بنارسی نمبر پر لکھتے ہیں "حفیظ بنارسی کو رسالے اور مشاعرے کا مقبول شاعر بتاتے ہوئے ان کے ترنم کی بار بار تعریف کی گئی ہے جب کہ ترنم شاعری کے لیے ضروری چیز نہیں ہے۔ اس سے شاعر سامع یا مشاعرہ کو تو فائدہ پہنچ سکتا ہے شاعری کو نہیں۔"

اس میں شامل ایک اہم تبصرہ ماہنامہ 'انشا' کے گفتنی نمبر پر بھی ہے۔ انشا کا یہ نمبر ف س اعجاز کے اداریوں کا مجموعہ ہے۔ اس میں انھوں نے ان کے اداریوں کی ستائش کی ہے، وہیں اس جانب بھی اشارہ کیا ہے کہ ان سے بھی اچھے اداریے لکھنے والے موجود ہیں اور رہے ہیں۔ وہیں دوسری جانب یہ بھی لکھا ہے کہ دوسرے صحافیوں کے لیے اس میں ترغیب ہے کہ اداریے معیاری ہونے چاہیے۔ کئی تبصرے ایسے ہیں کہ مصنف نے کہیں کچھ چھپانے کے لیے رکھا ہی نہیں بلکہ اپنے شستہ انداز تحریر اور دلکش اسلوب بیان میں تمام نکات و کمیاں کو گناتے چلے گئے ہیں، اور یہ بھی نہیں کہ صرف بڑے بڑے پائے کے قلم کار کو ہی زیادہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے بلکہ ریسرچ اسکالر کی تحریروں پر بھی اپنی رائے سے نوازا ہے۔

اس کتاب میں انھوں نے جن معیاری مجلات کو تبصرے کے لیے انتخاب کیا ہے وہ ان کے تنقیدی ذوق کی جانب اشارہ کرتا ہے۔ پھر تمام تبصروں میں اپنی ایک محکم رائے سے نوازنا اس جانب اشارہ کرتا ہے کہ مصنف موجودہ دور کی تخلیقی و تنقیدی تحریروں سے کس قدر واقف ہے۔ الغرض یہ کتاب تبصرے کے حوالے سے اہم کتاب ہے جو معلوماتی بھی ہے اور تبصرہ نگاری میں قدم رکھنے والوں کے لیے مشعل راہ بھی۔ امید ہے کہ مصنف کی اس کتاب سے لوگ استفادہ کریں گے اور علمی حلقوں میں پذیرائی بھی حاصل ہوگی۔

فکشن

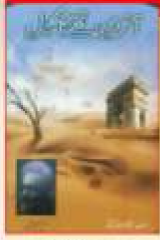

آخری وقفے کا کھیل

مرتب: محمد عمران قریشی
صفحات: 288، قیمت: 350 روپے، سنہ اشاعت: 2015
ناشر: تنویر بک ڈپو، آسنسول، مغربی بنگال
مبصر: ڈاکٹر نشاں زیدی B-63D.L.F. کالونی غازی آباد یوپی

'آخری وقفے کا کھیل' شمس ندیم کے افسانوں کا مجموعہ ہے، جو 22 افسانوں پر مشتمل ہے۔ اس افسانوی مجموعے کو محمد عمران قریشی نے مرتب کیا ہے۔ محمد عمران قریشی نے مفصل دیباچہ بھی لکھا ہے، جس میں شمس ندیم کی افسانہ نگاری کا جائزہ لیا گیا ہے۔ قابل ستائش بات تو یہ ہے کہ محمد عمران نے شمس ندیم کے افسانوں کو مختلف رسائل سے اکٹھا کرکے منظر عام پر لانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ علاوہ ازیں شمس ندیم کی ایک مختصر سی خودنوشت اور انٹرویو بھی شامل کیا ہے۔ ان افسانوں کو مرتب کرکے محمد عمران نے شمس ندیم کا نام بنگال کے افسانہ نگاروں کی فہرست میں درج کرانے کی بہترین کوشش کی ہے۔

'شمس ندیم نے جتنے افسانے لکھے اگر ان سبھوں کو حفاظت سے رکھا جاتا تو ان کے ایک سے زائد افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہوتے۔ آج جب بنگال میں اردو افسانے کا ذکر ہوتا ہے تو لوگ شمس ندیم کے متعلق یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ بنگال کے ایک افسانہ نگار تھے ان پر قلم نہیں اٹھا پاتے ہیں۔ کیونکہ انھوں نے اپنا کوئی افسانوی مجموعہ یادگار نہیں چھوڑا۔'

شمس ندیم کے افسانوں کا مطالعہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بہت منجھے ہوئے افسانہ نگار ہیں اور انھوں نے انگریزی ادب کا بہت مطالعہ کیا ہے ان کے افسانوں پر انگریزی ادب کی چھاپ صاف نظر آتی ہے۔ 'بھولی بھالی لڑکی' مجموعے کا پہلا افسانہ، جس میں انھوں نے ایک لڑکی کے جذبات کو اور اس کی مجبوری کو قلم بند کیا ہے۔ لڑکی کا شوہر بیمار ہے، لڑکی تعلیم یافتہ نہیں ہے۔ شوہر کا علاج کرانے کے لیے اسے پیسے کی سخت ضرورت ہے۔ وہ مردوں کو خوش کرکے پیسہ کما کر شوہر کا علاج کراتی ہے لیکن شوہر بھی ٹھیک نہیں ہوتا وہ مر جاتا ہے۔ اس افسانے میں مرد کی نفسیات کو بڑے فنکارانہ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ افسانہ 'ننگا مرد' میں بھی مرد کی نفسیات سے روشناس کرایا گیا ہے۔ اس افسانے میں ایک ایسے مرد رچرڈ کو موضوع بنایا گیا ہے جو شادی سے پہلے چھپ چھپ کر اپنی ہونے والی بیوی جینی کی ننگی تصویریں کھینچتا ہے اور ان کو دیکھ کر خوش ہوتا رہتا ہے۔ شادی کے بعد وہ بیوی کا جسم حاصل کرکے اتنا خوش ہوتا ہے جیسے پوری دنیا کی دولت اسے مل گئی۔ لیکن کچھ دنوں کے بعد وہ ان تصویروں کو دیکھ کر بوکھلا جاتا ہے اور بیوی کو ٹارچر کرنے لگتا ہے۔ ان سب باتوں سے انجان جینی اپنا قصور پوچھتی رہتی ہے۔ اس کے لیے ایک ایک لمحہ اذیت ناک بن جاتا ہے۔ ازدواجی زندگی بکھرنے لگتی ہے۔ افسانہ 'آخری موت' میں اینگلو انڈین مردوں اور عورتوں کی معاشی پریشانیوں کو بڑے موثر انداز میں بیان کیا گیا ہے ساتھ ہی اس بات کو بھی ذہن نشین کرانے کی کوشش کی ہے کہ جب انگریز عورت یا مرد ہندوستان میں شادی کرتے ہیں تو ان کو حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے ان کی اولاد بھٹکتی پھرتی ہے۔ ان کی اولاد کو کوئی پہچان نہیں ملتی۔ مصنف نے اس کرب کو بڑے موثر انداز میں پیش کیا ہے۔

'آخری وقفے کا کھیل' ایک طویل افسانہ ہے۔ اس افسانے میں کلب اور بار کی زندگی کا احاطہ کیا گیا ہے۔

علاوہ ازیں 'چتا'، 'زخمی خوابوں کا کرب' اور 'تاریکی' ایسے افسانے ہیں جو قاری کو تادیر سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔ چتا کہانی ایک ایسی لڑکی کو لے کر بُنی گئی ہے جو بنگالی ہے۔ گھر کے حالات بھی ٹھیک چل رہے تھے لیکن اچانک وقت ایسی کروٹ لیتا ہے کہ اس کا پورا گھر اجڑ جاتا ہے۔ اس لڑکی کو اپنی زندگی بسر کرنا مشکل ہو جاتا ہے وہ جگہ جگہ اسکولوں میں نوکری ڈھونڈھتی ہے لیکن نوکری نہیں ملتی اور آخر کار وہ مذہب تبدیل کرکے نوکری حاصل کر لیتی ہے۔ اس افسانے میں یہ بات واضح کی گئی ہے کہ انسان کے حالات ہمیشہ ایک جیسے نہیں رہتے اور کبھی کبھی وقت ایسی کروٹ لیتا ہے کہ انسان کو اپنی شناخت بھی قائم رکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔

شمس ندیم نے اپنے افسانوں میں جہاں ایک طرف اینگلو انڈین مرد عورتوں کی پریشانیوں، کلب کا ماحول مغربی تہذیب کے دلدادہ ہندوستانیوں کو موضوع بنایا ہے، وہیں دوسری طرف مزدوروں، کلرکوں اور غریب لوگوں کے مسائل کو بھی بخوبی بیان کیا ہے۔ افسانوں کی بنت بھی بہت اچھی ہے کہیں بھی جھول نہیں ہے انداز بیان قاری کو پورا افسانہ پڑھنے کی دعوت دیتا ہے۔ امید ہے کہ یہ افسانے قارئین کو بہت پسند آئیں گے۔

انشائیہ

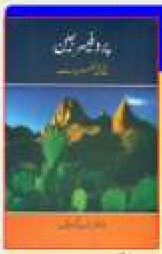

پروفیسر جبین: سچ کی شعریات

مصنف: ڈاکٹر رغبت شمیم ملک
صفحات: 134، قیمت: 200 روپے، سنہ اشاعت: 2016
ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی
مبصر: انجم پروین، ریسرچ اسکالر، شعبہ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

زیر نظر کتاب 'پروفیسر جبین: سچ کی شعریات' رغبت شمیم ملک کی تازہ ترین تصنیف ہے۔ اس سے قبل ان کی کتاب 'مارکسیت اور ادبی تنقید/ ٹیری ایگلٹن' (ترجمہ) شائع ہوکر اردو حلقے میں مقبول ہو چکی ہے۔ زیر تبصرہ کتاب پروفیسر جبین: سچ کی شعریات کی بیشتر تحریریں میرے مطالعہ شوق کا حصہ رہی ہیں، جن سے وقتاً فوقتاً محظوظ بھی ہوتی رہی ہوں۔ اس کتاب میں شامل تحریریں مختصر اور بے حد دلچسپ ہیں کہ بنا کسی اکتاہٹ کے بآسانی ایک ہی نشست میں ختم کر لیا جائے۔ انھیں پڑھ کر طبیعت ہشاش بشاش، ذہن کشادہ اور نظر بالیدہ ہو جاتی ہے۔

مذکورہ تصنیف ایک نئی طرز صنف کا پتہ دیتی ہے۔ بقول مصنف رغبت شمیم ملک "یہ بات بھی نشانِ خاطر رہے کہ میں اس سچ کو ایک نئی صنف 'انشائنچہ' کے قالب اور سانچے میں ڈھالتا رہتا ہوں جو میرا اپنا وضع کردہ ہے۔" اس قول کی روشنی میں ہم ان تحریروں کو افسانچے کے مثل ایک نئی صنف 'انشائنچہ' کے نام سے موسوم کر سکتے ہیں۔ کیونکہ یہ بھی بہت حد تک انشائیہ کی طرح تخلیقی بندشوں سے آزاد کسی بھی عنوان پر بلا تامل اور براہ راست اظہار خیال کا تقاضا کرتی ہے۔ یہ تحریر جیسا کہ عنوان 'سچ کی شعریات' سے ظاہر ہے کچھ ایسے تلخ حقائق سے روبرو کراتی ہے جو اکثر و بیشتر ذہنوں میں ڈنک مارتے ہیں لیکن جرأت گویائی مجتمع نہیں ہو پاتی۔ مصنف کو بھی ان انشائنچوں میں سچ کو قلم بند کرنے میں انتہائی کرب کی کیفیات سے گزرنا پڑا۔ چند تحریروں سے مستثنیٰ ساری تحریریں ایسی ہیں جو اردو کی موجودہ صورت حال، اس کی زبوں حالی، اردو داں طبقے کی کم مائیگی اور ضمیر فروشی کو اجاگر کرتی ہیں۔ مثلاً زوال اردو کی پانچ اہم نشانیاں، اردو تنقید کی موت، پڑھا لکھا نقاد، ادب برائے ایوارڈ، کہانی اور ضمیر فروشی، ہوائی تنقید، ادب کا مریض نقاد بن گیا وغیرہ اردو ادب اور دنیائے اردو میں ہونے والی بدعنوانیوں کا راز فاش کرتی ہیں۔

رغبت شمیم ملک کی انفرادیت یہ ہے کہ انھوں نے اپنے تخلیقی فن پاروں میں پروفیسر جبین کے خصوصی کردار کے اختراع سے اپنے کلام کو کافی حد تک موثر اور انداز بیان سے دلآویز بنانے کی کوشش کی ہے۔ یہ تحریریں لطف و انبساط فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ حساس ذہنوں کو جھنجھوڑتی اور انھیں درپیش مسائل کے عمق میں جانے اور دعوت غور و فکر دیتی ہیں۔ ان تحریروں کا اسلوب و آہنگ بعض دفعہ طنزیات و مضحکات پر مبنی مضامین سے

قریب تر معلوم ہوتا ہے۔لیکن یہاں طنز کے تیر چبھونے سے زیادہ سچائی کے ان پہلوؤں سے پردہ اٹھانا مقصود ہے جن سے عموماً گریز کیا جاتا ہے یا مصلحتاً پس پردہ ڈال دیا جاتا ہے۔

کتاب کی پشت پر شہناز رحمان نے اپنی مختصر تحریر میں رغبت شمیم ملک کی تحریروں پر مشتاق احمد یوسفی کے اثر کی نشاندہی کی ہے جو کافی حد تک درست ہے۔دوران مطالعہ بار ہا مجھے بھی اس کا خیال آتا رہا۔رغبت شمیم ملک نے پروفیسر جبین کے فرضی کردار کی بے باکی اور ان کے انتہائی شوخ اور قدرے معصوم شاگرد کے درمیان ہونے والے مکالموں کی مدد سے ایسے نکات کی جانب بھی توجہ مبذول کرائی ہے جن سے نوجوان بالخصوص تعلیم یافتہ نوجوان نسل نبرد آزما ہے۔اس ضمن میں رغبت شمیم ملک کا یہ جرأت مندانہ اقدام قابل ستائش ہے۔

شعری مجموعے

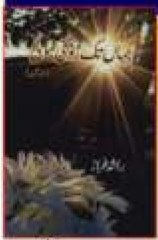

جہاں تک روشنی ہوگی

مصنف: راشد طراز

صفحات: 167 قیمت: 200 روپے، سنہ اشاعت: 2016

ناشر: ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: محمد رضوان خان، ڈی 703، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی

'جہاں تک روشنی ہوگی' پروفیسر راشد طراز کا تیسرا مجموعہ کلام ہے اس سے پیشتر دو مجموعے 'کاسۂ شب' 2004 اور 'غبار آشنا' 2010 میں شائع ہوکر مقبول ہو چکے ہیں۔

آپ کا اصل نام سید راشد احمد ہے آپ کی پیدائش 8 نومبر 1958 کو مولا نگر، سوریہ گڑھا، مونگیر میں ہوئی، والد مرحوم سید محمد عبیدالحق جو ایک معروف ایڈوکیٹ تھے، راشد صاحب بی، جی، سینٹر، آر، ڈی، اینڈ ڈی، جے، کالج، مونگیر میں ایسوی ایٹ پروفیسر وصدر شعبۂ اردو کی حیثیت سے خدمت انجام دے رہے ہیں۔

راشد طراز کی شاعری کا سفر تقریباً تیس سالوں پر محیط ہے، ان کا یقین چھپنے پر کم اور شعر گوئی پر زیادہ ہے، باوجود اس کے وہ ہندو پاکستان کے بیشتر موقر رسائل وجرائد کی زینت بن چکے ہیں۔انھوں نے ابتک اپنی شاعری کو مشاعرے اور اسٹیج سے کسی حد تک دور رکھا ہے، یہی وجہ ہے کہ انھیں ذہین اور صاحب ذوق قاری میسر آئے۔وہ اپنے اس مخصوص زاویہ نظر اور شعر گوئی کی وجہ سے اپنی شاعری کو ایک نہج تک پہنچانے میں کامیاب رہے۔راشد طراز کے غزلوں کا مجموعہ ''جہاں تک روشنی ہوگی'' میں اپنے ماقبل شعری سرمایے سے شاعری کا معیار بلند ضرور ہوا ہے، لہجے میں ایک نوع کا جمال اور تنوع جو اس سے پہلے نہیں تھا وہ واضح طور پر دیکھنے کو ملتا ہے۔اور یہ ان کی شاعری کا روشن، تابناک اور خوش آئند پہلو ہے، چند اشعار دیکھیے۔

جہاں پہ نور میسر تھا تیری ہستی کا
وہاں اندھیروں میں ڈوبے ہیں راستے کیسے

ایک دن مجھ کو بھی ذرے سے بنادے سورج
آسماں گر تجھے حاصل ہے یہ اعجاز کا حق

وجود کردیا جب اپنا مسترد میں نے
تو اعتماد کا منظر پکارتا ہے مجھے

لکیریں کھینچ کے اپنی ہتھیلیوں پہ طراز
جفاکشوں نے مقدر نکلتے دیکھا ہے

راشد طراز کی یہ وہ آواز ہے جو ہم عصروں میں کم ہی کے حصے میں آئی ہے۔ان کا یہ وہ لہجہ ہے جو دور سے پہچانا جاتا ہے، اور دیر تک پہچانا جائے گا۔

راشد طراز نے بہر طور روایتی شاعری سے بچنے کی کوشش کی ہے، اور وہ اپنے اس مقصد میں کامیاب بھی ہوئے ہیں، انھوں نے زمینوں کے انتخاب میں، بحر اور لفظیات کے استعمال میں مثبت اور کامیاب تجربے کیے ہیں جو لائق تعریف ہے اور فکر کے نئے ابعادی پہلو کی جانب توجہ دی جس سے شاعری کی منزل مزید قریب ہوتی نظر آتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ ہمیں ان کے کلام میں لفظیات اور دوسرے معاملات میں اپنے کو دہرانے (Repitation) کا عمل نہیں ملتا، اور جس شاعر کے اندر یہ صفت موجود ہو تو یقین آجانا چاہیے کہ وہ کامیابی کی منزلیں طے کرنے میں حتی المقدور کامیاب ہے، نمونے کے اشعار دیکھیے۔

تمام کرتا ہوں میں بھی چلو عریضۂ شام
میں پھر ستاروں کو لشکر بنا کے چلتا ہوں

چلو شہر نمائش سے کہیں اب دور چلتے ہیں
یہاں تو اگلی منزل کا اشارہ بھی نہیں ہوتا

بالا اشعار شاعر کے خاص تیور کی غمازی کے ساتھ اپنے تخلیقی عمل کی یکتائی کا احساس دلاتے ہیں، راشد طراز کی شاعری میں مضامین کا تنوع، لفظیات کا انوکھا برتاو اور جدید تراکیب بندی نے یقیناً اپنے ہم عصروں کو سوچنے پر مجبور کیا ہے، ان کے کلام میں پیچیدگی نہیں ہے، جو کہنا چاہتے ہیں اس کی ترسیل بآسانی ہو جاتی ہے، ہاں کہیں کہیں ایسا احساس بھی ابھرا کہ شاعر کا بیان اس قدر آسان ہو گیا ہے کہ انداز بیانیہ میں تبدیل ہو گیا ہے، جو بسا اوقات ہو جاتا ہے مگر اسے عیب تصور نہیں کرنا چاہیے، ہاں بشری کمزوری کے طور پر ہی سمجھنا انصاف کا تقاضا ہے۔راشد طراز تازہ دم اور تازہ کار شاعر ہیں۔ان کے اندر شاعری کے بے پناہ نئے جوہر پوشیدہ ہیں، ابھی ان کے خزانے میں لعل وگہر کے بے شمار خزانے ہیں۔راشد طراز کی فکر، شعور اور فہم وادراک معاشرے اور ملک کی زبوں حالی کو ترقی اور خوش حالی میں بدل دینے کی تمنائی ہے۔راشد طراز کی غزلیں تغزل، لطیف بیان، عصری حسیت اور پختگی فن کا نمونہ ہیں، وہ الفاظ کے استعمال میں بڑے محتاط نظر آتے ہیں، ان کے ہاں بندش الفاظ اور موزوں الفاظ کا برمحل استعمال ہے جس سے شعر کا حسن دوبالا ہونا فطری بات ہے۔چند اشعار ملاحظہ کیجیے۔

میں سن رہا ہوں قیامت پہ اضطراب وجود
عجب نہیں کہ یہیں پر ہو انقلاب وجود

کسے خبر تھی کہ آنکھوں کے سامنے ہوگا
زمیں کا درد نگاہوں کے سامنے ہوگا

یہ میں ہی کیا ہوں اجالا بھی ٹوٹ جاتا ہے
کبھی کبھی تو ستارا بھی ٹوٹ جاتا ہے

ان کی پوری شاعری کا بغور مطالعہ کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی غزلیں سیاسی، سماجی، معاشی، معاشرتی اور اقتصادی تہذیبی پیچیدگیوں کے اثرات کا منظر نامہ پیش کرتی ہیں۔لہٰذا یہ یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ وہ شاعری ہے جو قاری کو متاثر کیے بغیر نہیں رہے گی بالخصوص نئی نسل کو یہ شاعری ضرور متاثر کرے گی۔توقع ہے کہ راشد طراز کا یہ تیسرا مجموعۂ کلام نئے شعری منظر نامے پر نئی بشارتوں کا ضامن ہوگا۔

تشکیلات

مصنف وناشر: کلیم اختر

مرتب: ڈاکٹر نعیم صبا

صفحات: 196، قیمت: 250 روپے، سنہ اشاعت: 2015

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: غلام نبی کمار، ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی

زیر تبصرہ کتاب 'تشکیلات' سرزمین بہار سے تعلق رکھنے والے اور عصر حاضر کے ایک قد آور شاعر اور نثر نگار ڈاکٹر کلیم اختر صاحب کا دوسرا مجموعہ کلام ہے۔اس سے پہلے 'خیال آب' کے نام سے آپ کا پہلا مجموعہ کلام 2007 میں شائع ہوکر منظر عام پر آچکا ہے۔

زیر مطالعہ کتاب 'تشکیلات' کو ڈاکٹر نعیم صبا نے مرتب کر کے ایک اہم فریضہ انجام دیا ہے اور قارئین ادب کو کلیم اختر کی غزلوں کا ایک بیش قیمت اور انمول گلدستہ فراہم کیا ہے۔کتاب کی ابتدا میں 'ایک نظر ادھر بھی' میں مصنف کی سوانحی کوائف کا مختصر تعارف پیش کیا گیا ہے۔اس کے بعد کتاب کا انتساب گوپی چند نارنگ، شمس الرحمٰن فاروقی، عتیق اللہ، علیم اللہ حالی، علی احمد فاطمی، شمیم حنفی وغیرہ جیسے محبان اردو کے نام کیا گیا ہے۔مقدمہ یا حرف چند کے بجائے 47 صفحات پر مشتمل مختلف قلمکاروں کے چار مضامین شامل کتاب ہیں۔جس میں پروفیسر علیم اللہ حالی کے دو مضامین بعنوان 'نئی تشکیلات کے شاعر: کلیم اختر'

اور 'کلیم اختر کی شعریات'، مرتب کتاب ڈاکٹر نعیم صبا کا مضمون 'کلیم اختر کا ادبی اُسلوب' اور جگدیش پرساد کا انگریزی میں تحریر کردہ ایک مضمون "The New Styled Constructive Poet: Kalim Akhter" بھی شامل ہے۔ مصنفِ کتاب ڈاکٹر کلیم اختر نے اپنی ایک چھوٹی سی تاثراتی تحریر بعنوان 'شاعر کا امتیاز' میں شاعر کی شعری انفرادیت کے حوالے سے عمدہ گفتگو کی ہے۔

متذکرہ بالا مضامین میں ڈاکٹر کلیم اختر کی شاعری کی تفہیم اور سخن آفرینی کو ممکنہ حد تک سراہا گیا ہے۔ ان مضامین میں موصوف کی شاعری سے متعلق ہر پہلو پر مفصل روشنی پڑتی ہے۔

پروفیسر علیم اللہ حالی نے اپنے مضمون میں کلیم اختر کی شاعری کے بارے میں کھلے دل سے اپنے تاثرات قائم کیے ہیں۔ جس میں موصوف لکھتے ہیں کہ تخلیق کی وہبی صلاحیت کے ساتھ ان کی تلاش و جستجو اور تحقیق و آگہی کی خصوصیت انھیں اپنے ہم عصروں سے الگ کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ ڈاکٹر نعیم صبا جو کہ زیر نظر کتاب کے مرتب بھی ہے، کا مضمون ایک مقدمے کی نوعیت ہی اختیار کر گیا ہے کیونکہ ان کا مضمون بہت ہی بسیط اور بلیغ ہے۔ انھوں نے موصوف کی شاعری کی تہہ میں جا کر مختلف اشعار کا حوالہ دے کر ان کی تشریح و تعبیر اور فنی و فطری خوبیوں کو جس خوش بیانی سے نمایاں کیا ہے وہ واقعی قابل تحسین ہے۔

کلیم اختر کی شاعری کے حوالے سے زیر نظر کتاب کے سرورق اور پشت مع پشت کے فلیپ پر بیس معروف ادیبوں، شاعروں اور ناقدین ادب نے اپنے عمیق ترین تاثرات پیش کیے ہیں۔ بلاشبہ موصوف کی شاعری میں پیچیدہ بیانی و مشکل پسندی نظر آتی ہے لیکن اس فن میں بھی ان کا مطمح نظر واضح ہوتا ہے۔ نئی نئی اختراعات، ترکیبات، تشبیہات، استعارات اور لفظیات وغیرہ سے ان کی شاعری ممیز ہے۔ روایت سے احتراز کے بجائے جدت پسندی کے قائل ہیں۔ ان کی شاعری خود ان کی شخصیت کی عکاس بھی ہے اس کے علاوہ زندگی کے متنوع موضوعات سے موصوف کی شاعری مملو نظر آتی ہے۔ بہرکیف 'تشکیلات' کی شاعری روح کو سکون بخشتی ہے اور میں اس نوعیت کی شاعری کو مردہ جسم میں جان پیدا کرنے کے مانند ٹھہراتا ہوں جس میں تہذیب سخن، تخلیقی حسیت، حسرتِ زیست، پاسداری جذبات، فکر و احساس، وغیرہ کی تشکیل کر کے اس کی توثیق انجام دی جا رہی ہے۔ عشق و عاشقی سے پرے معنی بیکراں کی متقاضی 'تشکیلات' کا خاصہ ہے۔

محبتوں کے چراغ

مصنف کا نام: ریاض قاصد

صفحات: 136 قیمت: 150 روپے

ناشر: مکتبہ الفاروق، جی 15/A ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی

مبصر: نوشاد منظر، ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

پچھلے چند برسوں میں جس قدر شعری مجموعے منظر عام پر آئے ہیں، وہ کتابوں کی تعداد میں اضافے کا سبب تو بنے ہیں مگر ان میں سے چند مجموعے ہی ایسے ہیں جن کے مطالعے سے لطف بیان اور شعری مسرتوں کا حظ اٹھایا جا سکتا ہے۔ زیر تبصرہ شعری مجموعہ اس لحاظ سے قابل قدر ہے کہ اس میں شاعر نے اپنے جذبہ و احساس کو سلیقے سے پیش کرنے کی بہتر کوشش کی ہے۔ جدت اور نئے پن کے لیے شعری محاسن کو نظر انداز نہیں کیا ہے۔ ریاض قاصد کے تعلیمی سفر کی ایک اہم منزل جامعۃ الفلاح رہی ہے اور بقول ریاض قاصد شعری سفر کا باضابطہ آغاز اسی علمی سرزمین سے ہوا۔

زیر تبصرہ شعری مجموعہ 'محبتوں کے چراغ' ریاض قاصد کا پہلا شعری مجموعہ ہے۔ اس سے قبل ان کی چند غزلیں رسالوں میں ضرور شائع ہو چکی ہیں۔ مگر بقول شاعر انھوں نے کسی مشاعرے میں شرکت نہیں کی اور رسالوں میں غزل بھیجنے اور ان کی اشاعت میں زیادہ دلچسپی نہیں رہی ہے۔ ریاض قاصد کے مجموعہ کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ خالص غزل گو شاعر ہیں اور شاید یہی وجہ ہے کہ 'محبتوں کے چراغ' میں غزلوں کے علاوہ کچھ نہیں۔

ریاض قاصد کی شاعری نئے لب و لہجے کی شاعری ہے۔ انھوں نے عصر حاضر کے تقاضوں کو اپنی شاعری میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ 'عشق' اردو شاعری کا غالب موضوع رہا ہے۔ اردو کے تقریباً تمام ہی شعرا نے 'عشق' کو موضوع بنایا ہے۔ عشق یقیناً ایک پاک جذبہ ہے مگر موجودہ عہد میں یہ پاک جذبہ بھی اپنا تقدس کھو چکا ہے۔ لالچ اور خودنمائی نے رشتوں کے احترام کھو دیے ہیں۔ ریاض قاصد نے نہایت خوبصورتی سے اس پورے منظرنامے کو اپنی شاعری میں پیش کیا ہے۔

اجالے بانٹ رہے ہیں ضرورتوں کے چراغ بجھا دیے ہیں ہوس نے محبتوں کے چراغ

ریاض قاصد کی شاعری کا بڑا حصہ عشق مجازی کے متعلق ہے۔ انھوں نے عشق کی مختلف کیفیتوں کو خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔

مجھے اپنی محبت کا سہارا دے کے اے قاصد مری ہستی کو ہم دوش ثریا کر دیا اس نے

غزل میں محبوب سے وصال کی امید لیے عاشق اپنی زندگی گزار دیتا تھا۔ کلاسیکی شاعری کا یہ رنگ ریاض قاصد کے یہاں بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔ محبوب کی بے اعتنائی اور بے وفائی کے باوجود محبت کے لیے خود کو قربان کر دینے کا جذبہ ریاض قاصد کے یہاں نظر آتا ہے۔

اتنی سی خواہش ہے دل میں کاش وہ مجھ کو اپنا کہہ دے

کیسے سلگتی ریت پہ چلتے وہ میرے ساتھ اچھا ہوا انھوں نے مجھے آزما لیا

ریاض قاصد کی شاعری کا بغور مطالعہ کرتے ہوئے بیشتر اشعار ایسے ملیں گے جن میں محبوب کی بے رخی، بے وفائی ملتی ہے۔ عاشق اپنی جان کا نذرانہ دے کر محبوب کی محبت کا متقاضی نظر آتا ہے مگر چونکہ محبوب کی سرشت میں بے وفائی ہے لہٰذا عاشق کی ان قربانیوں کا اس پر کچھ خاص اثر نہیں پڑتا۔ ادھر عاشق محبوب کی بے رخی کا ماتم کرنے کی بجائے امید لگائے ہوئے ہے۔

راضی اگر نہیں ہے وہ مجھ سے خفا تو ہے گویا کسی بہانے سہی رابطہ تو ہے

وابستگی کا تجھ سے صلہ کچھ تو چاہیے خوش ہوں کہ سوز غم میں یہ دل مبتلا تو ہے

وہ آ گئے ہیں جذبہ لطف و کرم کے ساتھ ہو جائے میرا خواب حقیقت خدا کرے

ریاض قاصد کی شاعری میں انسانیت کی مٹتی شناخت کا مسئلہ بھی نظر آتا ہے۔ جس قدر ہماری تہذیب مٹ رہی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے گویا انسان ہونا کوئی جرم ہو۔ انسان انسان کا جس قدر دشمن بنتا جا رہا ہے اس سے دوری بڑھ رہی ہے ضرورت اس بات کی ہے کہ اس دوری کو ختم بھی کی جائے:

ہر طرح سے آدمیت ہو رہی ہے پائمال عزت و تکریم کا معیار پسپا ہو گیا

بہتر یہ ہے چراغ کو پھر سے جلائیے سازش تھی کس کی، کیسے بجھا بھول جائیے

مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ محبتوں کے چراغ میں شامل غزلیں قاری کو فکر و احساس کی سطح پر متاثر کرتی ہیں اور شعری مسرتوں کا لطف بھی پیدا کرتی ہیں۔

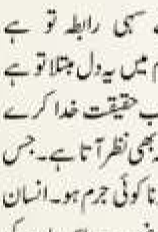

کچھ محفل خوباں کی

شاعر: ڈاکٹر منصور خوشتر

صفحات: 114، قیمت: 200 روپے، سنہ اشاعت: 2015

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: امتیاز انجم، ریسرچ اسکالر، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی

ڈاکٹر منصور خوشتر ابھرتے شاعر اور صحافی ہیں۔ ان کی شاعری میں زمانے کی دھمک اسی طرح موجود ہے، جیسی صحافت میں ہوتی ہے۔ ان کی صحافتی تحریروں میں وہی چاشنی

پائی جاتی ہے، جو ادبی تحریروں کا حصہ ہے۔

زیرِ تبصرہ کتاب 'کچھ محفلِ خوباں کی' ان کا تازہ ترین پہلا شعری مجموعہ ہے جو اشاعت کے اولین دن سے لے کر اب تک قارئین و ناقدین کا مرکزِ توجہ بنا ہوا ہے کیونکہ اس مجموعے میں جہاں انھوں نے محبت اور عشق و شوریدگی کی لے میں نغمگی بکھیرنے کی کوشش کی ہے، وہیں انھوں نے فکرِ فردا کی لڑیوں میں تخیل کو پرو دیا ہے۔ کبھی وہ زمانہ شناسی کرتے ہیں تو کبھی زبان و بیان کی چاشنی سے اپنے کلام کو پرلطف بنا دیتے ہیں۔

تقریباً 80 غزلوں پر مشتمل یہ مجموعہ خوشتر کی تخلیقی صلاحیت کو اجاگر کرتا ہے نیز اس مجموعے میں شامل مناظر عاشق ہرگانوی، جمال اویسی، عطا عابدی، سلیم انصاری اور احسان ثاقب کے مضامین خوشتر کی شاعری پر بے لاگ تبصرہ ہے۔ علاوہ ازیں پروفیسر طرزی کا منظوم خراجِ عقیدت خوشتر کی تمام تر ادبی، صحافتی اور سماجی کارگزاریوں پر محیط ہے۔ 'کچھ محفلِ خوباں کی' میں شامل تمام غزلیں عام فہم، سادہ و سلیس زبان میں ہیں تاہم ان میں جو خیالات پیش کیے گئے ہیں وہ جذبہ و احساس سے مملو ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی شاعری میں کلاسیکی رنگ ہے۔

خوشتر کے اشعار کا مطالعہ ان کے حد درجہ حساس ہونے کا ثبوت بھی ہیں۔ اس مجموعے میں ایسی غزلیں بھی ہیں جن سے خوشتر کے دلی جذبات و احساسات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ درج ذیل شعر ملاحظہ فرمائیں:

سیکڑوں قتل کیے جس نے وہی منصف ہے
شہر کا تیرے ہے دستور نرالا کیسا

منصور خوشتر کا یہ شعر موجودہ عہد سے بالکل ہم آہنگ ہے۔ جانے پہچانے لفظوں کو انھوں نے وہ شعری جامہ عطا کیا، جو آج کے ہر انسان کے قلب و ذہن کو اپیل کرتا ہے۔ مذکور شعر میں خوشتر نے اپنے دلی جذبات کا بے باکانہ اظہار کیا ہے۔ موڈرن تہذیب کو بھی انھوں نے موضوع بنایا ہے، جس سے محسوس ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف روایات کی پاسداری کرتے ہیں، بلکہ نت نئے تجربات کے سہارے موجودہ دور کے نئے نئے مسائل پر نظر رکھتے ہیں:

فیس بک اور ہے ٹیوٹر کا زمانہ آیا — کتنے اقدار جو اعلیٰ تھے وہ ہم سے گزرے
ایک لعنت ہے یہ نئی تہذیب — کاش صحرا میں ہی مکاں ہوتا ہے

ان اشعار میں جہاں انھوں نے دبے لفظوں میں دنیا میں ہونے والے انکشافات کی افادیت تسلیم کی ہے، وہیں جدید ٹکنالوجی کی قباحتیں بھی واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ ساتھ ہی انھوں نے یہ بھی اشارہ کیا کہ نئی ایجادات کے ساتھ بے شمار اعلیٰ قدریں بھی ہم سے رخصت ہو جاتی ہیں۔

''منصور خوشتر کی غزلوں میں زندگی اور معاشرہ کو دیکھنے، سمجھنے اور پرکھنے کا انداز ان کا اپنا ہے اور اظہار میں تخیل و تصور اور آورش سے زیادہ تجربہ، مشاہدہ اور حقیقت کا دخل ہے۔'' مناظر عاشق ہرگانوی کا یہ اقتباس خوشتر کی شاعری کے تمام گوشوں پر محیط ہے۔

خوشتر کے یہاں زندگی کے گوناگوں تجربات، تلخ مشاہدات اور داخلی کیفیات کا بیان فنکارانہ طریقے سے ہوا ہے:

سڑک پر چلنے والے کو نہیں اتنی سی مہلت — تڑپتی لاش کو بھی دیکھ کر رکتا نہیں ہے

یہ نئی نسل کے نوجوان شاعر کی فکر ہے جس میں گرد و پیش کے حادثات و واقعات کو بہت ہی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ منصور خوشتر کبھی صحافت کی ترچھی آنکھوں سے مسائل کا محاکمہ کرتے ہیں تو کبھی ادب کی دلکش زبان میں حالات کو پیش کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں مسائل کی رنگارنگی، مٹتی اور گم ہوتی تہذیب کا مرثیہ، فکرِ فردا اور فہم و ادراک کی سعی موجود ہے۔ یہ مجموعہ اردو شاعری کا ایک خوبصورت گلستاں ہے جس میں نوع بہ نوع گل و لالہ موجود ہیں۔ امید ہے کہ یہ گلستاں ادب کے خوشہ چینوں کو بے حد پسند آئے گا۔

رسائل و جرائد

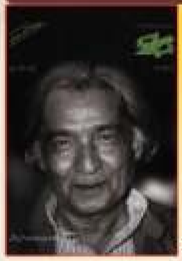

نیا دور (جاں نثار اختر نمبر۔حصہ اوّل)

ایڈیٹر: وضاحت حسین رضوی،

جلد: 70، شمارہ 11، فروری 2016

صفحات: 200، قیمت: 50 روپے

ناشر: ڈائرکٹر، محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ، اتر پردیش

مبصر: شعیب رضا فاطمی، 1/135 بی پی جے بلاک، نیو سیلم پور، دہلی 53

رسالے میں شامل مضامین نگاروں میں سید سراج اجملی بھی شامل ہیں جنھوں نے 'جاں نثار اختر کی تشبیہات' کے عنوان سے اپنا مضمون قلم بند کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ''جاں نثار اختر کا خاندانی پس منظر بھی ادبی و تہذیبی لحاظ سے خاصا قابلِ ذکر تھا کہ والد مضطر خیرآبادی مستند شاعر، دادی سعید النساء حرماں بنت علامہ فضلِ حق خیرآبادی شاعرہ اور زیادہ تر افرادِ خاندان علمی و تخلیقی صلاحیتوں سے مالا مال تھے۔''

رسالے کے 35 مضامین کو آٹھ ذیلی عنوانات 'شخص سے شخصیت تک'، 'نظریات و رجحانات'، 'عکس در عکس'، 'آئینہ در آئینہ'، 'پسِ گردشِ ایام'، 'برگِ زرد'، 'نذرانۂ عقیدت' اور 'خطوط' کے ذریعے واضح کیا گیا ہے۔

'شخص سے شخصیت تک' میں ڈاکٹر سلمان اختر، جو جاں نثار اختر کے فرزند ہیں، نے 'جاں نثار اختر، میں اور چھ آدمی' کے عنوان سے مضمون قلمبند کیا ہے۔ اپنے مضمون میں ڈاکٹر سلمان اختر نے ان کے 151 فلمی گیتوں کا حوالہ دیا ہے۔ اس کے علاوہ مختار شمیم نے 'جاں نثار اختر حیات و فن' وقار ناصری نے 'جاں نثار اختر شخصیت اور شاعری' وقار صدیقی نے 'جاں نثار اختر اور گوالیار'، اقبال مجید نے 'سرور چمن کا محافظ' محمد خالد عابدی نے 'زندگی ڈوب گئی درد کے طوفانوں میں'، حسن کمال نے 'کم قدری کا شکار شاعر جاں نثار اختر'، احمد ابراہیم علوی نے 'جاں نثار اختر کی دل نوازی'، ڈاکٹر خان حفیظ نے 'جاں نثار اختر ایک تابندہ ستارہ'، وصی اللہ حسینی نے 'جاں نثار اختر کا شعری پس منظر' جبکہ سلطان غنی نے 'یادوں کے جھروکے سے' کے عنوانات سے اپنے اپنے مضامین قلمبند کیے ہیں۔

فہرست کا دوسرا ذیلی عنوان 'نظریات و رجحانات' ہے جس میں سات مضامین 'جاں نثار اختر کا تنقیدی شعور'، حسن عباس فطرت نے قلمبند کیا ہے جبکہ ڈاکٹر شارب ردولوی کا مضمون 'جاں نثار اختر کی شعری جمالیات'، پروفیسر سید فضل امام رضوی نے 'جاں نثار اختر کا شعری نظریہ'، ڈاکٹر شریف احمد قریشی نے 'جاں نثار اختر کی ترقی پسندی'، ایس ایم عباس نے 'جاں نثار اختر کی ترقی پسندی'، عادل فراز نے 'ترقی پسندوں کا نظریاتی جبر' اور شاہد کمال نے 'جاں نثار اختر کی شاعری میں احتجاجی لہجے کا تصادم' کے عنوان سے اپنا مضمون قلمبند کیا ہے۔

تیسرا ذیلی عنوان 'عکس در عکس' ہے جس میں 9 مضامین شامل ہیں۔ اس ذیلی عنوان کے تحت سید سراج اجملی کا مضمون 'جاں نثار اختر کی تشبیہات'، ڈاکٹر ظفر النقی کا مضمون 'پچھلے پہر کے تناظر میں'، ڈاکٹر خدیجہ آئین کا مضمون 'غزل کا مزاج داں جاں نثار اختر'، ڈاکٹر مامون رشید کا مضمون 'جاں نثار اختر کی غزل گوئی'، ڈاکٹر ظہیر علی صدیقی کا مضمون 'جاں نثار اختر کی شاعری'، ڈاکٹر شکیل احمد کا مضمون 'غزل کا مزاج شناس شاعر جاں نثار اختر'، ڈاکٹر وسیم انور کا مضمون 'ترقی پسند غزل اور جاں نثار اختر'، ضیا فاروقی کا مضمون 'جاں نثار اختر کی غزلیہ شاعری'، ڈاکٹر محمد امتیاز احمد کا مضمون 'جاں نثار اختر کی ایک غزل کا تجزیہ' شامل ہے۔ 'آئینہ در آئینہ' کے ذیلی باب میں بھی تین مضامین 'خاکِ دل اور خاموش آواز'، عابد حسین حیدری، 'خاموش آواز'، ڈاکٹر ریحان حسن اور 'جاں نثار اختر کی شاعری' ڈاکٹر لئیق احمد نے لکھے ہیں۔

'پسِ گردشِ ایام' کے ذیلی باب میں پروفیسر آصفہ زمانی نے 'جاں نثار اختر کا گھر آنگن'،

علی اصغر الحیدری کا مضمون 'گھر آنگن اور روپ کا تقابلی مطالعہ' اور ڈاکٹر سلمان فیصل کا مضمون 'گھر آنگن کے شاعر' شامل ہے۔

باب 'برگ زرد' میں باقر مہدی کا مضمون 'آرکیڈیا کا ایک رند' اور پردیپ کپور کا مضمون 'جاں نثار اختر اور حضرت گنج کی سیر' شامل ہے۔ اس کے علاوہ 'نذرانۂ عقیدت' کے باب میں رباب رشیدی، جاوید اکرم اور ڈاکٹر طارق قمر کی نظمیں موجود ہیں۔

آخری باب 'خطوط' کے عنوان سے ہے جس میں جاں نثار اختر کی پہلی بیوی صفیہ کے خطوط جاں نثار اختر کے نام ہے جسے ڈاکٹر محمد اطہر مسعود خاں نے ترتیب دیا ہے۔ رسالے کا آخری سات صفحہ تصاویر پر مشتمل ہے جسے جاں نثار اختر تصاویر کے آئینے میں عنوان سے شامل اشاعت کیا گیا ہے۔

مجموعی طور پر تقریباً دو سو صفحات پر مشتمل اس خاص نمبر کی دستاویزی حیثیت مسلم ہے اور تمام مضامین کے مطالعے کے بعد یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ جاں نثار اختر نے ایک بھرپور ادبی زندگی بسر کی اور روایت کی پاسداری کرنے کے ساتھ ساتھ انھوں نے اپنے عہد کے جملہ مسائل وحقائق سے بھی کنارہ کشی اختیار نہیں کی۔ ترقی پسندی اور جدیدیت سے بیک وقت اخذ واستفادہ بھی کیا۔ فلمی شاعری بھی کی لیکن اپنے کلاسیکی رویہ کو آخری وقت تک سنبھالے رکھا۔ اپنی اہلیہ صفیہ کو ٹوٹ کر چاہا لیکن نامساعد حالات نے ان دونوں کو ساتھ مرنے جینے کے مواقع نہ دیے اور یہی وہ کرب تھا جو ان کی شاعری میں حزن بن کر نمودار ہوتا ہے اور دیرپا اثرات چھوڑتا ہے۔ اس خاص نمبر میں شامل شارب ردولوی اپنے مضمون میں جاں نثار اختر کی شاعری پر اپنے تاثرات رقم کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''جاں نثار اختر کی شاعری کو پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ ان کا محبوب اردو شاعری کا محبوب نہیں ہے۔ وہ واقعی گھر آنگن کو اردو شاعری کے احاطے میں لے آئے لیکن اس گھریلو محبوب جس کے ڈھلکے آنچل اور آٹے سے سنے ہاتھ سے اردو شاعری واقف نہیں تھی۔ اسے اردو شاعری کا محبوب بنا دیا اور لطف یہ کہ اس کے ذکر میں شعری جمالیات کا دامن اس سے کہیں چھوٹنے نہیں پایا بلکہ انھوں نے ایک نئی جمالیات سے اپنی شاعری کو اور زیادہ پرکشش بنا دیا۔ انھوں نے ان رشتوں اور اس زبان کو اردو کی فصیح شاعری کا جزو بنا دیا جس کا ذکر اردو شاعری میں نہیں تھا۔''

نیا دور کا جاں نثار اختر نمبر حصہ اوّل ایک دستاویز ہے۔ میں اس کے ایڈیٹر ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی اور ایڈیٹوریل بورڈ کے جملہ اراکین کو ایک دستاویزی نمبر شائع کرنے پر مبارکباد دیتا ہوں۔

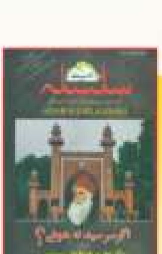

سہ ماہی **ادب سلسلہ**

مدیر: محمد سلیم (علیگ)، اعزازی مدیر: تبسم فاطمہ
جلد: 1، شمارہ: 2، (جولائی تا دسمبر 2016)
صفحات: 320، قیمت: 300 روپے
مبصر: شگفتہ پروین، ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی

زیر تبصرہ 'سہ ماہی ادب سلسلہ' اردو زبان وادب کا عالمی سہ ماہی رسالہ ہے۔ یہ رسالہ سرسید احمد خاں کے نام سے منسوب ہے۔ سرورق پر سرسید کی تصویر کے ساتھ ایک سوال بھی جلی حروف میں لکھا گیا ہے۔ ''اگر سرسید نہ ہوتے؟''۔ یہ جملہ محض ایک جملہ نہیں بلکہ ایک عہد اور تحریک کی طرف قاری کی توجہ مبذول کراتا ہے۔ سرسید احمد خاں کا نام آتے ہی ذہن میں انیسویں صدی کی صورت حال ذہن میں گردش کرنے لگتی ہے۔ سرسید نے بچشم خود 1857 جیسے خون ریز واقعات کو دیکھا تھا۔ ایسے ناگفتہ بہ حالات میں کوئی ایسا نہ تھا جو مسلمانوں کا پرسان حال ہو۔ سرسید احمد خاں پہلے شخص تھے جنھوں نے مسلم طبقے کو جہالت وگمراہی سے باہر نکالنے کا بیڑا اٹھایا۔ مسلمانوں کی جہالت، توہم پرستی وافلاس سے بخوبی آگاہ تھے۔ وہ اس بات سے واقف تھے کہ صرف تعلیم ہی مسلمان کو دلدل سے نکال سکتی ہے۔ اور کھویا ہوا مقام ووقار دلا سکتی ہے۔ اس لیے سرسید نے ہندوستانی مسلمانوں میں تعلیمی بیداری پیدا کرنے کے لیے جدید علم کی مشعل جلائی اور لوگوں کو یہ یقین دلایا کہ ان کی اصل کامیابی جدید تعلیم کے سیکھنے میں ہے۔ اور یہ کہنا سچ ہوگا کہ ایک مختصر سی مدت (1875-1898) میں اپنی کاوشوں سے وہ کر دکھایا جس کا جیتا جاگتا ثبوت علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ہمارے سامنے موجود ہے۔ اس طرح جب ہم مسلمانوں کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ فوراً سوالیہ نشان ہر سنجیدہ ودور بین نگاہ کے ذہن میں گردش کرنے لگتا ہے کہ ''اگر سرسید نہ ہوتے؟'' آج ہمارے ملک میں مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ جدید تعلیم کے ساتھ جس طرح دیگر شعبوں میں سبقت حاصل کر رہا ہے وہ شاید نہ ہوتا۔ اس لیے کہ سرسید کی دوررس نگاہ وہاں دیکھ رہی تھی جہاں ہر کس وناکس کی نگاہ کا پہنچنا ناممکن ہے۔

رسالے کے آغاز میں ایک طویل اداریہ اور چند مذاکرے ''اگر سرسید نہ ہوتے؟'' کے تحت پیش کیا گیا ہے۔ بعد ازیں خصوصی گوشہ اول سے متعلق 13 مضامین شامل کیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ سات افسانے بھی موجود ہیں۔ تمام مضامین ایک اہم دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ پہلا مضمون معین احسن جذبی کا ہے۔ تاریخ ہند: برطانوی راج سے علی گڑھ تحریک تک۔ اس کے علاوہ مولف ضیاء الدین لاہوری، ڈاکٹر سعید احمد، پروفیسر صالحہ رشید، جاوید حبیب، ڈاکٹر تسلیم احمد رحمانی، کے سی تیاگی، (بشکریہ وقار ہند)، ڈاکٹر رضیہ حامد، سلمان فیصل، ڈاکٹر مقبول احمد مقبول، ڈاکٹر مشتاق احمد، ڈاکٹر جمال رضوی کے مضامین شامل ہیں۔

اس شمارے کا دوسرا گوشہ 2000 کے بعد کے کچھ اردو ناولوں کا جائزہ کے عنوان سے ہے۔ جو کہ بہت ہی پُراثر اور عہد حاضر کے ناولوں کو سمجھنے کے لیے معاون ہے۔ موجودہ دور کے ناولوں میں موضوعات کا تنوع پایا جاتا ہے۔ اور ناول نگار ہر طرح کے موضوع کو اپنے ناولوں میں جگہ دیتے نظر آتے ہیں۔ حالانکہ اس سے پہلے بھی ناول لکھے گئے اور خوب لکھے گئے۔ موضوعات میں تنوع اس وقت بھی تھا لیکن جس طرح کی رنگارنگی خوش اسلوبی اور دلکشی اس عہد کے ناولوں میں پائی جاتی ہیں وہ واقعی قابل ستائش ہے۔ اس گوشے کے عنوان سے متعلق اقبال خورشید، پروفیسر قمر جہاں، جمیل حیات، ابوبکر عباد، نورین علی حق، ہمیں کرن کے مضامین شامل کیے گئے ہیں۔

رسالے کا تیسرا گوشہ 'ضیاء حسین ضیاء کی ادبی خدمات کا اعتراف' سے منسوب ہے۔ اس گوشہ کو دو حصوں میں منقسم کیا گیا ہے۔ پہلے کا عنوان ہے 'ضیاء حسین ضیاء کی ادبی خدمات' جس میں ظفر اقبال، ڈاکٹر ریاض امجد، ڈاکٹر طاہرہ اقبال، ڈاکٹر ستیہ پال آنند، شہزاد نیر، ہمیں کرن کے مضامین ہیں۔ جبکہ دوسرے حصے میں ضیاء حسین ضیاء کی منتخب نظمیں، کے تحت ضیاء حسین کی سات نظم شامل ہیں۔ جو مندرجہ ذیل ہیں۔

اضافتوں سے عاری، جلوہ گاہ سے واپسی، کبھی بازار خالی ہیں!!، بیمار قیس، دریا ہنس رہا ہے!!!، 'کبھی کبھی' ضرور ہے!!، اسی کو نظم کہتے ہیں۔ اس گوشے کے اخیر میں ذوقی صاحب کے دو مضامین 'زرنگار کے اداریے' اور جہاں بینی... کے نام سے موجود ہے۔ ذوقی صاحب نے اپنے دوسرے مضامین میں جس کا عنوان جہاں بینی... ہے اس میں ضیاء حسین سے متعلق مختصر گفتگو پیش کیا ہے اور ساتھ ہی اس بات کی طرف اشارہ بھی ہے کہ ادب کی نئی نسل کو ضیا صاحب سے سیکھنے کی ضرورت ہے۔

مذکورہ رسالہ سہ ماہی سلسلہ ادب میں شامل تینوں گوشوں سے متعلق تمام مضامین بے حد اہم ہیں۔ خوشی کی بات ہے کہ سرسید کے 200 ویں یوم ولادت کے موقع پر مدیر نے اپنے رسالہ ادب سلسلہ کا خصوصی نمبر شائع کیا جو ادبی حلقوں میں ایک اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔ امید ہے کہ اردو شیدائیوں اور سنجیدہ قارئین کے حلقوں میں اس کی بھرپور پذیرائی ہوگی۔

حاشیہ

مدیر اعزازی: ڈاکٹر ہاجرہ بانو
جلد: 1، شمارہ 1، اکتوبر–دسمبر 2016
صفحات: 96، قیمت: 50 روپے
ناشر: حاشیہ، پلاٹ نمبر 93، سیکٹر A، CIDCO، این 13 حمایت باغ اورنگ آباد 431001 مہاراشٹر، موبائل: 9860733049
مبصر: حقانی القاسمی

رسالوں کے انبوہ میں کسی نئے رسالے کی اشاعت اکثر بحث کا موضوع بن جاتی ہے۔ منجمد اور غیر متحرک موضوعات اور مضامین پر مرکوز رسائل کی کثرت نے نئے رسالوں کے وجود پر سوالیہ نشان قائم کردیے ہیں۔ 'حاشیہ' کے تعلق سے بھی ذہن میں یہی سوال اٹھتا ہے کہ آخر اس کی اشاعت کا جواز کیا ہے؟

ویسے یہ کہنا بہتر ہوگا کہ آج کے دور میں اردو کے جتنے بھی رسائل شائع ہوتے ہیں، چاہے ان کا معیار کچھ بھی ہو اردو کی بقا اور فروغ میں معاون ہوتے ہیں۔ یہ رسالے بند ہوجائیں تو اردو اور ادب سے لوگوں کا رشتہ ٹوٹ سا جائے گا۔ اردو سے جوڑنے کے لیے ان رسالوں کا وجود بہت ضروری ہے۔

رسالہ 'حاشیہ' کے وجود میں آنے کا مقصد بھی شاید یہی ہو مگر اس کے علاوہ اس کا ایک اور مفید مقصد بھی ہے، جس کی طرف رسالے کی مدیرہ ڈاکٹر ہاجرہ بانو نے اشارہ کیا ہے اور جس کی وضاحت رسالے کے نام سے بھی ہوتی ہے۔ سرنامے کی عبارت 'حاشیائی اظہار کا تخلیقی حوالہ' بھی رسالے کے مزاج اور منہاج کی عکاسی کرتی ہے۔ مدیرہ نے لکھا ہے کہ "سیاست اور سماج کی سطح پر بھی حاشیہ اور مرکز کی جنگ بہت پرانی ہے اور ادب میں بھی مرکزیت اور حاشیائیت کا تصادم نیا نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ وہ کون سے معیارات ہیں، جن کی بنیاد پر کسی کو مرکز میں اور کسی کو حاشیہ میں رکھا جائے؟ ادبی تنقید نے ابھی تک کوئی ایسا واضح معیار متعین نہیں کیا ہے، جس کی بنیاد پر یہ طے کیا جاسکے کہ کون سی تخلیق مرکزی اہمیت کی حامل ہے اور کسے حاشیہ میں رکھنا ہے۔ ادبی تحفظات اور تعصبات نے ماضی میں جن تخلیق کاروں کو حاشیہ پر ڈھکیل دیا تھا وقت کی تبدیلی نے انھیں اب مرکز کا حصہ بنادیا ہے، نظیر اکبرآبادی کی مثال ہمارے سامنے ہے۔

رسالہ 'حاشیہ' کے اجرا کا مقصد تحفظات کے جبر کو توڑنا ہے اور ایک ایسا ادبی منظرنامہ تشکیل دینا ہے جس میں جینوئن فن کاروں کو ان کا صحیح مقام مل سکے، چاہے اس کا تعلق حاشیائی سماج سے ہو۔"

یہ رسالہ اپنے حسن ترتیب، تزئین اور مضامین کے تنوع کے اعتبار سے پہلی نظر میں ہی قاری کو متاثر کرتا ہے۔ مشمولات کا عنوان 'گل و گوہر' بھی اپنے اندر معنویت کا ایک جہاں روشن کیے ہوئے ہے۔ ذیلی عناوین بھی پرکشش ہیں۔ تنقیدی مضامین کو 'صحرا میں شجر' کے عنوان کے تحت شامل کیا گیا ہے۔ اس ذیل میں تین مضامین شائع کیے گئے ہیں۔ امرؤالقیس کی جمالیات شعر (شمس کمال انجم)، ناول تنقید کا وضاحتی اشاریہ (نورین علی حق)، شبلی اور شعرالعجم (حقانی القاسمی)۔

شمس کمال نے جہاں سبعہ معلقہ کے سب سے بڑے عربی شاعر امرؤالقیس کی شاعری کو جمالیاتی تناظر میں سمجھنے کی کوشش کی ہے اور ان کی جمالیاتی تشبیہات اور استعاروں کی نشاندہی کرتے ہوئے ان کے اشعار کو اعلیٰ تخیل کا گنجینہ قرار دیا ہے وہیں نورین علی حق نے ناول پر لکھی گئی تمام اہم تنقیدی کتابوں کا اہم تجزیہ کیا ہے۔ شبلی اور شعرالعجم میں بھی علامہ شبلی نعمانی کے نظام نقد کے حوالے سے گفتگو کی گئی ہے اور یہ واضح کیا گیا ہے کہ شبلی نے اپنی تنقیدی قوتوں اور بصیرتوں کا استعمال یورپ کے اس بیانیے کو رد کرنے میں صرف کیا ہے، جس کی بنیاد جبر پر تھی۔ شبلی نے مغرب کے ثقافتی ادراک کو چیلنج کیا اور مغربی نوآبادیاتی انداز فکر کی مخالفت کی۔ شعرالعجم کے ذریعے انھوں نے تنقید کو نئے نشانات عطا کیے۔

افسانوں کی شمولیت 'سمندر میں آگ' کے عنوان کے تحت کی گئی ہے جو اپنے آپ میں بہت معنی خیز ہے۔ سید ظفر ہاشمی، مشرف عالم ذوقی اور رخشندہ روحی جیسے اہم افسانہ نگاروں کی تخلیقات شائع کی گئی ہیں۔

'مرکز میں حاشیہ' عنوان کے تحت ساہتیہ اکادمی ایوارڈ یافتہ حاشیائی قلم کاروں پر مضامین شائع کیے گئے ہیں۔ ڈاکٹر ہاجرہ بانو نے چندر بھان خیال کی شاعری پر پرمغز گفتگو کی ہے تو اجے مالوی نے جینت پرمار کی شعری کائنات کو اپنی تنقید کا محور بنایا ہے۔ یہ باب مجلہ حاشیہ کا ماحصل ہے کہ اس رسالے کی اشاعت کا بنیادی مقصد حاشیائی سماج سے تعلق رکھنے والے فنکاروں کو مرکزی متن اور حوالے کا حصہ بنانا ہے۔ غزلوں اور نظموں کے لیے 'آب میں آتش' جیسا عنوان قائم کیا گیا ہے تو سفرنامے کے لیے 'جنگل میں شام' جیسا خوب صورت عنوان ہے۔ اس باب میں عارف محمود کسانہ، ناصرنا کاگاوا کے سفرنامے شائع کیے گئے جو نہایت دلچسپ ہیں اور قاری کو باندھے رکھنے میں کامیاب ہیں۔ احمد رشید شیروانی کے افسانے ڈاکٹر کلیم قیصر کی شاعری اور صادقہ نواب سحر کے ناول پر جو تجزیاتی مضامین شامل کیے گئے ہیں انھیں 'قطرے میں دجلہ' کا عنوان دیا گیا ہے۔ یہ تینوں مضامین بہت اہم ہیں۔ اس رسالے میں انٹرویو کی شمولیت بھی کی گئی ہے۔ اس ذیل میں نگار عظیم کا ایک انٹرویو شائع کیا گیا ہے جس میں انھوں نے بڑی اہم بات کہی ہے کہ آج کے دور میں عورت کی ترقی کے ساتھ ساتھ اس کے استحصال کی راہیں بھی بہت تیزی سے ہموار ہوئی ہیں۔ صنعتی نظام اور میٹریلسٹک دور نے عورت کو خطرناک دلدل میں ڈھکیل دیا ہے جہاں وہ ایک شے بن کر رہ گئی ہے۔

رسالہ 'حاشیہ' اپنے مشمولات اور ادارتی خوش سلیقگی کی وجہ سے قاری پر گہرا اثر چھوڑتا ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ اس کا نقش ثانی اس سے اور بہتر ہوگا۔

مختصر تبصرے

چوڑی والا

مصنف: کرن شبنم
صفحات: 100، قیمت: 100 روپے، سنہ اشاعت: 2016، ناشر: تہذیب انٹرپرائزز، نئی دہلی

بچوں کی اخلاقی، ذہنی اور علمی تربیت کے لیے ادب میں بہت کچھ لکھا جاتا رہا ہے۔ اردو اور ہندی میں بچوں کے لیے لکھنے والی ادیبہ کرن شبنم کی کتاب 'چوڑی والا' چھوٹے چھوٹے افسانوں پر مشتمل ہے جو بچوں کو سماجی حالات سے روشناس کراتے ہیں۔ اس کتاب میں چوڑی والا، پھولوں کا شہر، سلطان، ایک چراغ، گورا، یم راج، خوفزدہ، چاند کا روشن رخ، جڑ کہاں ہے، یہ مت کہنا۔ ہائے اللہ میں تو ہندو ہی ہوں، بچھڑا ہنڈا و مہم، ایک بدنام عورت اور افواہیں شامل ہیں۔

چوڑی والا، سلطان، گورا اور بچھڑا ہنڈا و مہم افسانہ سماج کی مفلسی، بدحالی اور ظالمانہ رویے کا کرب بیان کرتا ہے۔ 'ایک چراغ' میں دو محبت کرنے والوں کا درد ہے۔ 'یم راج' ایک غریب خاندان کی کہانی ہے جو بہت محنت سے دہلی کے ایک بینک کے اندر سیکورٹی گارڈ کی نوکری حاصل کرلیتا ہے لیکن چند لٹیرے اسے موت کے گھاٹ اتار دیتے ہیں اور اس کے گھر میں صف ماتم بچھ جاتی ہے۔ دوسرے افسانوں میں آپسی بھائی چارے، رواداری، انسانی اخوت و محبت اور قومی ہم آہنگی کی شیرینی ہر جگہ نمایاں ہے۔

چاندنی تیرانام رہے

مصنف: م ن انصاری

صفحات: 128، قیمت: 81 روپے، سنہ اشاعت: 2016

اس کتاب میں علامتی کرداروں پر مشتمل کہانیوں کے ذریعے بچوں کے اندر انسانی جذبات واحساسات کو ابھارنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مصنف م ن انصاری کا دعویٰ ہے کہ وہ اپنی کہانی کے ذریعے بچوں کو دنیاوی جنت کی سیر کراتے ہیں۔ اس کتاب میں اخلاقی، سماجی، تہذیبی، باہمی اخوت ومروت، اور بچوں کو حوصلہ بخشنے والی کہانیاں بھی ہیں۔ کتاب میں اونٹ رے اونٹ تیری کون سی کل سیدھی، جادوگرنی کا خزانہ، شہد کا سوداگر، جنگل کی ملکہ، چاندنی تیرانام رہے، کوئلے کی پوٹلی، رانی کی الجھن، تیر کمان سے نکل چکا، بندر کی کرامت، سات طلسماتی کہانی، سمندر کے فوارے اور رسہ ٹوٹا مگر شیر مارا گیا جیسی کہانیاں ہیں۔

'اونٹ رے اونٹ تیری کون سی کل سیدھی' بارہ سنگھا کی کہانی ہے جس کا سینگ اونٹ لے لیتا ہے۔ سینگ کو حاصل کرنے کے لیے اونٹ بہت پریشان ہوتا ہے۔ آخر کار ہاتھی کی اچھی تدبیر سے وہ سینگ حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ اس کہانی میں انسانی مکالمے جانوروں کی زبانی کرائے گئے ہیں۔ 'چاندنی تیرانام رہے' یہ جنگلی جانوروں کی کہانی ہے جو شیر کے ظلم سے نڈھال ہیں۔ چاندنی ماری جاچکی ہے اور اب سونی پورے آب وتاب کے ساتھ شیر سے مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہے۔ سونی اپنی حکمت عملی سے شیر کو ایک گہری کھائی میں ڈھکیلنے میں کامیاب ہوجاتی ہے۔ اس کہانی سے بچوں کے اندر آزادی اور اپنے حق کے لیے جدوجہد کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

اسی طرح دوسری کہانیاں بھی بہت سبق آموز ہیں۔

ریشم سازی

مصنف: ڈاکٹر ایم ایم شیخ

صفحات: 112، قیمت: 100 روپے، سنہ اشاعت: 2016

ناشر: اختر بانو، روضہ باغ، اورنگ آباد

ریشم سازی قدیم ترین صنعت ہے، لیکن زمانہ قدیم میں یہ بہت خفیہ رکھا جاتا تھا، ریشم کے کپڑے ہر شخص کو پہننے کی اجازت نہیں تھی، بلکہ رئیس طبقہ ہی اس کا استعمال کرسکتا تھا۔ رفتار زمانہ کے ساتھ ریشم سازی کی صنعت کو عوامی سطح پر ترقی حاصل ہوتی گئی اور اب ریشم سازی کی صنعت نہ صرف عام ہے بلکہ حکومتی سطح پر اس کے فروغ کے لیے کوششیں کی جارہی ہیں۔ اس کتاب کے مصنف ڈاکٹر ایم ایم شیخ ماہر حشرات الارض (Entomologist) ہیں۔

اردو میں ریشم سازی کے سلسلے میں مواد کے فقدان نے انھیں اس کتاب کی تصنیف پر ابھارا۔ اس کتاب کے عنوانات میں 'ریشم بنانے کی صنعت، ریشم کی صنعت کے تعلق سے مفید اور ضروری باتیں، ریشم کے کیڑوں کی پرورش کرنے کے لیے گھر، سلک ماتھ کے لاروے کی پرورش ونگہداشت کے لیے استعمال میں آنے والی چیزیں، لاروے کی نگہداشت کرنے کے لیے بنیادی تیاریاں، شہتوت کی کاشت، ریشم یا سلک کی خصوصیات، شہتوت کے کیڑوں پر لاروے کی نگہداشت اور ریشم کے لاروے کی بیماریاں اور ان کا علاج' شامل ہیں۔ اس صنعت کے فروغ کے لیے تصویر کے ذریعے مصنف نے بہت آسان زبان میں سمجھایا ہے۔ اس کتاب کو بچوں کے نصاب میں امدادی کتب کے طور پر شامل کیا جانا بہت ہی مفید ثابت ہوسکتا ہے۔

گرہن کیاہے

مصنف: انیس الحسن صدیقی

صفحات: 48، قیمت: 25 روپے، سنہ اشاعت: 2016

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس

سورج گرہن اور چاند گرہن کے متعلق سماج میں بہت سے نظریات اب بھی قائم ہیں، لیکن اس کی کوئی سائنسی حیثیت نہیں، ماہرین علم ہیئت نے اپنے مطالعات کی روشنی میں سورج اور چاند گرہن کو خلائی اجرام کے الٹ پھیر کو اہم عوامل بتایا ہے۔ یہ کتاب سائنسی بنیادوں پر لکھی گئی ہے۔

مصنف نے اس کتاب کو نصابی اعتبار سے تقسیم کیا ہے۔ سبق اول: 2009 اور 2020 سال گرہن، سبق دوم: گرہن کیا ہے؟ سبق سوم: گرہنوں کی قسمیں، سبق چہارم: سورج گرہن کا مشاہدہ کرنے کے طریقے اور سبق پنجم: سورج گرہن اور چاند گرہن کے فائدے، جیسے اسباق کے ذریعے سورج اور چاند گرہن کے بارے میں سائنسی دلائل سے ساری باتیں بتائی گئیں۔ 'مشق سوالات میں جانچ کے لیے سوالات قائم کیے گئے ہیں۔ اسی طرح کچھ ایسی سائنسی اصطلاحیں ہیں جس کو سمجھنا ضروری ہے۔ 'فرہنگ' کے عنوان سے مشکل الفاظ سمجھائے گئے ہیں۔ کتاب میں چاند اور سورج گرہن کو تصویری مثالوں سے سمجھایا گیا ہے۔ سورج گرہن پر احتیاطی تدابیر، سورج گرہن کو کیسے دیکھنا چاہیے، اس بارے میں پوری تفصیل سے سمجھایا گیا ہے۔ یہ کتاب خاص طور سے بچوں کو مخاطب کرکے لکھی گئی ہے۔ بیجا بحث، طوالت، ثقیل الفاظ کے استعمال سے پوری طرح یہ کتاب محفوظ ہے۔ یہ کتاب بچوں کے لیے شامل نصاب کیا جانا چاہیے تاکہ انھیں سورج گرہن کے متعلق اہم باتیں اردو میں معلوم ہوسکیں۔

کہانیاں (بچوں کے لیے)

مصنف: ایڈوکیٹ حبیب رتھ پوری

صفحات: 64، قیمت: 25 روپے، سنہ اشاعت: 2016

زیر نظر کتاب 'کہانیاں' بچوں کو سوچنے، سمجھنے اور فیصلہ لینے پر مہمیز کرتی ہے۔ اس کتاب کے مصنف حبیب رتھ پوری نے اپنی پوری زندگی بچوں کی تعلیم وتربیت میں گزاردی اور اب بھی کہانی اور افسانوں کے ذریعے بچوں کی صالح تربیت کا فریضہ انجام دے رہے ہیں۔ یہ کہانیاں ان کے مشاہداتی اور تجرباتی زندگی کا نچوڑ ہیں اور ہر ایک کہانی میں کوئی نہ کوئی سبق پوشیدہ ہے۔ 'ایثار' میں قاسم کی غربت کے باوجود ایثار کا جذبہ کس قدر بچوں پر اثرانداز ہوتا ہے۔ 'فیصلہ' میں ناہید کی قربانی کس طرح بچوں کو سماجی اور فلاحی کاموں پر رغبت دلاتی ہے۔ 'ناقابل فراموش' میں جنید کے حسن سلوک نے رحمٰن کو پروفیسر رحمٰن بنادیا۔ 'ثواب' میں بیٹی نے ماں اور باپ کو والدین سے حسن سلوک اور ان کی تعظیم کا حقیقی مطلب سمجھا دیا۔ 'دیانت داری' میں متین کی دیانت داری بچوں پر اثرانداز ہے۔ وقت، حساب، ثواب اپنی نوعیت کی منفرد اور سبق آموز کہانیاں ہیں۔ اسی طرح آوازیں، پہاڑ اور ندی، تتلیاں اور حشرات الارض خاص عملی تجربات پر مبنی کہانیاں ہیں۔ مصنف نے بچوں کو نصیحت دینے کے لیے جو طریقہ اپنایا ہے، وہ نہ تو ناصحانہ ہے، نہ روایتی۔ بلکہ وہ طریقہ ایسا ہے جو کچھ بھی نہ کہتے ہوئے بہت کچھ کہہ جاتے ہیں اور بچوں کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کردیتے ہیں اور کسی بھی کہانی کا یہی سب سے خاص کمال ہے۔

مبصر: محمد رضا فراز، M-54A، طلہ ہاؤس، جامعہ نگر، نئی دہلی 25

خبرنامہ

قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں

خبرنامہ

قومی اردو کونسل میں نیچرل سائنس پینل کی میٹنگ

نئی دہلی: تواتر کے ساتھ قومی اردو کونسل کے پینلوں کی میٹنگ کے انعقاد کی وجہ سے کونسل میں پیش کردہ مسودے کی اشاعت میں کافی فعالیت آئی ہے۔ ہمارے جو منصوبے اور اسکیمیں ہیں اس میں کونسل بہت حد تک کامیاب ہے۔ پچھلی میٹنگ میں جو مسودے منظور کیے گئے تھے دو چار کو چھوڑ کر سارے مسودے اشاعت کے قریب ہیں۔ یہ باتیں کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے نیچرل سائنس پینل کی میٹنگ میں کہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ جو کتابیں اشاعت کے مرحلے میں ہیں ان میں خصوصی طور پر آبی آلودگی، کیمیائی آلودگی، صوتی وجینیٹی آلودگی اور متوازن غذا شامل ہیں۔ اس کے علاوہ انیس الحسن صدیقی کی کتاب 'خلا میں ہندوستانی پروگرام کی جھلکیاں' فلکیاتی بست اور فلکیاتی نظارے ہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ زبان و ادب کی ترقی اسی وقت ممکن ہے جب ہم سائنسی علوم وفنون کو ترجیحی طور پر اپنے اشاعتی منصوبے میں شامل کریں گے۔

اس میٹنگ کی صدارت پروفیسر اختشام حسنین (شیخ الجامعہ ہمدرد یونیورسٹی) نے کی۔ انھوں نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ اس پینل کا مقصد یہ ہے کہ اردو داں طبقہ کو آئے دن ہونے والی سائنسی ایجادات اور سائنسی معلومات کی جانکاری فراہم کی جائے۔ اس سمت کونسل کی کارکردگی قابل ستائش ہے اور بالخصوص کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم مبارکباد کے مستحق ہیں جنھوں نے اپنی سربراہی میں قلیل مدت میں اس کام کو انجام دیا۔

اس میٹنگ میں جن مسودوں کو منظوری دی گئی ان میں عبدالودود انصاری کی 'آؤ سائنسی خط لکھیں، یہ بدن کے حصے حصے، یہ جسم وجان، یہ پیڑ پودے، یہ آب وہوا، یہ مہینے اور موسم اور یہ زمین' قابل ذکر ہیں۔ اس موقع پر پینل کے دوسرے ممبران نے بھی اپنے خیالات پیش کیے۔

قومی اردو کونسل میں نیچرل سائنس پینل کی میٹنگ

میٹنگ میں پروفیسر اختشام حسنین، ڈاکٹر شمس الاسلام فاروقی، ڈاکٹر رفیع الدین ناصر اور کونسل کے پرنسپل پبلی کیشن آفیسر ڈاکٹر شمس اقبال، اسسٹنٹ ڈائرکٹر اکیڈمک شمع کوثر یزدانی، اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر جناب فیروز عالم، ریسرچ اسسٹنٹ محترمہ ذیشان فاطمہ، محترمہ شہناز اختر اور ڈاکٹر شاہد اختر نے بھی شرکت کی۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 17 جنوری 2017

فارسی کے بغیر اردو زبان وادب کی تفہیم وتدریس مشکل ہے

قومی اردو کونسل میں فارسی زبان وادب پینل کی میٹنگ کا انعقاد

نئی دھلی: فارسی ایک ایسی کلاسیکی زبان ہے جس کی تاریخ ہندوستان میں کم وبیش آٹھ سو سالوں پر محیط ہے، یہ ہندوستان کی مشترکہ تہذیب وثقافت کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ میں یہ بات بار بار کہتا آرہا ہوں کہ فارسی کے بغیر اردو زبان وادب کی تفہیم و تدریس مشکل ہے۔ اس لیے حکومت ہند نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کو یہ

قومی اردو کونسل میں فارسی زبان وادب پینل کی میٹنگ کا انعقاد

مینڈیٹ دیا ہے کہ اردو زبان کے فروغ کے ساتھ ساتھ عربی وفارسی زبان کو بھی فروغ دیا جائے۔ اس تعلق سے کونسل نے دیگر پینلوں کی طرح فارسی پینل کی تشکیل کی ہے۔ فارسی زبان میں تنقید، تحقیق اور شاعری کے جو سرمائے اور ذخیرے موجود ہیں اسے اردو میں ترجمے کے ذریعے عام اردو قاری تک پہنچایا جائے۔ آج کی میٹنگ اس تعلق سے اہم رہی ہے کہ کچھ اہم موضوعات کے ساتھ ساتھ مسودے اور مخطوطات کے تراجم کے فیصلے بھی لیے گئے۔ یہ باتیں قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے پینل برائے فارسی زبان وادب کی منعقدہ میٹنگ میں کہی۔ انھوں نے مزید کہا کہ اگلے دو تین مہینے میں فارسی کے کچھ اہم موضوعات پر کتابیں اشاعت کے مرحلے تک پہنچ جائیں گی۔ اس حوالے سے اگر دیکھا جائے تو فارسی پینل اپنی ذمے داریوں کو بخوبی نبھا رہا ہے۔ آج کی اس میٹنگ کی صدارت پروفیسر چندر شیکھر نے کی، انھوں نے کہا کہ فارسی و اردو ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں۔ اچھی اردو کے لیے فارسی زبان کا جاننا بھی ضروری ہے۔

اس موقعے پر پروفیسر آذرمی دخت صفوی نے کہا کہ کونسل کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ اردو زبان وادب کے ساتھ ساتھ فارسی زبان وادب کو بھی بڑھاوا دیا جائے۔ انھوں نے کہا کہ ہندوستان میں فارسی زبان وادب کی تاریخ سے متعلق ایک تجویز جس پر آئندہ میٹنگ میں تفصیلی گفتگو کی جائے گی۔ اس پروجیکٹ سے یہ باتیں سامنے آئیں گی کہ شمال سے جنوب اور مشرق سے مغرب تک جب یہ زبان پھیلی ہوئی تھی تو اس میں کیا کیا ذخیرے، کون کون سی کتابیں اور کون کون سے شعرا و ادبا ہندوستان کے تھے جنھوں نے اس کلاسیکی زبان میں تصنیف و تالیف کے کام انجام دیے۔ اس کے علاوہ دوسرے اہم موضوعات پر بھی غور وخوض کیا گیا۔

اس میٹنگ میں پروفیسر چندر شیکھر، پروفیسر شریف حسین قاسمی، پروفیسر آذرمی دخت صفوی، پروفیسر طلحہٰ رضوی برق، پروفیسر وجیہ الدین، پروفیسر عمر کمال الدین، پروفیسر سید حسن عباس، پروفیسر اختر مہدی کے علاوہ کونسل کے پرنسپل پبلی کیشن آفیسر ڈاکٹر شمس اقبال، محترمہ شمع کوثر یزدانی، جناب فیروز عالم، محترمہ مسرت جہاں اور ڈاکٹر شاہد اختر نے شرکت کی۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 25 جنوری 2017

ترجموں کے ذریعے ہی اردو قارئین نئے موضوعات سے متعارف ہو سکتے ہیں

قومی اردو کونسل میں سوشل سائنس پینل کی میٹنگ

نئی دھلی: اردو زبان ایک ایسی زبان ہے جس میں اتنی لچک اور اتنی جاذبیت ہے کہ دوسری زبانوں کے علوم وفنون کے اظہار کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ اس حوالے سے آج کی میٹنگ میں جو اہم فیصلے لیے گئے ان میں ہندوستان کے سرکاری ادارے مثلاً: نیشنل بک ٹرسٹ، این سی ای آر ٹی جس نے سوشل سائنس کے حوالے سے اہم موضوعات پر کتابیں شائع کی ہیں۔ ان کتابوں کو اردو میں ترجمہ کرایا جائے۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا بھی یہی مینڈیٹ ہے۔ اگر ہم صرف اپنے شاعروں اور ادیبوں کی بات کریں گے تو شاید ہم اپنے اہداف کو نہیں پار کر پائیں گے۔ آج کے عہد میں تخلیق سے زیادہ سائنسی وسماجی مضامین کے ترجموں کی ضرورت ہے کیوں کہ ترجموں کے ہی ذریعے آج کے زمانے کے نئے علوم وفنون اور موضوعات ومسائل سے اردو قارئین متعارف ہو سکتے ہیں۔ یہ باتیں قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کونسل کے صدر دفتر میں منعقدہ سوشل سائنس پینل کی میٹنگ میں کہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ نیشنل بک ٹرسٹ کے 12 ایسے موضوعات پر مشتمل کتابیں جسے پینل نے منظوری دی

قومی اردو کونسل میں سوشل سائنس پینل کی میٹنگ

ہے، بہت جلد شائع ہو کر منظر عام پر آئیں گی۔ جیسے: آگمن باڑی فار آل، ڈیموکریسی ان انڈیا، گلوبلائزیشن اینڈ ڈویلپمنٹ، انڈیا ایگریکلچرسنس انڈی پنڈینٹ، پاپولیشن آف انڈیا ان دی نیو ملینیم وغیرہ اردو قارئین کے لیے نہایت اہم موضوعات ہیں۔

اس پینل کی صدارت محترمہ سیدہ سیدین حمید نے کی۔ انھوں نے گزشتہ ایک سال کے اندر تین بار میٹنگ منعقد کرانے پر کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم کو مبارک باد پیش کی اور پینل کی کارکردگی پر مسرت کا اظہار کیا۔ انھوں نے کہا کہ جس دلجمعی کے ساتھ کونسل کے ارکان کام کر رہے ہیں وہ قابل ستائش ہے۔ اس موقع پر پروفیسر رضوان قیصر، جناب نریش ندیم نے بھی مشورے دیے۔

اس میٹنگ میں سیدہ سیدین حمید، پروفیسر ایم ایچ قریشی، پروفیسر رضوان قیصر، محترمہ عذرا عابدی، ڈاکٹر پیرزادہ فہیم الدین، ڈاکٹر مظفر اسلام ڈاکٹر افروز عالم، ڈاکٹر سلیم محی الدین، ڈاکٹر محمد داؤد محسن، محترم سجاد عالم رضوی، جناب نریش ندیم، کے علاوہ کونسل کے پرنسپل پبلی کیشن آفیسر ڈاکٹر شمس اقبال، محترمہ شمع کوثر یزدانی (اسسٹنٹ ڈائرکٹر، اکیڈمک)، محترمہ ذیشان فاطمہ، جناب فیروز عالم (اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر)، شہناز اختر اور ڈاکٹر شاہد اختر نے بھی شرکت کی۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 15 فروری 2017

مدارس کو عصری علوم سے جوڑنا وقت کی اہم ضرورت: پروفیسر ارتضیٰ کریم

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، حکومت ہند، نئی دہلی اور مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد کے اشتراک سے دس روزہ اورینٹیشن پروگرام برائے اساتذۂ مدارس کا افتتاح

حیدرآباد: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، حکومت ہند، نئی دہلی کے تعاون سے مرکز پیشہ ورانہ فروغ برائے اساتذۂ اردو ذریعۂ تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد میں 7 فروری 2017 کو دس روزہ تربیتی پروگرام کا افتتاح عمل میں آیا۔ اس موقع پر کلیدی روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ قومی کونسل اردو زبان و ادب کے فروغ کے لیے مسلسل کوشاں ہے اور ہم یہ بھی چاہتے ہیں کہ ملک میں موجودان مدارس کو عصری علوم اور فنون سے بھی لیس کیا جائے جو ہماری ذمے داری ہے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ ہمارے مدارس موجودہ عہد کے مدارس کو عصری علوم اور تقاضوں سے خوف زدہ ہونے کی جگہ ہم آہنگ ہونے کی ضرورت ہے۔

پروگرام کی نظامت پروفیسر محمد محمود صدیقی صاحب نے فرمائی۔ پروفیسر ایچ خدیجہ بیگم، ڈائرکٹر، مرکز پیشہ ورانہ فروغ برائے اساتذۂ اردو ذریعۂ تعلیم، مولانا آزاد

خطبہ پیش کرتے ہوئے مولانا خالد سیف اللہ رحمانی نے فرمایا کہ قرآن اور اسلام کو عصری علوم اور وسائل سے کسی طرح کا پرہیز نہیں ہے شرط یہ ہے کہ عصری علوم کو مثبت کاموں کے لیے استعمال کیا جائے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ مذہب اسلام اور مدارس نے ہر زمانے کے وسائل اور علوم کو اس عہد کے مطابق اپنانے کی کوشش کی ہے۔

صدارتی تقریر فرماتے ہوئے وائس چانسلر، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد ڈاکٹر محمد اسلم پرویز نے موضوع کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ تعلیمی اداروں کو عصری تقاضوں کے شانہ بہ شانہ چلنا چاہیے چونکہ عصری تقاضوں سے چشم پوشی مناسب نہیں ہے۔ دینی مدارس کے فارغین کو عصری تعلیم سے جوڑنے کی ہر ممکن کوشش کی جائے گی۔

اس موقعے پر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر ارتضیٰ کریم نے پروگرام کی غرض و غایت پر تفصیلی مسائل سے واقف ہوں اور ان کے حل کے لیے جو وسائل موجود ہیں ان سے خاطر خواہ فائدہ اٹھائیں۔ دس دن کا یہ تربیتی پروگرام دراصل اسی سلسلے کی ایک کوشش ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ مدارس سے وابستہ اساتذہ طالب علموں میں ایسا ذوق و شوق پیدا کریں جس سے عصری علوم کی طرف ان کی رغبت بڑھے اور عصری علوم کو وہ علم نافع کے طور پر برتنے کی کوشش کریں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ اساتذہ بچوں کی کردار سازی پر بھی دیانت داری کے ساتھ غور کریں۔ مشکل یہ ہے کہ فی زمانہ تعلیم تو عام ہو رہی ہے مگر صحیح تربیت نہ ہونے کی وجہ سے وہ تعلیم جو ہمارے لیے منفعت بخش ہو سکتی تھی وہ کج روی، انتشار اور منافرت کا سبب بنتی جا رہی ہے۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ تعلیم کے ساتھ ہمارے اساتذہ اور والدین بچوں کی تربیت کی جانب زیادہ توجہ دیں۔ دینی نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد نے مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے اپنے مرکز کا تفصیلی تعارف بھی پیش کیا اور اس سلسلے میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ پروفیسر کریم کا دل جس طرح اردو کے لیے دل گداز ہے وہ ملک میں موجود مدارس کے طلبہ کے لیے بھی ہمیشہ فکر مند رہتے ہیں۔ یہاں اورینٹیشن پروگرام میں ان کی موجودگی اس بات کا ثبوت ہے۔ پروگرام کے اختتام پر جناب مصباح انظر، اسسٹنٹ پروفیسر، مرکز پیشہ ورانہ فروغ برائے اساتذۂ اردو ذریعۂ تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد نے تمام مہمانوں، شرکا اور پریس کا تہہ دل سے شکریہ ادا کیا اور امید ظاہر کی کہ دس دن تک چلنے والا یہ تربیتی پروگرام کامیابی سے ہم کنار ہوگا۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 7 فروری 2017

اردو نے جمہوری قدروں کے فروغ اور اشاعت میں اہم رول ادا کیا: ڈاکٹر شمس اقبال

قومی اردو کونسل میں یوم جمہوریہ کے موقع پر پرچم کشائی کی تقریب

نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند کے صدر دفتر میں یوم جمہوریہ کے موقع پر پرچم کشائی کی تقریب کا انعقاد کیا گیا۔ اس میں کونسل کے ذمے داران اور عملے نے شرکت کی۔ قومی اردو کونسل کے پرنسپل پبلی کیشن آفیسر ڈاکٹر شمس اقبال نے پرچم کشائی کی۔ کونسل کے عملے نے ہندوستانی قومی ترانہ 'جن گن من' بلند آواز سے پیش کیا اور سبھی اسٹاف نے ترنگے کو سلامی دی۔ اس موقع پر ڈاکٹر شمس اقبال نے کہا کہ یوم جمہوریہ ہمارے لیے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اردو زبان سے بھی جمہوریت کا بہت گہرا تعلق ہے۔ جمہوری قدروں کے فروغ اور اشاعت میں اردو زبان نے جو خدمات انجام دی وہ ناقابل فراموش ہیں۔ اردو کا یہی جمہوری مزاج ہے جس کی وجہ سے اس کو عالمی سطح پر محبوبیت اور مقبولیت نصیب ہے۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 26 جنوری 2017

قومی اردو کونسل کے مالی تعاون سے

اردو فکشن کے سو سال

پٹنہ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی کے زیر اہتمام، بہار اردو اکادمی، پٹنہ کے اشتراک سے 28 اور 29 جنوری کو پورے علمی وقار کے ساتھ 'اردو فکشن کے سو سال: تحقیق و تنقید' کے زیر عنوان دو روزہ قومی سیمینار کا انعقاد ہوا۔ اس سیمینار کا افتتاح وزیر اقلیتی فلاح و بہبود ڈاکٹر عبدالغفور کے ذریعہ شمع افروزی سے ہوا۔ جناب شفیع جاوید کی صدارت میں ہونے والے افتتاحی اجلاس میں پروفیسر ارتضیٰ کریم ڈائرکٹر قومی کونسل نے اپنے تعارفی کلمات سے نوازا اور مہمانان خصوصی پروفیسر مصاعد قدوائی، ڈاکٹر اظفر شمسی اور پروفیسر اعجاز علی ارشد نے اپنے برجستہ تاثرات پیش کئے جب کہ کلیدی خطبہ کی ذمے داری پروفیسر قدوس جاوید نے ادا کی۔ اس موقع پر سکریٹری اکادمی جناب مشتاق احمد نوری نے اپنے استقبالیہ خطاب میں کلمات تشکر کے ساتھ مہمانوں کا تعارف پیش کیا۔

اس موقعے پر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے نہایت ہی بلیغ اور شگفتہ انداز خطابت سے کام لیتے ہوئے تقریب کا تعارف پیش کیا اور اسے تاریخی سیمینار بتاتے ہوئے اس کے ادبی اغراض و مقاصد کی وضاحت کی۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ شکایت کی بجائے ہمیں ٹھوس تجاویز کی پیش کش سے دلچسپی ہونی چاہیے۔ ڈائرکٹر موصوف نے پر یقین لہجے میں کہا کہ اس سیمینار سے نقد و ادب اور فکشن کی ترقی کے لیے نئی راہیں کھلیں گی اور نئی کونپلیں پھوٹیں گی۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم نے شرکائے سیمینار کا بلیغ تعارف کراتے ہوئے انھیں کلمات تشکر نذر کیا، ادبی احوال و مزاج پر اپنی تشویش ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ محض چھپ جانے کے ساتھ ادبی بلوغت کبھی نہیں آتی۔ اصل یہ ہے کہ افسانہ چند لفظوں میں کچھ آگ چھپائے رہتا ہے اور وہ آگ قاری میں جب منتقل ہو جائے تب ہی فن کار کامیابی پاتا ہے۔

اس موقعے پر وزیر محترم ڈاکٹر عبدالغفور نے اپنے افتتاحی خطاب میں کہا کہ یہ ایک تاریخ ساز موقع ہے اور وقت کا تقاضہ یہ ہے کہ ہمارے لکھنے والے معاشرے کو کچھ دینے کے لیے لکھیں اور ہر حال میں سماج کی بہتری کے لیے سوچیں اور ادب سے وقت کی رہبری کا کام لیں۔ ڈاکٹر عبدالغفور نے کہا کہ بہترین فکشن بہترین ذہانت رکھنے والے قلم سے ہی وجود میں آتا ہے اور آسکتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ آج ذہین افراد کو تحریری دنیا میں آنے کا نفسیاتی حوصلہ دلانے اور نئے لکھنے والوں کی کمی کے اسباب پر سوچنے کی ضرورت ہے۔

سیمینار کے افتتاحی اجلاس میں پروفیسر قدوس جاوید

نے 'معاصر افسانہ اور ویژن' کے موضوع پر اپنا کلیدی خطبہ پڑھتے ہوئے کہا کہ افسانے میں حقائق سے کشید کیا ہوا ویژن ہونا ضروری ہے۔ انھوں نے بہار کے افسانہ نگاروں کو خصوصیت سے اپنے مطالعہ میں شمولیت دیتے ہوئے کہا کہ اکیسویں صدی میں اصلاً افسانے کی تخلیق کا مرکزی نقطہ افسانہ نگار کا ویژن ہی ہے جو اسے تخلیق پر آمادہ کرتا ہے۔ ویژن نہ ہو تو افسانہ قصہ ہے، معاصر افسانہ نہیں۔ افسانہ فطری ویژن کے ساتھ جینے کی چیز ہے اور بہار کے افسانہ نگاروں کے یہاں ویژن بخوبی پایا جاتا ہے۔

اس موقع پر مصاعد قدوائی نے اپنے خطاب میں ادب لطیف کی افسانوی اور غیر افسانوی تقسیم کا فرق بتاتے ہوئے کئی تاریخی نکات واضح کیے اور فلیٹ فکشن، مائیکرو فکشن کے تعلق سے اہم معلومات پیش کرتے ہوئے کہا کہ یہ جدید طرز ادب ہرگز نہیں بلکہ اس کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ جناب قدوائی نے کہا کہ تفریحی ادب اور ادب اطفال کی طرف بھی مزید توجہ کی ضرورت ہے۔

اظفر شمسی نے اپنے مختصر خطاب میں فکشن کے مختلف ادوار کی خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ پریم چند کی معنویت آج بھی مسلم ہے۔

پروفیسر اعجاز علی ارشد نے اس سمینار کے موضوع اور اس میں دانشوران علم و ادب کے اجتماع کو نہایت اہم بتاتے ہوئے کہا کہ فکشن میں بہر حال ہر موضوع کو لینا ہرگز ضروری نہیں۔ ہمیں موضوع و مواد کے انتخاب میں یہ خیال رکھنا چاہیے کہ تہذیب سے یکسر انحراف کی نوبت نہ آئے۔

جناب شفیع جاوید نے اپنے صدارتی خطاب میں فکشن نگاری کو ایک مشکل فن بتاتے ہوئے اس میں فکر و تفکر کی لازمی شمولیت پر توجہ دلائی۔ جناب صدر نے جلسہ کو تاریخی اور بہار کے لیے باعث فخر بتایا اور کہا کہ وزیر محترم ڈاکٹر عبدالغفور نے خلوص و نیک نیتی سے ایک تاج محل کھڑا کیا ہے جس کے ایک طرف جناب ارتضیٰ کریم ہیں اور دوسری طرف مشتاق احمد نوری اور ہماری دعا ہے اور ہمیں یقین ہے کہ اردو کے لیے خلوص کا یہ محل تا دیر کوہ نور ہیرے کی طرح چمکتا رہے گا۔ اس موقع پر پروفیسر ابوالکلام قاسمی کی کتاب 'اردو فکشن کے مضمرات' اور رسالہ 'امروز' کا اجرا بھی عمل میں آیا۔ افتتاحی اجلاس جناب سلطان اختر کے شکریہ کی تجویز پر ختم ہوا۔

افتتاحی اجلاس کے بعد پہلا اجلاس پروفیسر علیم اللہ حالی اور جناب کیول دھیر کی مشترکہ صدارت میں ہوا۔ اس اجلاس میں پروفیسر حسین الحق، اسلام بن رزاق، جناب اسرار گاندھی، جناب عبدالصمد اور پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے پر مغز مقالے پیش کیے۔

پروفیسر علیم اللہ حالی نے اپنے مختصر مگر جامع صدارتی خطاب میں کہا کہ آرٹ کے توسط سے ویژن کا حصول بہر حال ہونا چاہیے، مگر یہ بھی خاطر نشان رہے کہ کہانی میں کوئی جز ولایعنی نہیں ہوتا ہے۔ کردار حصول ویژن کے لیے واسطہ ہوتے ہیں اور قصے، مکالمے کی اہمیت بھی مسلم ہے انھوں نے کہا کہ ادبی شہ پاروں کی سماعت میں اکتاہٹ ادب سے وابستگی کے کمزور ہونے کا ایک اشاریہ ہے اور ہمیں اس کی طرف بھی توجہ دینی چاہیے۔ جناب حالی نے اس سمینار کو معیاری بتاتے ہوئے بلند پایہ افسانوں اور مقالوں کی پیش کش پر اطمینان و مسرت کا اظہار کیا۔

دوسرے اجلاس کا انعقاد جناب شفیع مشہدی، پروفیسر حسین الحق اور ڈاکٹر قاسم خورشید کی مشترکہ صدارت میں ہوا، جس میں جناب صغیر رحمانی، مشتاق احمد وانی، قاسم خورشید، کیول دھیر، اسلم جمشید پوری، مشتاق صدف نے معنویت سے بھرپور مقالے پیش کیے۔

اس موقعے پر شفیع مشہدی نے اپنے مختصر صدارتی خطبہ میں افسانہ نگاروں اور مقالہ نگاروں کی کوششوں کو نہایت معیاری قرار دیتے ہوئے کہا کہ کہانیاں سننے سے افسانوی سفر کے سمت و رفتار کا بآسانی اندازہ ہوتا ہے اور سنجیدہ تنقید میں اس سے مدد ملنا لازمی ہے۔ جناب صدر نے اس بات کی طرف بھی دوران خطاب توجہ دلائی کہ اردو میں اب تک دلت ادب پر خاطر خواہ توجہ کی کمی کا احساس ہوتا ہے جس کے اسباب پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ واضح رہے کہ سمینار کے پہلے دن سبھی اجلاس کی نظامت کے فرائض سکریٹری اکادمی مشتاق احمد نوری نے انجام دیے اور دوران نظامت کئی برجستہ نکات کی طرف بھی اشارے کیے۔

دوروزہ قومی سیمینار کے دوسرے دن، 29 جنوری کو پروگرام کا آغاز ساڑھے دس بجے دن سے ہوا اور حسب سلسلہ پہلے دن کے افتتاحی اور پہلے، دوسرے اجلاس کے بعد، دوسرے دن کے 'تیسرے اجلاس' میں محترمہ ترنم جہاں شبنم نے 'روٹی اور بھوک' محترمہ غزالہ قمر اعجاز نے 'مٹی کا بتوا' محترمہ غزال ضیغم نے 'مدھوبن میں رادھیکا' پروفیسر مہہ جبیں غزال نے 'بے جڑ کا پودا' محترمہ نگار عظیم نے 'ایک زندہ کہانی' اور محترمہ ذکیہ مشہدی نے 'چوٹھا' کے عنوان سے اپنے اپنے افسانے پیش کیے جب کہ محترمہ تسنیم کوثر، محترمہ زرنگار یاسمین، محترمہ صادقہ نواب سحر، پروفیسر قمر جہاں نے اپنے اپنے مقالات میں متعلقہ موضوع پر نہایت گرانقدر نکات و مضمرات سے نوازا۔ اس اجلاس کی مشترکہ صدارت کے فرائض انجام دیتے ہوئے جناب انجم عثمانی نے فکشن کے روشن مستقبل پر اپنے یقین کا اظہار کیا اور پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے اس موقع پر پیش کردہ افسانوں اور مقالوں کا تجزیہ کرتے ہوئے انھیں اپنے برجستہ تجزیاتی کلمات سے نوازا۔

'چوتھے اجلاس' میں محترمہ انجم قدوائی نے 'ریت کا مانجھی' جناب مشتاق احمد نوری نے 'جن کی سواری' اور جناب شموئل احمد نے 'گھر واپسی' کے عنوان سے اپنی اپنی کہانیاں پیش کیں جبکہ پروفیسر اعجاز علی ارشد نے بھولے بسرے فن کار اے۔ خیام پر 'وہ ایک نام جو اپنے ہی شہر میں گمنام ہے' کے عنوان سے ایک خصوصی تحریر پیش کی۔ اس اجلاس میں جناب صفدر امام قادری نے اپنے پر مغز مقالے میں حوالہ سنین اور اعداد و شمار کے ساتھ بعض اہم اور مفید نکات پر توجہ دلائی اور برجستہ علمی سوالات اٹھائے۔

اس سیشن کی مشترکہ صدارت کے فرائض انجام دیتے ہوئے محترمہ نگار عظیم نے اسے ایک کامیاب سیشن بتایا اور کہا کہ یہ 'بہار میں بہار' کے مصداق ہے۔ پروفیسر جاوید حیات نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ تنقید و تحقیق میں تخلیق یک گونہ ہم آہنگ ہوتی ہے اور خوشی کی بات ہے کہ اس محفل میں مفید علمی نکات کھل کر سامنے آئے ہیں۔ جناب عبدالصمد نے قومی کانسل کے ڈائرکٹر اور بہار اردو اکادمی کے سکریٹری کو کلمات تہنیت سے نوازتے ہوئے کہا کہ فکشن تنقید کے باب میں جن نکات کی نشاندہی ہوئی ہے، ان کی ضرورت و اہمیت مسلم ہے۔

'پانچویں اجلاس' میں جناب خورشید حیات نے 'اسے کہانی مت کہو' جناب علی امام نے 'نیم کے پودے کی ہوا' جناب صدیق عالم نے 'دو سارس کی اوڈیسی' اور جناب انجم عثمانی نے 'ڈھلواں چٹان پر لیٹا آدمی' کے زیر عنوان اپنی اپنی کہانیوں سے نوازا جب کہ پروفیسر طارق چھتاری نے اپنے نئے ناول 'آسمان منزل' کے ایک حصہ سے سامعین کی ضیافت کی۔ اس اجلاس میں پروفیسر خواجہ اکرام الدین نے 'چند اہم ہم عصر کہانیاں اور ان کے سماجی سروکار' پر اپنے پر مغز فکری مقالے کی تلخیص پیش کی۔ حقانی القاسمی نے 'اردو کے اہم افسانہ نگاروں کی خدمات' کا بہار کے حوالے سے مبسوط جائزہ پیش کیا۔

اس اجلاس کی مشترکہ صدارت جناب صفدر امام قادری اور جناب شموئل احمد نے فرمائی۔ جناب قادری نے اپنے صدارتی خطاب میں اس محفل کو اہم شخصیات کا اجتماع قرار دیا اور کہا کہ ہم عصر افسانہ نگاروں کے پاس یقیناً اہم صنفی اکتسابات ہیں اور بہر حال جدیدیت کے

بعد فکشن نگاروں کی تخلیقات ہر لحاظ سے متون کی راست وتمین قرات کے ساتھ تنقیدی وتجزیاتی گفتگو کے لیے لائق التفات سرمایہ بننے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ جناب شمویل احمد نے اپنے صدارتی خطاب میں فرمایا کہ ناقد کولکڑ ہارے کا رول نہیں ادا کرنا چاہیے کیونکہ بہرحال تخلیق کار ہی سے ناقد چمکتا ہے آج ضرورت ہے کہ فکشن تنقید کے لیے نئے ڈکشن سے کام لیا جائے اور تخلیق کار کی غالب حیثیت کا احساس رکھا جائے۔

سکریٹری اکادمی جناب مشتاق احمد نوری کے شکریہ کی تجویز پر، پروگرام کا اختتام ہوا۔

پریس ریلیز: بہار اردو اکادمی، بہار 9 فروری 2017

انڈیا انٹرنیشنل سینٹر میں جشن جمہوریہ کا انعقاد

نئی دهلی: بسلسلۂ جشن جمہوریہ نئی دہلی واقع انڈیا انٹرنیشنل سینٹر میں حسن آرا ٹرسٹ اور قومی کونسل برائے

فروغ اردو زبان کے اشتراک سے ایک خصوصی تقریب کا انعقاد بعنوان 'جشن بھارت' کیا گیا جس میں مہمان خصوصی کے طور پر سابق چیف جسٹس آف انڈیا ٹی ایس ٹھاکر و مہمانان معظم کے طور پر جسٹس منموہن سنگھ، گورنر کرن سنگھ، تجند رکھنہ اور سید سبط رضی کے علاوہ دیگر کئی اہم شخصیات نے حصہ لیا۔ 'جشن بھارت' میں حسن آرا ٹرسٹ کی جانب سے محترمہ نول لواسہ کی خصوصی فوٹو نمائش کا اہتمام بھی کیا گیا۔ حیدر کمال نقوی، بیگم فروغ ناز وعلی عابدی نے مہمانان کی خدمت میں گلدستہ پیش کیا۔ خطبۂ استقبالیہ ٹرسٹ کے سرپرست پدم شری ڈاکٹر محسن ولی نے پیش کیا۔ مشاعرہ 'جشن بھارت' میں دہلی اردو اکادمی کے چیئرمین ڈاکٹر ماجد دیوبندی، اظہر عنایتی رامپوری، پروفیسر نیر جلال پوری، ڈاکٹر پاپولر میرٹھی، پروفیسر مینو بخشی، پروفیسر واکر کول، سلیم امروہی، پیمبر نقوی، ممتاز نسیم، گلزار دہلوی وغیرہ نے شاندار کلام پیش کر کے سامعین سے داد وتحسین حاصل کی۔ مہمان خصوصی سابق چیف جسٹس آف انڈیا ٹی ایس ٹھاکر نے اردو شعرائے کرام کی ماضی کی خدمات اور عصر حاضر کی خدمات کی پذیرائی کی۔ گلزار دہلوی نے کلام کے ساتھ اپنے خیالات

'اردو ادب میں مہاتما گاندھی' کے موضوع پر منعقدہ سیمینار کا منظر

کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اردو زبان نے جنگ آزادی کے دوران عوام میں انقلاب پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ سید سبط رضی نے کہا کہ شاعر سماج کے حالات کو ایک منفرد نظریہ سے دیکھتا ہے اور اس کی بات کا معاشرہ پر الگ اثر ہوتا ہے۔ کسی حال میں بھی اردو شاعری کو آزادی کی خدمات کے سلسلہ میں نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ حسن آرا ٹرسٹ کی جانب سے محترمہ نول لواسہ کو فخر ہند اعزاز سے سرفراز بھی کیا گیا۔ صدارت سید ندیم عباس زیدی و نظامت لیش بھارتی اور نیر جلال پوری نے کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 24 جنوری 2017

آزادی کے بعد دہلی میں اردو ڈرامے کی روایت

دهلی: 'ڈرامے نے اردو کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا ہے۔' قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اشتراک سے اینجلس ایجوکیشن اینڈ سوشل ویلفیئر سوسائٹی کے زیر اہتمام آزادی کے بعد دہلی میں اردو ڈرامے کی روایت پر یک روزہ سیمینار کی صدارت کرتے ہوئے پروفیسر ابن کنول نے یہ بات کہی۔ انھوں نے مزید کہا کہ ڈرامے سبھی زبانوں میں لکھے جارہے ہیں لیکن جو مقبولیت اردو ڈراموں کو حاصل ہوئی وہ کسی کے حصے میں نہیں آئی۔ سیمینار کے مہمان خصوصی ڈاکٹر محمد کاظم نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ڈراما دیکھے بغیر، اس کی تکنیک جانے بغیر اور تاریخ پڑھے بغیر ڈرامے کی تنقید نہیں کی جاسکتی اور یہ خوش آئند بات ہے کہ ان سب لوازمات کے ساتھ ڈرامے کی تنقید کی جانب قدم بڑھایا جارہا ہے سیمینار کے ناظم ڈاکٹر شمیم احمد نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ ڈرامے کے توسط سے اردو زبان غیر اردو داں طبقے تک پہنچ رہی ہے اور وہ لوگ ہم سے جڑ رہے ہیں۔ سیمینار میں عذرا نقوی، ڈاکٹر عشرت کفیل، ڈاکٹر فرح جاوید، ڈاکٹر سمیہ مسعودی، قرۃ العین، محمد انس فیضی، گلشن اور صبا عنبرین مقالات پیش کیے۔

سیمینار کا افتتاح کرتے ہوئے سوسائٹی کے صدر لیاقت علی نے سوسائٹی کا مختصر تعارف پیش کیا۔ جنرل سکریٹری محمد راشد صدیقی نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 23 جنوری 2017

اردو ادب میں مہاتما گاندھی

احمد آباد: احمد آباد میں 'اردو ادب میں مہاتما گاندھی' کے موضوع پر ایک باوقار قومی سیمینار بتاریخ 8 جنوری 2017 سردار ولبھ بھائی پٹیل اسمارک بھون کے سیمینار ہال میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان (بھارت سرکار) نئی دہلی اور پونیتا فاؤنڈیشن، احمد آباد کے باہمی اشتراک سے انعقاد پذیر ہوا۔

مہمانان خصوصی اور مقالہ نگار حضرات کی گل پوشی کے بعد ڈاکٹر انور ظہیر انصاری (بڑودہ) کے کلیدی خطبہ سے سیمینار کا آغاز ہوا، موصوف نے مہاتما گاندھی اور اردو ادب کے مضبوط رشتے کا ذکر کرتے ہوئے اسے تحریک آزادی کا اہم حصہ قرار دیا۔ ڈاکٹر انور ظہیر انصاری کے کلیدی خطبے کے بعد ڈاکٹر نسرین شیخ نے اپنا مقالہ 'گاندھی جی گاندھی نامہ کی روشنی میں' پیش کیا۔ انھوں نے اکبرالہ آبادی کے اشعار کی روشنی میں مہاتما گاندھی کے نظریۂ عدم تشدد پر روشنی ڈالی۔ بعدہٗ ندیم انصاری نے اردو پر مہاتما گاندھی کے فکری اثرات' پر اپنا پر مغز مقالہ پڑھا۔ مہمان خصوصی پرنسپل محمد علی قادری (چیئرمین گجرات اسٹیٹ، حج کمیٹی) نے اردو ادب پر گاندھی جی کے اثرات کے حوالے سے گفتگو کی۔ جناب زین العابدین انصاری (ڈائریکٹر انگور گروپ)، ڈاکٹر افشاں قادری نے بھی اپنے مقالے پیش کیے۔ آخر میں صدر نشست ڈاکٹر نثار احمد انصاری نے پیش کیے گئے مقالات پر تبصرہ کیا۔

دوسری نشست میں محترمہ ماہ نور بانو سید، حاجی میاں قادری اور محترمہ شاہ نور بانو صاحبہ نے اپنے مقالے پیش کیے۔ محترمہ شاہ نور بانو کے بعد شری بسنت کمار پریہار

نے قدرے تفصیل سے مہاتما گاندھی کی اردو دوستی نیز اردو ادب میں مہاتما گاندھی سے متعلق اپنے خیالات پیش کیے۔ ڈاکٹر اظہر ڈھیری والا نے اپنا مبسوط مقالہ 'اردو ادب اور مہاتما گاندھی' پیش کیا۔

اس کے بعد پروفیسر محی الدین بومبے والا (ڈائریکٹر حضرت پیر محمد شاہ لائبریری اینڈ ریسرچ سینٹر، احمد آباد) نے اپنا خطبۂ صدارت پیش کیا۔ انھوں نے مہاتما گاندھی کی اردو دوستی سے متعلق اپنے زریں خیالات پیش کیے۔

آخر میں سیمینار کو آرڈی نیٹر شبیر ہاشمی نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان (بھارت سرکار) نئی دہلی کے تعاون پر دلی مسرّت کا اظہار کیا۔ نیز مہمانانِ خصوصی، مقالہ نگار حضرات اور سامعین کا شکریہ ادا کیا۔

سیمینار کی دونوں نشستوں کی نظامت کے فرائض جناب مبین اللہ انصاری نے بخوبی انجام دیے۔

پریس ریلیز: پرنو دیاس، پونجا فاؤنڈیشن، احمد آباد، 27 جنوری 2017

'اردو–ہندی کا رشتہ، غلط فہمیاں اور ان کا ازالہ'

مصطفی نگر، بلرام پور: ہندوستانی زبانوں کے درمیان جو باہمی رشتہ ہے اور باہمی روابط ہیں، اس سے انکار ممکن نہیں ہے، کیونکہ ہندوستانی زبانوں میں ہماری تہذیب و ثقافت اور تمدن موجود ہے۔ اگر ہندوستانی زبانوں کی حفاظت نہیں ہوگی تو پھر ہماری تہذیب و ثقافت کو خطرہ لاحق ہو جائے گا۔ ان خیالات کا اظہار مدھیہ پردیش واقع ساگر سینٹرل یونیورسٹی کے استاد ڈاکٹر ابو شہیم خان نے مدرسۃ الہدیٰ سوسائٹی کے زیر اہتمام قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے تعاون سے منعقدہ یک روزہ قومی سمینار میں صدارتی خطاب کے دوران کیا۔ اس موقعے پر ریاستی وزیر اور مقامی ممبر اسمبلی ڈاکٹر ایس یادو، سینئر لیڈر فدا محمد خان اور مشفق خان وغیرہ نے 'اردو–ہندی کا رشتہ: غلط فہمیاں اور ان کا ازالہ' کے موضوع پر منعقدہ سمینار کی ستائش کرتے ہوئے تعاون کرنے کے لیے قومی کونسل کی تعریف کی۔ اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر عمیر منظر نے کہا کہ اردو اور ہندی زبان کا جو باہمی رشتہ ہے اس طرح کی کوئی دوسری مثال زبانوں کی تاریخ میں بہ مشکل ہی ملے۔ سچ یہ ہے کہ ان دونوں زبانوں نے ایک دوسرے سے بہت کچھ اخذ و قبول کیا ہے۔ اخیر میں مدرسۃ الہدیٰ سوسائٹی کے سکریٹری اسرار خان نے اظہار تشکر پیش کیا جبکہ سمینار کی نظامت کے فرائض نثار احمد نے انجام دیے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 30 جنوری 2017

موجودہ وقت میں کمپیوٹر کی تعلیم ضروری

خیر آباد، سیتاپور: قصبہ کے محلہ کلہن سرائے میں واقع 'روشنی نیشنل سیوا گرام ادیوگ پر ناکمیٹ' چنڈی گڑھ کے ذریعے چل رہے یک سالہ ڈپلومہ کمپیوٹر اپلی

کیشن بزنس اکاؤنٹنگ، ملٹی لینگول ڈی ٹی پی کے کورس کے اختتام پر بدھ کو روشنی نیشنل کمپیوٹر سینٹر پر الوداعی تقریب کا انعقاد کیا گیا۔ اس موقعے پر سینئر فیکلٹی شمیم بانو نے طلبا کو اس ڈپلومہ کورس کے لیے مبارکباد پیش کی اور ان کی حوصلہ افزائی بھی کی۔ انھوں نے کہا کہ روشن مستقبل کے لیے عصر حاضر میں کمپیوٹر کی تعلیم بے حد ضروری ہو گئی۔ سرکاری و نیم سرکاری دفاتر میں سارا کام کمپیوٹر پر منحصر ہو گیا ہے، اس طرح سے لوگوں کو روزگار بھی مل گیا ہے۔ اس موقعے پر ادارہ کے منیجر زین العابدین نے کہا کہ دور جدید میں کمپیوٹر ٹیکنالوجی کی بڑی اہمیت ہے، اس لیے ہم کو اس کی تعلیم سے آراستہ ہونا ضروری ہے۔ انھوں نے کہا کہ قوم و ملت کے لوگوں کی توجہ اب بھی تعلیم کے تئیں سنجیدہ نہیں ہے جس کے خراب نتائج برآمد ہو رہے ہیں۔ آج سرکاری و نیم سرکاری محکموں میں مسلمانوں کی تعداد برائے نام ہے۔ انھوں نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان حکومت ہند کی طرف سے چلائے جا رہے کورس کی افادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا کہ یہاں اردو ڈپلومہ کورس بھی کرایا جاتا ہے۔ جونیئر فیکلٹی محمد ندیم و زینت فاطمہ نے کورس کی خصوصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ رواں سال کے داخلہ کے لیے سینٹر پر فارم موجود ہیں لوگوں کو چاہیے کہ اس سے زیادہ سے زیادہ فیضیاب ہوں کیونکہ اس کورس کو این سی پی یو ایل حکومت ہند کے ذریعے سے چلایا جا رہا ہے۔ اس کی فیس بھی کم ہے اور اس میں معاون کتابیں بھی مفت میں دی جاتی ہیں۔ پروگرام کے دوران طلبا نے ثقافتی پروگرام بھی پیش کیے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 29 دسمبر 2016

قومی اردو کونسل میں بانو قدسیہ کی رحلت پر تعزیتی نشست

نئی دھلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے صدر دفتر میں کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم کی صدارت میں ایک تعزیتی جلسے کا اہتمام کیا گیا۔ اس موقعے پر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ بانو قدسیہ کا انتقال اردو ادب کا ایک ایسا خسارہ ہے جس کی بھرپائی ممکن نہیں۔

پروفیسر ارتضیٰ کریم نے ان سے اپنی کئی ملاقاتوں کا ذکر بھی کیا اور کہا کہ وہ نہایت شفیق و ملنسار خاتون تھیں گفتگو کا فن جانتی تھیں اور چند لمحوں کی گفتگو کے بعد ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ ان کے اندرون میں دکھی انسانیت کے لیے درد و غم کا ایک اتھاہ سمندر موجزن ہے۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ ان کا سب سے مقبول ناول 'راجہ گدھ' ہے۔ انھوں نے کہا کہ ریاضیات و اقتصادیات میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد بانو قدسیہ نے اردو سے ایم اے بھی کیا تھا اور 'داستان گو' کے نام سے ایک پرچہ بھی نکال چکی تھیں۔ پاکستان ریڈیو اور پھر ٹیلی ویژن سے بھی منسلک رہیں اور ڈرامے و سیریل بھی لکھے۔

تعزیتی نشست میں قومی کونسل کے پرنسپل پبلی کیشن آفیسر ڈاکٹر شمس اقبال، پروفیسر عبید الرحمٰن ہاشمی، جناب سید محمد عصیم اور شعیب رضا فاطمی بھی موجود تھے۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 6 فروری 2017

اردو اور تعلیم سے متعلق دیگر قومی اور علاقائی خبریں

قومی

ہند-ایران کے تعلقات

نئی دھلی: نائب صدر جمہوریہ ڈاکٹر حامد انصاری نے ایک پروگرام کے دوران ایران و ہند کے ثقافتی تعلقات کی اہمیت پر کھل کر گفتگو کی اور اپنے خطاب میں کہا کہ ایران اور ہندوستانی تہذیب کی جڑیں ماضی سے وابستہ

ہیں جو بہت ہی مستحکم ہیں۔ 'ایران اور عراق کے درمیان ثقافتی مماثلت: عالمگیریت کے دور میں علاقائی ثقافتی و تمدن برصغیر' کے عنوان پر منعقدہ سمینار سے خطاب کے دوران ڈاکٹر حامد انصاری نے آنجہانی وزیر اعظم جواہر لعل نہرو کے اقتباسات کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ نہرو جی نے کہا تھا کہ ایرانی اور ہندوستانی بھائی بھائی تھے جو بچپن میں کھو گئے تھے۔ معروف مصنف جان کالی کی ایک کتاب کا حوالہ دیتے ہوئے ناب صدر جمہوریہ ہند نے کہا کہ جان کالی نے اپنی ایک کتاب میں بتایا ہے کہ ہندوستان میں مغل اور صفوی ادوار میں ایران سے 7 گنا زیادہ فارسی زبان بولنے والے تھے۔ ڈاکٹر انصاری نے یہ بھی کہا کہ پوری دنیا میں سب سے پہلا فارسی اخبار 1823 میں کلکتہ سے راجہ رام موہن رائے نے نکالا تھا۔ انھوں نے کہا کہ ہندوستان نے فارسی زبان کے تحفظ کے لیے زمینی سطح سے کام کیا وہیں سنسکرت زبان کے فروغ کے لیے بھی ایرانی حکومت کے اقدامات عیاں ہیں۔ انڈیا انٹرنیشنل سینٹر کے آڈیٹوریم میں منعقدہ بین الاقوامی دو روزہ سمینار سے خطاب کے دوران غلام رضا انصاری سفیر، ایران نے موجودہ دور میں مشرق وسطی میں اسلام کے نام پر شدت پسندی کے فروغ پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ شدت پسندی سے اسلام کی شبیہ داغدار ہو رہی ہے، ہمیں اس کے خاتمے کے لیے مختلف اقوام کو اکٹھا ہو کر مذاکرات قائم کرنے چاہئیں تاکہ اس کا جلد از جلد ازالہ کیا جا سکے۔ ڈاکٹر ابوذر ابراہیمی صدر، آئی سی آر او، ایران نے کہا کہ ہمارے بزرگوں نے ہند-ایران کے درمیان جو ثقافتی رشتوں کی بنیاد ڈالی تھی ہمارا فریضہ ہے کہ ہم اس کی حفاظت کریں اور اس کی توسیع کرنے کی کوشش کریں۔ قبل ازیں افتتاحی کلمات ایئر مارشل نریش ورما، ڈائرکٹر آئی آئی سی نے پیش کیے جبکہ ڈاکٹر علی دہگاہی کلچرل کونسل اینڈ ہیڈ ایران کلچر ہاؤس اور پروفیسر لوکیش چندر صدر آئی سی سی آر انڈیا نے بھی اظہار خیال کیا اور نظامت کے فرائض ڈاکٹر شہرناز کاما نے انجام دیے۔ وقفے کے بعد 'ہند-ایران کے تاریخی تعلقات' کے عنوان پر منعقد تعلیمی سیشن میں پروفیسر اوپندر سنگھ، ڈاکٹر محمد کافی، پروفیسر ابھے کمار سنگھ اور پروفیسر ایس جے ایچ جعفری نے گفتگو کی۔

انڈیا انٹرنیشنل سینٹر میں جاری دو روزہ بین الاقوامی سمینار کے اختتامی اجلاس میں ایران کلچرل ہاؤس دہلی کے کلچرل کونسلر ڈاکٹر علی دہگائی نے اظہار تشکر کرتے ہوئے کہا کہ سمینار میں جو پیپر ہند اور ایران کے خطاطی، ثقافتی او دیگر مشترکات کے حوالے سے پڑھے گئے ہیں وہ قابل قدر ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہند و ایران کے مختلف مشترکات کے فروغ کے لیے ایک کمیشن بنایا جانا چاہیے تاکہ ہند و ایران مختلف میدانوں میں مشترکات و روابط، تہذیب و کلچر، ادب میں ترقی ہو۔ اختتامی اجلاس میں مہمان خصوصی کے طور پر انڈیا انٹرنیشنل سینٹر کی چیئرپرسن ڈاکٹر کپیلی واتسایا اور مہمان ذی وقار گیلانی یونیورسٹی کے چانسلر ڈاکٹر احمد رضی نے شرکت کی۔ جبکہ صولی شہراب جی نے اختتامی تقریر میں ہند و ایران مشترکات پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ یونیسکو، پارزور فاؤنڈیشن کی پروجیکٹ ڈائرکٹر ڈاکٹر شیرناز کاما نے بھی اس موقعے پر ہند و ایران کے تعلقات

تعلیم اور تحقیق کے شعبے میں زیادہ خود مختاری کی ضرورت: پرکاش جاوڈیکر

نئی دھلی: فروغ انسانی وسائل کے وزیر پرکاش جاوڈیکر نے ملک میں تعلیم اور تحقیق کے شعبے میں خود مختاری پر زور دیتے ہوئے کہا کہ جو تعلیمی ادارے یا کالج اپنا معیار ثابت کریں گے اور بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کریں گے انھیں خود مختاری دی جائے گی اور حکومت ان کی آزادی میں کوئی مداخلت نہیں کرے گی اور انھیں کنٹرول نہیں کرے گی۔ مسٹر جاوڈیکر نے انڈین انسٹی ٹیوٹ آف مینجمنٹ (آئی آئی ایم) بل کے بارے میں جانکاری دیتے ہوئے نامہ نگاروں سے یہ بات کہی۔ خیال رہے کہ کابینہ نے اس بل کو منظوری دی ہے جس سے آئی آئی ایم طلبہ کو ڈگری اور پی ایچ ڈی کی ڈگری دی جا سکے گی۔ انھوں نے بتایا کہ آئی آئی ایم کو خود مختاری دینا ایک تاریخی فیصلہ ہے اور اس سے ایک نیا دریچہ کھلا ہے اور ایک تازہ ہوا آئی ہے۔ اس بل کو پارلیمنٹ کے آئندہ بجٹ اجلاس میں پیش کیا جائے گا اور اسے اس اجلاس میں منظور کرایا جائے گا اور منظور ہونے پر تعلیمی سال 18-2017 سے ہی نافذ کر دیا جائے گا۔ انھوں نے بتایا کہ آئی آئی ایم کے طلبا اور ٹیچروں نے ان اداروں کا وقار بلند کیا ہے اور اس کے معیار کو دیکھتے ہوئے اسے زیادہ خود مختاری دی جا رہی ہے اور وہ خود اپنے ڈائریکٹر اور چیئرمین کا انتخاب کر سکیں گے۔ انھوں نے کہا کہ پہلے یہ سمجھا جاتا تھا کہ حکومت اداروں کو فنڈ دیتی ہے تو اس وجہ سے وہ انھیں کنٹرول کر سکتی ہے لیکن اس ذہنیت کو تبدیل کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمارا ماننا ہے کہ تعلیم اور تحقیق کے شعبے میں زیادہ خود مختاری کی ضرورت ہے، اپنے ملک میں تحقیق کا کلچر اسی لیے فروغ نہیں پا سکا۔ پوری دنیا میں تحقیق کو خود مختاری دی جاتی ہے۔ اسی طرح اختراعات کے لیے بھی آزادی کی ضرورت ہے اس لیے جو ادارے مستقبل میں اپنے معیار کو ثابت کریں گے انھیں خود مختاری دی جائے گی۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 26 جنوری 2017

اور ان میں مشترکات پر اپنے خیالات اظہار کیا۔ سیمنار کے دوسرے روز کے پہلے اجلاس کی صدارت انوپم پانڈے نے کی جس میں ایران سوسائٹی کلکتہ کے نائب صدر ڈاکٹر منصور عالم نے ہندوستان میں ایرانی فن خطاطی کا تذکرہ کرتے ہوئے اسے ایران اور ہندوستان کے بیچ ایک تہذیب کا پل بتایا۔ شعبہ تاریخ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے پروفیسر ایس علی ندیم رضوی نے ہندوستانی تعمیرات میں ایرانی فن کے اثرات سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ مغلیہ دور کی عمارتوں میں ایرانی فن تعمیر الگ ہی نمایاں نظر آتا ہے۔ نیشنل میوزیم کی ڈائرکٹر انوپما پانڈے نے نیشنل میوزیم میں جو مخطوطات ہیں ان کی نقاشی کے تعلق سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ ایران کا فن ہندوستان میں ایک قدیم مقام رکھتا ہے۔ وہیں قمر ڈاکر نے گلوبلائزیشن کے تعلق سے بات کی۔ دوسرے سیشن کی صدارت فردوسی یونیورسٹی مشہد ایران کے ڈپٹی چانسلر ڈاکٹر محمد رضا ہاشمی نے کی۔ پروفیسر آذرمی دخت صفوی (اے ایم یو)، پروفیسر سید حسین (جے این یو)، پروفیسر عزیز الدین حسین (رام پور)، پروفیسر آذر (ایران)، پروفیسر جی این خاکی (کشمیر)، پروفیسر محمد علی اشرف (ڈھاکہ)، پروفیسر ابوالقاسم محمد (ڈھاکہ)، پروفیسر محمد حسن ھتیار (افغانستان) نے مقالات پیش کیے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 19، 20 جنوری 2017

پانچ اقلیتی یونیورسٹیاں قائم کرنے کی تجویز

نئی دھلی: حکومت کی طرف سے پانچ اقلیتی یونیورسٹیاں قائم کرنے کے طور طریقوں پر غور کرنے کے لیے قائم اعلیٰ سطح کی کمیٹی نے میٹنگ کی اور اس کے ارکان نے اداروں کو اقلیتی درجے اور طالبات کو 40 فیصد ریزرویشن کی

تجویز سے منسلک سوالات پر تبادلہ خیال کیا۔ ذرائع کے مطابق میٹنگ کی صدارت کرنے والے مرکزی اقلیتی امور کے وزیر مختار عباس نقوی کا نظریہ تھا کہ مجوزہ اداروں کو اقلیتی اور غیر اقلیتی دونوں فرقوں کے طلبا کو تعلیم دینی چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ اس معاملے پر اتفاق رائے نہیں قائم ہو سکا اور حکومت اگلے تین چار ماہ میں ان اداروں پر کام شروع کرنا چاہتی ہے۔ ذرائع نے کہا کہ کمیٹی کے ارکان نے مشورہ دیا ہے کہ ادارے مکمل طور پر خودمختار ہونے چاہئیں۔ کچھ ارکان کا مشورہ تھا کہ یونیورسٹیاں بنیادی طور پر اقلیتوں کے لیے ہونی چاہئیں جبکہ کچھ لوگوں کا کہنا تھا کہ ان میں سیکولر رنگ نظر آنا چاہیے۔ نقوی نے پہلے کی طرح کہا کہ یونیورسٹی کا کردار مکمل طور پر اقلیتی نہیں ہونا چاہیے لیکن ماہرین وسیع طور پر اس معاملے پر بات چیت کریں گے اور جلد ہی اس سلسلے میں اپنی رپورٹ سونپیں گے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 26 جنوری 2017

آئی آئی ایم سی میں اردو جرنلزم میں پی جی ڈپلوما کورس کا باقاعدہ آغاز

آئی آئی ایم سی میں اردو جرنلزم میں پی جی ڈپلوما کورس کا باقاعدہ آغاز

نئی دھلی: ملک کے موقر صحافتی ادارہ انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ماس کمیونیکیشن (آئی آئی ایم سی) میں اردو جرنلزم ڈپلوما کورس کی توسیع کردی گئی ہے، اب یہاں انگریزی، ہندی اور اشتہارات وعوامی رابطۂ عامہ کے کورسز کی طرح اردو جرنلزم میں بھی باضابطہ پی جی ڈپلوما شروع کردیا گیا ہے اور رواں سال کے بیچ میں یہ کورس نافذ بھی کردیا گیا ہے۔ اس سے پہلے تک یہاں صرف ڈپلوما ان اردو جرنلزم کرایا جاتا تھا۔ کورس کا رسمی افتتاح کرتے ہوئے مرکزی وزیر اطلاعات ونشریات وینکیا نائیڈو نے انسٹی ٹیوٹ کے ذریعے اردو جرنلزم کورس میں توسیع کو نیک کام قرار دیا۔ نائیڈو نے اردو زبان کی تعریف کی اور اسے قومی دھارے میں شامل رکھنے کی وکالت کی۔ افتتاحی تقریب میں خطاب کرتے ہوئے مرکزی وزیر نے کہا 'اردو صحافت ملک کے میڈیا اور عوامی رابطۂ عامہ کا اہم حصہ ہے۔ ملک کی جنگ آزادی میں اردو صحافت نے بہت اہم رول نبھایا تھا۔ انھوں نے کہا کہ ملک کے پہلے وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد کے اخبار 'الہلال' کو کون فراموش کرسکتا ہے۔ اس اخبار نے ہندو مسلم اتحاد کے لیے اہم رول نبھایا تھا۔ اس کے علاوہ زمیندار، نقیب، ہمدرد، پرتاپ، ملاپ، قومی آواز اور ہندوستان جیسے اردو اخبارات نے ہندوستانی نوجوانوں کے ذہن میں قومیت کا شعور جگانے میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ ہندوستان کی تاریخ اردو اخبارات کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی۔ نائیڈو نے اردو کو ایک خاص طبقہ سے وابستہ کرنے کی کوششوں کو غلط ٹھہراتے ہوئے کہا کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان نہیں ہے، بلکہ یہ پورے ہندوستان کی زبان ہے۔ اردو ہندوستان کی تہذیبی وراثت ہے۔' انھوں نے ہندو مالکان کے ذریعہ اردو اخبارات شروع کرنے کی تاریخ کو دہراتے ہوئے کہا کہ 'اردو کا پہلا اخبار (جام جہاں نما) کو ایک ہندو نے شروع کیا تھا۔ اردو اخبارات نے ہمیشہ ہندو مسلم اتحاد پر زور دیا ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 18 جنوری 2017

اردو اصطلاحات کے لیے ویب سائٹ متعارف

جمنا نگر: اصطلاح کا مسئلہ اردو میں ہمیشہ سے بہت اہم رہا ہے۔ لکھتے وقت یا ترجمہ کرتے وقت کبھی کبھی سامنے کا لفظ بھی یاد نہیں آتا ہے۔ اس مسئلے کا آسان حل اصطلاحات ڈاٹ کام نامی ویب سائٹ نے پیش کردیا ہے جسے چار سال قبل شروع کیا گیا تھا۔ محض چار سالہ مدت میں 27 ہزار پانچ سو اصطلاحات کو اپنے اندر سمونے والی ویب سائٹ اصطلاحات ڈاٹ کام (www.istelahat.com) نے ایک ریکارڈ قائم کیا ہے۔ اس ویب سائٹ کو مرکزی وقف کونسل کے سابق سکریٹری و پنجاب وقف بورڈ کے سابق ایڈمنسٹریٹر محمد رضوان الحق المعروف قیصر شمیم نے ستمبر 2012 میں شروع کیا تھا۔ تب اس میں اصطلاحات کی تعداد 30 ہزار تھی۔ اب اس میں 27 ہزار پانچ سو انگریزی اصطلاحات کا اردو مترادف موجود ہے جس سے کوئی بھی استفادہ کرسکتا ہے، ویب سائٹ میں ایک کالم انگریزی سے اردو دیا گیا ہے جس میں آپ Colur، Fish یا Sea جیسے الفاظ انگریزی میں ٹائپ کر کے

ٹرانسلیٹ پر کلک کریں گے تو نہ صرف ان الفاظ کے معانی بلکہ ان کی تمام اقسام بھی سامنے آجائیں گی۔ مثال کے طور پر Sea ٹائپ کریں گے تو 90 سمندروں کے نام بیچ پر انگریزی اور اردو میں نظر آئیں گے۔ اس سلسلے میں قیصر شمیم نے بتایا کہ متعلقہ لفظ پر کلک کرتے ہی نہ صرف وہ اصطلاح بلکہ، سابقہ اور لاحقہ کے ساتھ، اس سے متعلق تمام اصطلاحات انگریزی، اردو دونوں میں اسکرین پر نظر آئیں گی، آپ نے Capital ٹائپ کیا تو تقریباً ڈیڑھ سو اصطلاحات سامنے ہوں گی، Colour کے تحت آپ رنگوں کے ایسے اردو نام دیکھ سکیں گے جن کو بھلا دیا گیا ہے، یہ اس سائٹ کا بنیادی کام ہے۔ طریقہ کار کے متعلق قیصر شمیم نے کہا پہلے انگریزی کی اصطلاح فیڈ کی جاتی ہے، پھر ڈھونڈھ کر (اور بعض اوقات وضع کرکے) اردو کی اصطلاح فیڈ کی جاتی ہے، ممکن ہے کبھی کسی انگریزی اصطلاح کا اردو متبادل موجود نہ ہو، ایسے میں اگر کسی کے پاس کوئی متبادل ہو تو رہنمائی کردیں، یہ ایک اجتماعی کام ہے جس میں سب کا تعاون درکار ہے۔

ڈاکٹر قیصر شمیم کا کہنا ہے کہ اس سائٹ کو تیار کرتے وقت برصغیر میں اب تک ہونے والے تمام کام کو سامنے رکھ کر ان میں یکسانیت پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ساتھ بہت سی کھوئی ہوئی اصطلاحات کو تاریخ کے صفحات سے ڈھونڈھ نکالا گیا ہے، حسب ضرورت نئی اصطلاحات بھی وضع کی گئی ہیں، اس لیے بہت سی انگریزی کی اصطلاحات جن کا اردو میں اب تک نہیں ملتا تھا، اب اس سائٹ پر مل سکتا ہے، انھوں نے اس کی بہت سی مثالیں دیں، مثلاً cess کے لیے اردو متبادل فرہنگوں میں موجود نہیں ہے، جبکہ اٹھارویں صدی تک اس کے لیے ابواب لکھا جاتا تھا، انھوں نے امید ظاہر کی کہ اردو والے اس سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کریں گے۔

روزنامہ 'جدید خبر' دہلی، 21 جنوری 2017

دھلی :

جدیدیت اور مابعد جدیدیت: مختلف جہات

نئی دھلی: 'بزم آہنگ دہلی' کے دو سال مکمل ہونے پر مظہر فاؤنڈیشن انڈیا اور بزم آہنگ دہلی کے زیر اہتمام ایک روزہ قومی سیمنار 'جدیدیت اور مابعد جدیدیت: مختلف جہات' کے عنوان سے 5 فروری 2017 کو الحرا انٹرنیشنل اسلامک اسکول شاہین باغ میں منعقد کیا گیا۔ پہلے سیشن کی صدارت کے فرائض پروفیسر کوثر مظہری، ڈاکٹر ندیم احمد اور نوشاد منظر نے انجام دیے۔ جبکہ نظامت درخشاں اور اظہار تشکر عرفان نے پیش کیا۔ پروفیسر کوثر مظہری نے اپنے صدارتی خطبے میں مابعد جدیدیت کی اصطلاح کو رد کرتے ہوئے کہا کہ یہ اصطلاح ہی غلط ہے کیونکہ ہم اس اصطلاح کو اگر تسلیم کرلیں تو اس کا مطلب ہے کہ جدیدیت کے بعد قیامت تک کی تمام تحریریں اس کی ذیل میں آئیں گی۔ انھوں نے مزید کہا کہ مابعد جدیدیت دراصل جدیدیت کی گھٹن یا حصار سے آزادی کا راستہ اور کشادہ ذہنی کا نظریہ ہے اس پر نئی نسل اور نئے اذہان کو اپنی سطح سے غور وفکر کرنے کی ضرورت ہے۔ جبکہ ڈاکٹر ندیم احمد نے جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے حوالے سے اپنے موقف کی مدلل وضاحت کی۔

سیمنار کے دوسرے اجلاس میں بھی پانچ مقالات پیش کیے گئے۔ اس سیشن کی صدارت کے فرائض ڈاکٹر سرورالہدی، ڈاکٹر نسیم احمد اور محمد تحسین الزماں نے انجام دیے۔ جبکہ نظامت قرۃ العین نے کی۔ ڈاکٹر سرورالہدی نے اپنے طویل صدارتی خطبے میں جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے تمام تر خدوخال کو واضح کرتے ہوئے کہا کہ جدیدیت نے ابہام بتا کر شاعری کو زندگی سے جوڑا ہے اور جدیدیت کی اصل وہ ہے جس میں سیاسی اور سماجی شعور بھی شامل ہے۔ جس کی مثال خلیل الرحمان اعظمی، وحید اختر اور محمد حسن ہیں۔ جبکہ ڈاکٹر نسیم احمد نسیم نے اپنے خطبے میں کہا کہ جدیدیت اور مابعد جدیدیت دونوں نے غیر محدود کو محدود اور محدود کو غیر محدود کرکے ادب کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔

پریس ریلیز: کوثر مظہری، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی، 5 فروری 2017

جامعہ ملیہ اسلامیہ میں فلم کلب کا افتتاح

نئی دھلی: جب میں علی گڑھ یونیورسٹی میں طالب علم تھا تو میں وہاں فلم اور ڈرامہ کلب میں سرگرم تھا اور اس سے کافی کچھ سیکھا بھی تھا۔ یہ بات جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر پروفیسر طلعت احمد نے جامعہ فلم کلب کی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے کہی۔ انھوں نے کہا کہ اس لیے جب وہ جامعہ میں آئے تو انھوں نے فلم کلب شروع کرنے کے بارے میں سوچا کیونکہ فلموں سے کافی تعلیم ملتی ہے۔ انھوں نے طالب علموں سے اپیل کی کہ وہ زیادہ تعداد میں اس کے رکن بنیں اور اچھی سے اچھی فلموں کی کارکردگی کی تجویز دیں۔ انھوں نے کہا کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ نے طالب علموں کو ملکی و غیر ملکی بہترین فلموں سے واقف کرانے کے لیے فلم کلب قائم کیا ہے۔ پدم بھوشن ایوارڈ سے سرفراز اور فلم سنسر بورڈ کی سابق صدر نامور فلم اداکارہ شرمیلا ٹیگور نے اس کلب کا افتتاح کیا۔ محترمہ ٹیگور نے آڈیٹوریم میں کھچا کھچ بھرے طلبا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ انھیں یہ جان کر خوشی ہوئی کہ اس یونیورسٹی کے ماس کمیونی کیشن سے کئی ایسے طالب علم نکلے ہیں جنھوں نے فلمی دنیا میں اپنی شناخت بنائی ہے۔ اس ادارے سے آج یونیورسٹی کی شناخت بھی ہے انھوں نے کہا کہ فلمیں لوگوں میں صرف امید ہی پیدا نہیں کرتی بلکہ وہ معاشرے کی برائیوں کا حل بھی پیش کرتی ہیں۔ انھوں نے اس امید کا اظہار کیا ہے کہ اس فلم کلب سے طالب علموں کے سامنے فلموں کے نئے نئے وا کھلیں گے اور وہ ان فنون سے بھی واقف ہوں گے اور فلموں کے بارے میں ان کے اندر اچھی سوچ پیدا ہوگی۔

تقریب کے مہمان خصوصی اور فیکام کے سابق صدر کرن کارنک نے کہا کہ اس طرح کے کلبوں سے صرف فلموں کو دیکھنے کا موقع ہی نہیں ملتا بلکہ ان سے آدمی کچھ سیکھتا بھی ہے اور اس سے ان کی سوچ تیار ہوتی ہے۔ ڈائریکٹر رامت کھنہ نے کہا کہ 1920 تک ہندوستان دنیا میں فلم سازی کرنے والا ایک بڑا ملک بن گیا تھا اور 1922 میں فلمی تحقیقات کمیٹی کی تشکیل بھی ہوگئی تھی جو مستقبل میں فلم سنسر بورڈ کے قیام کی بنیاد بنی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 18 جنوری 2017

اقبال صدی کا اہم شاعر

نئی دہلی: اردو اکادمی کے زیر اہتمام دو روزہ سمینار بعنوان 'اقبال صدی کا اہم شاعر' کا افتتاحی اجلاس اکادمی

کے قمر رئیس سلور جوبلی ہال میں منعقد ہوا جس کی صدارت ماہر اقبالیات پروفیسر عبدالحق نے کی اور مہمانِ اعزازی کی حیثیت سے اقبال اکادمی کے چیئرمین اور زکوۃ فاؤنڈیشن آف انڈیا کے صدر ڈاکٹر سید ظفر محمود نے شرکت کی جبکہ مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے دہلی یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر پروفیسر دنیش سنگھ شریک رہے۔ اس اجلاس کی نظامت ڈاکٹر شفیع ایوب نے کی۔ اجلاس کے آغاز میں وائس چیئرمین ڈاکٹر ماجد دیوبندی نے پھولوں کے گلدستے سے مہمانوں کا استقبال کیا۔ استقبالیہ کلمات پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر ماجد دیوبندی نے کہا کہ اقبال کی شاعرانہ عظمت کو ہندوستان کے لوگ شاید اتنا نہیں سمجھ سکے جتنا ان کا حق تھا۔ انھوں نے کہا کہ اقبال ایک عہد کے شاعر نہیں ہیں بلکہ ان کی فکر اور فلسفہ سیکڑوں سالوں کے لیے مشعلِ راہ ہے۔ مہمانِ اعزازی ڈاکٹر سید ظفر محمود نے علمی گفتگو کرتے ہوئے قرآن کریم اور احادیث کے حوالے سے علامہ اقبال کے مختلف اشعار کا تجزیہ پیش کیا اور کہا کہ اقبال کی شاعری کو سمجھنے کے لیے قرآن وحدیث کی معلومات بھی بہت ضروری ہے جس سے فکرِ اقبال کے مختلف پہلو سامنے آسکیں۔ پروفیسر دنیش سنگھ نے کہا کہ میرے لیے یہ فخر کی بات ہے کہ میں اردو اکادمی میں موجود ہوں اور اقبال جیسے عظیم شاعر پر دو روزہ سمینار کا افتتاح کرنے کا شرف حاصل کر رہا ہوں۔ انھوں نے کہا کہ اقبال صدی کے شاعر بھی ہیں اور سدا کے شاعر بھی ہیں، ان کی شاعری کو ایک صدی پر محیط نہیں کیا جاسکتا۔ صدر جلسہ ماہرِ اقبالیات پروفیسر عبدالحق نے خطبۂ صدارت پیش کرتے ہوئے علامہ اقبال کی ذاتی زندگی، ان کے خاندان اور کشمیری برہمن کے حوالے سے لاتعداد اشعار کی تفصیل پیش کی اور کہا کہ اقبال کو جتنا پڑھا جائے، جتنا سمجھا جائے وہ کم ہے کیونکہ اقبال صدیوں پر محیط فلسفے کی نمائندگی کرنے والے شاعر تھے۔ افتتاحی اجلاس میں آسیہ نے خوبصورت ترنم میں کلام اقبال پیش کیا۔ افتتاحی اجلاس کے بعد سمینار کا پہلا اجلاس منعقد ہوا جس کی صدارت ڈاکٹر تسلیم رحمانی نے کی جبکہ نظامت ڈاکٹر ابوظہیر ربانی نے کی۔ اس اجلاس میں پروفیسر عبدالحق، ڈاکٹر شمیم احمد، ڈاکٹر علی احمد ادریسی نے اپنے مقالات پیش کیے۔ سمینار کے دوسرے کی صدارت ڈاکٹر عشرت جمیل نے جبکہ نظامت جاوید رحمانی نے کی۔ اس اجلاس میں پروفیسر محمد نعمان خاں، ڈاکٹر محمد شاہد خاں، ڈاکٹر اشرف علی اور ڈاکٹر محمد نظام الدین نے اپنے مقالات پیش کیے جبکہ ڈاکٹر سلمٰی شاہین نے کلامِ اقبال پیش کیا۔

اردو اکادمی، دہلی کے زیر اہتمام دو روزہ سمینار 'اقبال صدی کا اہم شاعر' کے دوسرے دن کے پہلے اجلاس کی مجلسِ صدارت میں پروفیسر محمد نعمان خاں، ڈاکٹر تابش مہدی اور ڈاکٹر محمد نثار شامل تھے، جس کی نظامت انس فیضی نے کی۔ اس اجلاس میں اقبال مسعود، ڈاکٹر آصف سعید ڈاکٹر ماجد دیوبندی، محمود ملک نے، ڈاکٹر محمد ارشد، اور ڈاکٹر سرفراز جاوید نے مقالات پیش کیے۔ آخری اجلاس کی مشترکہ صدارت پروفیسر ارتضیٰ کریم اور ڈاکٹر ماجد دیوبندی نے کی اور نظامت نورین علی حق نے کی۔ اس اجلاس میں پروفیسر معین الدین جینابڑے، ڈاکٹر سراج اجملی، ڈاکٹر محمد آصف، اور ڈاکٹر محمد نثار نے 'اقبال کی شاعری میں ڈرامائی عناصر' پیش کیا۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ اقبال کو سب سے بڑا خراج عقیدت یہ ہوگا کہ ان کے افکار وخیالات کو ہم اپنی زندگی اور عمل میں ڈھال کر آگے بڑھیں اور اردو کے نئے طلبہ اور طالبات کو بہتر پیغام دیں۔

سمینار کے اختتام پر وائس چیئرمین ڈاکٹر ماجد دیوبندی نے کہا کہ فکرِ اقبال ہماری تہذیب کی وہ وراثت ہے کہ اس کو جتنا آگے بڑھایا جائے کم ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 30 و 31 جنوری 2017

بہار:

فارسی اور اردو میں باہمی رشتے

مظفر پور: فارسی کے بغیر اردو زبان وادب کی تفہیم مشکل ہے۔ اچھی اردو کے لیے فارسی زبان کا جاننا ضروری ہے۔ یہ باتیں ڈاکٹر عابد حسین صدر شعبہ فارسی پٹنہ یونیورسٹی نے للت نرائن ترہت کالج کے وسیع وعریض ہال میں 'فارسی اور اردو میں باہمی رشتے' کے عنوان سے یک روزہ سمینار میں خطاب کرتے ہوئے کہیں جس کی صدارت ڈاکٹر اوم پرکاش سنگھ پرنسپل للت نرائن ترہت کالج نے کی۔ ڈاکٹر عابد حسین نے اردو اور فارسی کے باہمی رشتے پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ فارسی کو ہندوستان میں مغلیہ سلطنت میں کافی فروغ ملا اور اس

زبان کا اثر آج بھی باقی ہے اور ہماری روزمرہ کی بول چال میں فارسی کا بڑا دخل ہے۔ سمینار کی نظامت ڈاکٹر عید محمد انصاری سابق صدر شعبۂ فارسی بہار یونیورسٹی نے کی۔ ڈاکٹر رئیس انور سابق صدر شعبۂ اردو متھلا یونیورسٹی نے فارسی اور اردو کے باہمی رشتے پر مختصر مگر مدلل گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ فقط اردو زبان میں ہی نہیں بلکہ ہندی زبان میں بھی فارسی کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ اس موقعے پر ڈاکٹر عبدالوحید صدر شعبۂ فارسی للت نرائن ترہت کالج نے مہمانوں کا استقبال کیا اور ہندوستان میں فارسی زبان کی آمد اور اس کے فروغ پر روشنی ڈالی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 27 جنوری 2017

پٹنہ یونیورسٹی میں محفلِ افسانہ

پٹنہ: عصر حاضر کا ادبی منظرنامہ بڑا ہی تابناک ہے، اس زمانہ میں جتنا معیاری ادب تخلیق کیا جارہا ہے اس کی نظیر ماضی میں خال خال ہی ملتی ہے اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی بڑا المیہ ہے کہ اردو یونیورسٹیوں کا جو نصاب ہے وہ جامع نہیں ہے۔ اس نصاب میں عہد حاضر کے اہم ادیبوں، نقادوں، شاعروں اور افسانہ نگاروں کا ذکر نہیں ہے۔ یہ باتیں پٹنہ یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں منعقد 'محفلِ افسانہ' سے معروف صحافی وادیب حقانی القاسمی نے کہیں۔ انھوں نے کہا کہ نصاب میں تذکرہ نہ ہونے کی وجہ سے ہمارے طلبا وطالبات انھیں صحیح طریقے سے جان نہیں پاتے ہیں۔ انھوں نے طلبا وطالبات کو ناصحانہ انداز میں

پٹنہ یونیورسٹی میں محفل افسانہ

کہا کہ آپ کے لیے عربی اور فارسی جاننا بھی ضروری ہے، کیونکہ ان زبانوں کا اردو سے بڑا گہرا تعلق ہے۔ اس موقعے پر کشمیر سے آئے ڈاکٹر مشتاق وانی نے مغربی تہذیب اور مشرقی تہذیب کے حوالے سے اپنا افسانہ 'انتظار مرگ پیش' کیا۔ نگار عظیم نے افسانہ 'بے چہرگی' پیش کیا جبکہ ترنم جہاں میسور نے اپنا افسانہ 'خاموش' پیش کیا۔ نوشاد عاطر نے بھی اپنا افسانہ 'بانو' پیش کیا جبکہ خورشید حیات نے اپنا افسانہ 'آنگن میرے گھر کا' پیش کیا۔ اس موقعے پر انجم عثمانی نے اردو ادب اور ٹیلی ویژن کے حوالے سے کہا کہ اردو کو ٹیلی ویژن کے زاویے سے مت دیکھیے بلکہ ٹیلی ویژن کو اردو کے زاویے سے دیکھیے۔ افسانہ نگار اسلم جمشید پوری نے افسانہ نگاروں کے افسانے پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ جتنے افسانے پیش کیے گئے ان میں شناخت کا مسئلہ چھایا رہا۔ تہذیب کس طرح مٹ رہی ہے، معاشرہ کس طرح زوال پذیر ہوتا جارہا ہے اس کا المیہ بڑے اچھے انداز میں افسانہ نگاروں نے پیش کیا۔ پروگرام کی نظامت ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی نے کی جبکہ تعارفی خطبہ شعبہ اردو کے صدر ڈاکٹر جاوید حیات نے پیش کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 31 جنوری 2017

غلام سرور توسیعی خطبہ

پٹنہ: بہار اردو اکادمی کے زیر اہتمام منعقد غلام سرور

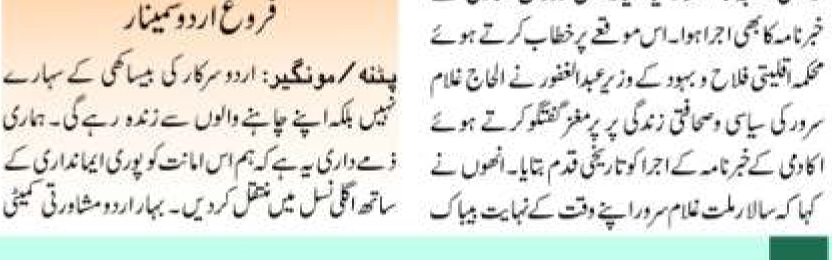

توسیعی خطبہ کا انعقاد کیا گیا۔ اس دوران اکادمی کے خبرنامہ کا بھی اجرا ہوا۔ اس موقعے پر خطاب کرتے ہوئے محکمہ اقلیتی فلاح و بہبود کے وزیر عبدالغفور نے الحاج غلام سرور کی سیاسی وصحافتی زندگی پر پر مغز گفتگو کرتے ہوئے اکادمی کے خبرنامہ کے اجرا کو تاریخی قدم بتایا۔ انھوں نے کہا کہ سالار ملت غلام سرور اپنے وقت کے نہایت بیباک لیڈر تھے۔ وہ ملی مسائل پر گہری نظر رکھتے تھے۔ انھوں نے کہا کہ اردو کی اہمیت ومقبولیت ہر جگہ ہے اور اس زبان کا تحفظ اور فروغ ہماری اہم ذمہ داری ہے کیونکہ جب زبان ختم ہوجاتی ہے تو قوم کی روحانیت بھی ختم ہوجاتی ہے۔ انھوں نے اردو آبادی میں لائبریری کے قیام پر بھی زور دیا۔ مہمان خصوصی شفیع مشہدی صدر نشین اردو مشاورتی کمیٹی، بہار نے اپنے مختصر خطاب میں الحاج غلام سرور کو عظیم ومعتبر صحافی اور مجاہد اردو بتاتے ہوئے کہا کہ اردو ہماری تہذیبی وراثت اور ہمارے اسلاف کی عظیم امانت ہے۔ اس موقعے پر پروفیسر محمد اشتیاق وائس چانسلر مگدھ یونیورسٹی نے اپنے جامع ومدلل صدارتی خطاب میں کئی اہم تہذیبی اور لسانی نکات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ آج کے حالات میں ہمیں خود محنت کرنے اور اردو کے لیے اپنے دلوں میں سچا درد پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ اس موقعے پر ڈاکٹر سید شہباز، ڈاکٹر ریحان غنی، ریاض عظیم آبادی، راشد احمد اور اشرف استھانوی نے بھی الحاج غلام سرور کی زندگی کے مختلف گوشوں پر گفتگو کی۔

اکادمی کے سکریٹری مشتاق احمد نوری نے استقبالیہ تعارفی کلمات پیش کیے۔ تقریب کا اختتام سلطان اختر نائب صدر اکادمی کے شکریہ کی تجویز پر ہوا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 11 جنوری 2017

فروغ اردو سمینار

پٹنہ / مونگیر: اردو سرکار کی بیساکھی کے سہارے نہیں بلکہ اپنے چاہنے والوں سے زندہ رہے گی۔ ہماری ذمے داری یہ ہے کہ ہم اس امانت کو پوری ایمانداری کے ساتھ اگلی نسل میں منتقل کردیں۔ بہار اردو مشاورتی کمیٹی کے صدر شفیع مشہدی نے یہ باتیں کہیں۔ اردو ڈائرکٹوریٹ کے زیر اہتمام فروغ اردو سمینار سے خطاب کررہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ اس سمینار کا مقصد اردو آبادی میں اردو کے تئیں بیداری اور ماحول سازی کے علاوہ اردو عملہ کو ان کی منصبی ذمے داری کے تئیں ذمے دار اور جواب دہ بنانا ہے۔ مونگیر میں سمینار سے خطاب کرتے ہوئے ڈائرکٹر (اردو) امتیاز احمد کریمی نے کہا کہ آپ اپنے بچوں کو اعلیٰ عصری تعلیم دیں، انھیں انگریزی اور ہندی بھی خوب پڑھائیں لیکن کم از کم میٹرک تک اردو کی تعلیم ضرور دیں۔ اس سے بچوں کی زبان شستہ وشائستہ ہوگی اور ان کے تلفظ اور انداز گفتگو میں چار چاند لگ جائیں گے۔ انھوں نے زور دے کر کہا کہ اردو پڑھنے والے طلبا وطالبات کسی بھی طور سے انگریزی اسکولوں کے بچوں سے کم نہیں ہوتے بلکہ کچھ بہتر ہی ہوتے ہیں۔ مقامی ایم ایل اے وجے کمار وجے نے کہا کہ بلاشبہ اردو ایک میٹھی اور محبت کی بھاشا ہے اس کا وکاس ہونا ضروری ہے کیونکہ یہ ایک ساجھا سنسکرتی کی علامت ہے۔ بہار ریاستی کمیشن کے سابق صدر محمد سلام نے رجسٹری آفس میں اردو فارمیٹ شامل کیے جانے اور سبھی سرکاری عمارتوں اور دفتروں اور سڑکوں کی دونوں جانب اردو میں بورڈ لگائے جانے اور سرکاری بسوں پر بھی اردو میں نام لکھوائے جانے کی وکالت کی۔ اس موقعے پر ڈائرکٹر (اردو) امتیاز احمد کریمی نے اطلاع دی کہ اردو ڈائرکٹوریٹ کے ذریعے رجسٹری آفس کو رجسٹری فارمیٹ کا اردو ترجمہ مہیا کرایا جاچکا ہے۔ اس موقعے پر ڈاکٹر اقبال حسن آزاد، جاوید اختر آزاد اور امتیاز رحمانی نے مقالے پیش کیے اور سرکاری اور عوامی سطح پر اردو کے مسائل کے سلسلے میں اپنے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے اردو ڈائرکٹوریٹ کی کارکردگی کی ستائش کی۔ بحیثیت مندوبین ڈاکٹر تسنیم صدیقی اور شاہ محمد صدیقی نے بھی مختصر مگر جامع انداز میں اپنی قیمتی آرا سے حاضرین کو نوازا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 3 فروری 2017

تلنگانہ:

غیر افسانوی ادب میں خواتین کا حصہ

حیدرآباد: علم و ادب کے میدان میں خواتین ترقی کررہی ہیں اور اپنی صلاحیتوں سے ترقی کے زینے طے کررہی ہیں۔ ادب کے میدان میں انھیں تصنیف وتالیف کی جانب توجہ دلانا وقت کا اہم تقاضا ہے۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر بی راجا رتنم، وائس چانسلر، پالمور یونیورسٹی

محبوب نگر (تلنگانہ) نے این ٹی آر ڈگری کالج محبوب نگر میں منعقدہ قومی سمینار 'غیر افسانوی ادب کے فروغ میں خواتین کا حصہ' سے کیا۔ انھوں نے کہا کہ اردو زبان نے آزادیِ ہند کی جد و جہد میں اہم رول ادا کیا ہے، اردو دراصل ایک تہذیب وتمدن کا نام ہے اور قومی یکجہتی کے فروغ میں اردو کا نمایاں رول رہا ہے۔ پروفیسر مظفر علی شہ میری صدر شعبہ اردو، یونیورسٹی آف حیدرآباد نے اپنے کلیدی خطاب میں کہا کہ خواتین جدید سماج کی تشکیل میں اہم کردار ادا کریں۔ اردو تحقیق اور تنقید کو غیر افسانوی ادب میں شامل نہیں کیا جانا چاہیے کیونکہ غیر افسانوی ادب جذبات اور احساسات کو پیش کرتا ہے جبکہ اردو تحقیق وتنقید ایک ہیئت کے تحت مشاہدات اور حوالے کے ذریعے کسی نتیجہ کو بیان کرتی ہیں اور تحقیق کی بنیاد مفروضہ پر ہوتی ہے، انھوں نے کہا کہ غیر افسانوی ادب کی اصناف پر گفتگو ہونی چاہیے۔ ڈاکٹر بی زینب پرنسپل ین ٹی آر گورنمنٹ ڈگری و پی جی کالج (اناث) محبوب نگر نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ اردو زبان عالمی سطح پر مقبول عام ہے۔ ادب کے میدان میں خواتین کی خدمات بھی کافی اہمیت کی حامل ہیں اس شعبے میں مزید ترقی کی ضرورت ہے۔ ان کے علاوہ دیگر شرکا نے بھی خواتین کی تخلیقی صلاحیتوں کا جائزہ لیا۔ نظامت کے فرائض عبدالرشید اکیڈمک کوآرڈی نیٹر نے انجام دیے، شکریہ محترمہ ملکہ نے ادا کیا۔

روزنامہ 'جدید خبر' دہلی، 7 جنوری 2017

راجستھان:

ہندوستان اور ایران کے ثقافتی تعلقات

جودھپور: ایران کے رہبرِ معظم (سپریم لیڈر) مذہبی رہنما آیت اللہ العظمیٰ سید علی خامنہ ای کے ہندوستان میں نمائندے آیت اللہ مہدی مہدوی پور نے اپنے جودھپور قیام کے دوران مولانا آزاد یونیورسٹی میں منگل کو منعقد 'ہندوستان اور ایران کے ثقافتی تعلقات' پر اپنی تقریر میں کہا کہ ہندوستان اور ایران کے ثقافتی، لسانی رشتے ہزاروں سال پرانے ہیں۔ انھوں نے خاص کر راجستھان اور ایران کے درمیان اجمیر میں خواجہ معین الدین چشتی اور ناگور کے حمید الدین ناگوری کے حوالے سے کہا کہ یہ دونوں ایرانی تھے اور انھوں نے راجستھان کو اسلامیات اور تصوف کی تبلیغ کا مرکز بنایا۔ آیت اللہ مہدی مہدوی پور نے مولانا آزاد یونیورسٹی اور مارواڑ مسلم ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی جودھپور کی طرف سے قائم ادارے اور فلاح و بہبود کے لیے چلنے والے اداروں کے تعاون کو خوب سراہا۔ اس موقع پر انھوں نے ساری دنیا کے لیے ہندوستان کے امن اور دوستانہ پیغام کی خوب تعریف کی۔ مولانا آزاد یونیورسٹی کے صدر پدم شری پروفیسر اختر الواسع نے استقبالیہ تقریر میں کہا کہ فارسی زبان جتنی ایران کی ہے اتنا ہی اس پر ہندوستان کا بھی حق ہے۔ آپ نے ہمیں حافظ اور سعدی جیسے مشہور شعرا دیے تو ہم نے بھی آپ کو امیر خسرو اور عبدالقادر بیدل جیسے شعرا دیے۔ ہم ایک دوسرے سے بندھے ہوئے ہیں اور ہر دور میں ایران اور ہندوستان ایک دوسرے سے جڑے رہے اور آج بھی یہ رشتے بڑے مضبوط ہیں۔ مارواڑ مسلم ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی کے صدر عبدالعزیز نے اپنی صدارتی تقریر میں اس بات پر خوشی کا اظہار کیا کہ آیت اللہ مہدی مہدوی پور ہماری دعوت پر جودھپور آئے اور ایک نئی تاریخ قائم کی۔ آیت اللہ مہدی مہدوی پور کی تقریر کا ترجمہ ایرانی ثقافتی سینٹر دہلی سے وابستہ حیدر رضا نے کیا۔ نظامت مولانا شاہد حسین ندوی نے کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 26 جنوری 2017

مغربی بنگال:

مغربی بنگال میں اردو کا فروغ

نئی دہلی: ٹی ایم سی کے سینئر لیڈر و سابق مرکزی وزیر سلطان احمد نے کہا کہ مغربی بنگال اردو اکادمی کا قیام 1979 میں ہوا تھا۔ ان دنوں ریاست میں اردو خوب نشو و نما

پا رہی ہے۔ اس موقع پر رکن پارلیمنٹ سلطان احمد نے کہا کہ 10 فیصد اردو زبان بولنے والے ضلع میں اردو زبان کو دوسری زبان کا درجہ دیا گیا ہے، ساتھ ہی اردو تمام سرکاری محکموں میں اردو زبان قبول کی جاتی ہے، کیونکہ بنگال اردو اکادمی نے کلکتہ میونسپل کارپوریشن کے تمام محکموں میں اردو ٹرانسلیٹر کی تقرری کی ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ آج پورے ہندوستان میں سب سے زیادہ بجٹ مغربی بنگال اردو اکادمی کا ہے، جو 12 کروڑ روپے ہے اور وہ تمام پیسے خرچ بھی کیے جاتے ہیں۔ اس موقع پر ایم پی سلطان احمد، ندیم الحق، ڈاکٹر سید منال شاہ قادری (وائس چیئرمین، مغربی بنگال اردو) اور اکادمی کی سکریٹری نزہت زینب و دیگر نے بنگال کی اردو اکادمی کے تحت کیے جانے والی کارکردگی کا خاکہ پیش کیا اور 'جشن اقبال' نامی میگزین کا اجرا بھی کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 8 جنوری 2017

تہذیب و ثقافت:

ناگپور یونیورسٹی میں محفل مشاعرہ

ناگپور: راشٹرسنت تکڑوجی مہاراج ناگپور یونیورسٹی شعبہ اردو کے زیراہتمام یونیورسٹی کے اردو ہال میں

بعنوان 'نئے رنگ نئی روشنی' محفل مشاعرہ کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت معروف شاعر اور ناظم مشاعرہ حمید انصاری نے کی۔ محفل مشاعرہ میں اپنے عہد کے تین بڑے اور برصغیر میں مشہور شاعر شاہد کبیر، مدحت الاختر اور شریف احمد شریف کے چشم و چراغ ڈاکٹر شمیر کبیر، عبید حارث اور بابر شریف نے اپنے تازے کلام سے سامعین کی داد و تحسین حاصل کی۔ اس کے علاوہ محفل مشاعرہ میں ڈاکٹر لوکیندر سنگھ، ڈاکٹر یحییٰ جمیل، ڈاکٹر انور احمد صدیقی وردھا، ڈاکٹر محسن خان رائے گڑھ، توحید الحق کامٹی، گلشن آرا گل کامٹی، صدر مشاعرہ حمید انصاری، اور ڈاکٹر شرف الدین ساحل نے بھی اپنے کلام سے نوازا۔ صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر پرمود شرما نے شاعر اور مہمانوں کا استقبال کیا۔ معروف صحافی شمیم اعجاز نے ناظم مشاعرہ کے فرائض انجام دیے۔ اس موقع پر پرو وائس چانسلر ڈاکٹر یوے، ڈائرکٹر شعبہ انکم ٹیکس نوشین انصاری، یونیورسٹی شعبہ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ڈی کے اگروال، پروفیسر اشتیاق کامل، مرزا سلیم بیگ بطور مہمان خصوصی شریک تھے۔

پریس ریلیز: شمیم اعجاز ہفت روزہ المیزان، ناگپور، 27 جنوری 2017

برہان پور میں مشاعرہ

برہان پور: دارالسرور ایجوکیشن سوسائٹی برہانپور کے زیراہتمام استاد اسماعیل گروپ کے اشتراک سے دو بھائی بیڑی فیکٹری کے پاس ذاکر حسین وارڈ میں کل ہند مشاعرہ کا انعقاد 'ایک شام یوسف فراز کے نام' سے 20 جنوری بروز جمعہ کو کیا گیا جس کی سرپرستی پیرزادہ سید مصطفیٰ علی ساغر نے اور صدارت کارپوریٹر اسماعیل عالم انصاری

نے کی، افتتاح کارپوریٹر سریش چمپالال کے ہاتھوں سے ہوا اور شمع افروزی سید نور قاضی نے کیں۔ برہانپور میں ادبی، سماجی، تعلیمی خدمات انجام دینے والے پرویز سلامت، نعیم راشد، ڈاکٹر سوشیل سوم ونشی، ڈاکٹر جلیل الرحمٰن انصاری، شاہد اختر، اقبال محسن کو اعزاز و اکرام سے نوازا گیا۔ اس کل ہند مشاعرے میں بیرونی شعرا کے علاوہ مقامی شعرا نے بھی شرکت کی۔

روزنامہ 'جدید خبر' دہلی، 20 جنوری 2017

اعزاز و اکرام

پروفیسر شبنم حمید

الہ آباد: الہ آباد یونیورسٹی کا شعبۂ اردو ملک کا سب سے قدیم شعبہ اردو ہے۔ الہ آباد یونیورسٹی سے ہی ملک میں اردو کی اعلیٰ تعلیم کا آغاز ہوا تھا۔ مسلم خواتین کے لیے کام کرنے والی معروف سماجی کارکن پروفیسر شبنم حمید کو شعبہ اردو الہ آباد یونیورسٹی کا صدر مقرر کیا گیا ہے۔

پروفیسر شبنم حمید نے اعلیٰ تعلیم میں اردو کے گرتے معیار کو بلند کرنے کے منصوبہ کو بھی اپنی ترجیحات میں شامل کیا ہے۔ الہ آباد یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کی قابل ذکر بات یہ بھی ہے کہ ایم اے میں طالبات کی تعداد طلبہ سے کہیں زیادہ ہے۔ پروفیسر شبنم حمید نے اب ان طالبات کے لیے خصوصی منصوبہ بنایا ہے۔ پروفیسر شبنم حمید کا کہنا ہے کہ طالبات کو معاشی طور پر خودکفیل بنانے اور ان کے اندر پوشیدہ صلاحیت کو نکھارنے کے لیے شعبے میں خصوصی لیب بنائے جائیں گے۔ اس کے لیے قومی اردو کونسل سے بھی مدد لی جائے گی۔ خیال رہے کہ پروفیسر شبنم حمید خواتین کے لیے کام کرنے والی کئی سماجی تنظیموں سے بھی وابستہ ہیں۔ خاص طور سے مسلم خواتین کو معاشی طور سے خودکفیل بنانے کے کئی منصوبوں کو وہ کامیابی کے ساتھ چلا چکی ہیں۔ اب شعبہ اردو کی ذمے داری ملنے کے بعد انھوں نے شعبہ سے وابستہ مسلم طالبات کو خودکفیل بنانے کا کام شروع کیا ہے۔ امید کی جاسکتی ہے کہ پروفیسر شبنم حمید کی مدت کار میں شعبہ کی طالبات کو بہترین مواقع فراہم کیے جائیں گے۔

اے این این نیوز، 20 جنوری 2017

گلزار دہلوی

نئی دہلی: گنگا جمنی تہذیب کے نمائندہ شاعر گلزار دہلوی کو اس بار 'بھوپال آتسوا لنکرن ایوارڈ' کے لیے منتخب کیا گیا ہے۔ یہ ایوارڈ ایک لاکھ روپے اور توصیفی سند پر مشتمل ہے۔

قابل ذکر ہے کہ ہر سال یہ ایوارڈ دیا جاتا ہے۔ گذشتہ برس یہ ایوارڈ ڈاکٹر بشیر بدر کو دیا گیا تھا۔ اس موقعے پر ایوارڈ کے منتظمین کو یہ باور کرایا کہ گلزار دہلوی نہ صرف ایک بزرگ شاعر ہیں اور پچھلے 70-60 برس سے شعر و ادب کی خدمت کر رہے ہیں بلکہ ملک کی گنگا جمنی تہذیب کی ایک روشن علامت بھی ہیں چنانچہ اگر اس ایوارڈ کے لیے ان کا انتخاب ہوتا ہے تو اس سے نہ صرف لوگوں میں ایک مثبت پیغام جائے گا بلکہ ملک کی گنگا جمنی تہذیب اور خیر سگالی کے جذبہ کو فروغ حاصل ہوگا۔

روزنامہ 'سیاسی تقدیر' دہلی، 25 جنوری 2017

فرحین خان

''والدین کی مرضی کے خلاف اردو میڈیم سے تعلیم حاصل کرنے کا فیصلہ میرے لیے فخر کا باعث ہے۔ اردو کے ذریعے ہی اپنے مستقبل کو سنوارنے کی کوشش کروں گی۔''
ممبئی یونیورسٹی میں اردو لٹریچر میں ٹاپ کرنے والی مہاراشٹر کالج کی خان فرحین محمد فاروق نے اپنی مذکورہ کامیابی پر انقلاب سے بات کے دوران ان خیالات کا اظہار کیا۔

فرحین کے بقول ''اردو میرا پسندیدہ مضمون ہے

لیکن میرے والدین کا کہنا تھا کہ انگریزی کا دور ہے اردو سے تعلیم حاصل کر کے کیا کروگی۔ انگریزی پڑھو ورنہ زمانہ کیا کہے گا، جس پر میں نے والد سے کہا تھا کہ مجھے زمانے کی فکر نہیں ہے اور میرا اپنا ماننا ہے کہ دنیا میں کوئی ایسا نہیں ہے جس نے دوسروں کی زبان سیکھ کر ترقی حاصل کی ہو لہٰذا میں دوسروں کی زبان کیوں اپناؤں۔ چنانچہ میں نے اردو میڈیم سے تعلیم حاصل کی اور اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے یہ آج اسی زبان کی وجہ سے مجھے معروف صنعت کار مکیش امبانی کے ہاتھوں مذکورہ اعزاز سے نوازا گیا۔''

انجمن اسلام باندرہ سے اپنی تعلیم کا آغاز کرنے والی دھاراوی کی فرحین کے مطابق ''بچپن ہی سے مجھے اردو لکھنے، پڑھنے اور بولنے کا بے حد شوق تھا۔ غالباً اسی شوق نے مجھے اردو کا گرویدہ بنایا اور کالج میں اردو زبان و ادب سیکھنے کا مجھے جو موقع میسر آیا وہ میری کامیابی کی اہم وجہ ہے۔ فرحین ایم اے کر رہی ہیں ساتھ ہی 'تلاش' کے عنوان سے ایک ناول تحریر کرنے کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ مجھے امید ہے کہ اردو کی بیساکھی پر سوار ہوکر ہی میں اپنی کامیابی کی منزل طے کروں گی۔''

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 24 جنوری 2017

کل ہند مضمون نویسی مقابلہ کے انعامات کا اعلان

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے مرکز برائے فروغ تعلیم و ثقافت مسلمانان ہند کے ذریعے منعقد کرائے گئے مضمون نویسی مقابلے بعنوان 'برج کورس میں میرا علمی سفر' کے نتائج کا اعلان کر دیا گیا ہے۔ یہ مسابقہ دینی علما و عالمات کی پوشیدہ صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کے لیے منعقد کیا گیا تھا۔ برج کورس چونکہ ماضی کی تعلیمی عظمت رفتہ کے احیا کی ایک کوشش ہے۔ اس لیے اس سفر کی روداد، اس کا تجربہ فارغین مدارس اور ان کے ارباب حل و عقل کے لیے چشم کشا اور حوصلہ افزا ہوں گے۔ برج کورس اسی دور کی واپسی کے لیے دوراندیش اور بیدار مغز علما کی تیاری کر رہا ہے جو انسانیت کو مختلف میدان میں قیادت فراہم کریں گے۔ مذکورہ مسابقہ کے مضامین جلد از جلد زیور طباعت سے آراستہ ہوکر منصۂ شہود پر آئیں گے۔ طلبا و طالبات کی ان تحریروں سے اندازہ ہوگا کہ برج کورس دنیائے انسانیت کے لیے کس قسم کی قیادت کی تیاری میں مصروف ہے۔ مذکورہ مسابقہ میں اوّل انعام جو مبلغ 40 ہزار روپے کا ہے۔ دو طلبا محمد تمیم قاسمی اور شرافت حسین ندوی مشترکہ طور سے اس کے لیے اہل قرار پائے ہیں۔ دوسرا انعام جو مبلغ بیس ہزار روپے کا ہوگا اس کے لیے بھی دو طلبا اظہر حسین اور محمد اسماعیل اہل قرار دیے گئے ہیں۔ اسی طرح سوم انعام جو مبلغ دس ہزار روپے کا ہے اس کے لیے رقیہ فاطمہ اور عمیر خاں مشترکہ طور سے انعام کے حقدار قرار دیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ پانچ تشجیعی انعام کے مستحقین میں فرحانہ پروین، نعیم احمد، محمد ارشد، نہال احمد اور عتیق الرحمٰن کے نام شامل ہیں۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 11 جنوری 2017

اردو اکادمی کے زیرِ اہتمام جلسہ تقسیم انعامات کا منظر

ڈاکٹر مظفر اسلام

نوح، میوات: یوم جمہوریہ کے موقعے پر ضلع ہیڈ آفس نوح میں ضلع انتظامیہ میوات کی جانب سے منعقد ضلع سطحی

'جشن یوم جمہوریہ تقریب' میں نوح میں واقع مولانا آزاد اردو ماڈل اسکول (مانو) کے پرنسپل ڈاکٹر مظفر اسلام کو ان کے اسکول کے ذریعے علاقہ میں اردو میڈیم سے دی جارہی بہتر و معیاری تعلیم کے لیے ضلع انتظامیہ میوات کی جانب سے اعزاز سے نوازا گیا ہے۔ ڈاکٹر مظفر اسلام کو بہتر تعلیمی خدمات کے لیے اعزاز سے نوازے جانے پر علاقہ وخاص طور سے تعلیمی حلقوں میں خوشی کا ماحول ہے۔ صوبہ ہریانہ کے واحد اردو میڈیم اسکول مانو نوح کے پرنسپل ڈاکٹر مظفر اسلام نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے ضلع انتظامیہ میوات وخاص طور سے ڈپٹی کمشنر میوات منی رام شرما کا شکریہ ادا کیا ہے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 1 فروری 2017

عابد ادیب کو پروفیسر قمر رئیس سد بھاؤنا سمان

اودے پور: راجستھان اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی جانب سے دیا جانے والا سالانہ اعزاز پروفیسر قمر رئیس سد بھاؤنا سمان اس برس اردو کے نامور شاعر اور سماجی کارکن عابد ادیب کو

پیش کیا گیا۔ راجستھان اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے اعزازی ڈائرکٹر پروفیسر فاروق بخشی نے بتایا کہ اودے پور کے مشہور مہارانا کمبھا سنگیت پریشد کے ہال میں تقریب کا اہتمام کیا گیا۔ اس اعزازی تقریب میں موہن لال سکھاڈیا یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر جے پی شرما نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ انھوں نے اردو زبان کی مٹھاس اور اس کے ادب کو ہندوستانی تہذیب کا ورثہ قرار دیا۔ الہ آباد یونیورسٹی کے پروفیسر علی احمد فاطمی نے مہمان ذی وقار کی حیثیت سے شرکت کی اس اعزازی تقریب میں صدارتی تقریر کرتے ہوئے موہن لال سکھاڈیا یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر پروفیسر آئی وی ترویدی نے کہا کہ میں نے عابد ادیب کو سماجی کاموں میں جدوجہد کرتے ہوئے دیکھا ہے، یہ اعزاز ان کا حق ہے۔ صاحب اعزاز شاعر عابد ادیب نے پروفیسر قمر رئیس سے اپنے دیرینہ مراسم کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ انھوں نے ہماری اصلاحی تحریک میں ہمارا جی کھول کر ساتھ دیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 1 فروری 2017

ڈاکٹر سید احمد قادری کے اعزاز میں ایک شام

امریکہ: معروف صحافی اور افسانہ نگار ڈاکٹر سید احمد قادری کے اعزاز میں بزم شعر وسخن، ہیوسٹن کی جانب سے 22 جنوری، بروز اتوار، ہوٹل کمفرٹ ان میں ایک باوقار شام کا انعقاد کیا گیا۔ اس اعزازی جلسے کی مجلس صدارت میں اردو کے

مشہور ادیب اور 'باتیں کراچی کی' کے مصنف جناب سلمان یونس، علی سردار جعفری کے بھتیجے اور معروف شاعر جناب پرویز جعفری اور امریکہ کی مقبول شاعرہ عشرت آفریں جیسی اہم شخصیات جلوہ افروز تھیں۔ اس کے بعد امریکہ کے مشہور ومقبول شاعر ڈاکٹر نوشہ اسرار نے مہمان خصوصی ڈاکٹر سید احمد قادری کا حاضرین سے تعارف کراتے ہوئے ان کی ادبی اور صحافتی خدمات پر روشنی ڈالی اور بتایا کہ اس وقت بھارت میں جو لوگ ادب وصحافت کے میدان میں بہت زیادہ سرگرم، متحرک اور فعال ہیں، ان میں ایک اہم نام ڈاکٹر سید احمد قادری کا ہے جو اپنے افسانے اور تنقیدی وصحافتی مضامین کے حوالے سے پورے برصغیر میں اپنی ایک منفرد شناخت بنانے میں کامیاب ہیں۔ تعارف کے بعد ڈاکٹر نوشہ اسرار نے ڈاکٹر سید احمد قادری کا پھولوں کے گلدستہ اور شال کے ساتھ اعزاز پیش کیا۔ ڈاکٹر نوشہ اسرار کی۔ ڈاکٹر سید احمد قادری نے اس شاندار تقریب کے انعقاد کے لیے تمام لوگوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے بتایا کہ اس وقت عالمی منظرنامہ میں ہر جانب انتشار، خلفشار اور بدامنی کی مسموم فضا چھائی ہوئی ہے۔ دنیا کے مختلف ممالک سیاسی، سماجی، معاشرتی اور اقتصادی مسائل سے گھرے ہوئے ہیں۔ کئی ممالک کے لوگ جنگ جدال سے خوف زدہ، پریشان حال اور سراسیمہ ہیں۔ ایسے ناگفتہ بہ حالات میں ادیبوں اور صحافیوں کی بہت زیادہ ذمہ داری بڑھ جاتی ہے کہ وہ ایسے معصوم، بے گناہ، بے بس اور روتے بلکتے لوگوں کی آواز بن کر انھیں انصاف دلانے کی بھرپور کوشش کرنے کے ساتھ ساتھ انسانیت اور اقدار کی حفاظت کریں۔ انھوں نے اپنی مختصر لیکن بہت ہی جامع تقریر میں اردو زبان کی زبوں حالی کا بھی بطور خاص ذکر کیا اور کہا کہ اردو صرف ایک زبان نہیں، بلکہ ہماری پوری تہذیب ہے۔ اسے نہ صرف اپنے دلوں میں بسائے رکھنے بلکہ اس کی حفاظت اور فروغ کی بھی ہم آپ کی ذمہ داری ہے۔ ڈاکٹر قادری نے امریکہ میں رہنے والے ان لوگوں کو مبارکباد پیش کی، جو نہ صرف اپنے گھروں میں اردو کا چراغ روشن کیے ہوئے ہیں، بلکہ اپنی کوششوں سے اس کی روشنی کو دور دور تک پھیلانے کی جدوجہد میں بھی مصروف ہیں۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 28 جنوری 2017

اردو اکادمی کے زیرِ اہتمام جلسہ تقسیم انعامات

نئی دہلی: اردو اکادمی، دہلی کے زیرِ اہتمام ایوان غالب میں جلسہ تقسیم انعامات برائے تعلیمی مقابلے کا انعقاد عمل میں آیا جس میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے دہلی حکومت کے سکریٹری الندا این کے شرما نے شرکت کی۔ استقبالیہ کلمات پیش کرتے ہوئے اکادمی کے وائس چیئرمین ڈاکٹر ماجد دیوبندی نے کہا کہ اردو کے فروغ میں ان اساتذہ کو فراموش نہیں کیا جاسکتا جو اپنے طلبا اور طالبات کو اس زبان کی تعلیم دیتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اردو جو ایک تہذیب ہے اس کو عوام الناس تک پہنچانا ہر اردو والے کا فرض اولین ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ جن

فاروق ارگلی کی مرتب کردہ 'خواجہ حسن نظامی: شخصیت اور کارنامے' کا اجرا

بچوں کو انعام اور اعزازات سے نوازا گیا ہے ان میں زیادہ تعداد بیٹیوں کی ہے جو اس بات کی علامت ہے کہ اردو سیکھنے اور تعلیم پانے میں لڑکیاں لڑکوں سے آگے جانے کا ہنر رکھتی ہیں۔ اکادمی کے سکریٹری ایس ایم علی نے حاضرین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ اتنی بڑی تعداد میں اساتذہ اور طلبا و طالبات کا موجود ہونا اردو کے روشن مستقبل کی علامتوں میں سے ایک ہے۔ اس جلسہ تقسیم انعامات میں 214 طلبا و طالبات و اسکولوں کو ڈاکٹر ماجد دیوبندی اور این کے شرما کے ہاتھوں سے تقریباً دو لاکھ روپے نقد، سند اور مومنٹو تقسیم کیے گئے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 25 جنوری 2017

اجرا:

خواجہ حسن ثانی نظامیؒ: شخصیت اور کارنامے

نئی دہلی: نائب صدر جمہوریہ جناب حامد انصاری نے خواجہ حسن ثانی نظامی کی شخصیت اور علم و ادب کے میدان میں ان کی تحریروں پر مشتمل معروف ادیب وصحافی جناب فاروق ارگلی کی مرتب کردہ 1200 صفحات اور دو جلدوں پر مشتمل یادگار کتاب کی رونمائی اپنی رہائش گاہ پر منعقد خصوصی تقریب میں انجام دی جس کا اہتمام خواجہ حسن ثانی نظامی کے جانشین اور درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کے سجادہ نشین خواجہ سید محمد نظامی نے کیا تھا۔ اس موقعے پر انصاری صاحب نے خواجہ حسن ثانی نظامی سے اپنے دیرینہ تعلق کا تذکرہ کرتے ہوئے انھیں دہلی کی تہذیب اور تصوف کی اقدار کا آئینہ قرار دیا۔

نائب صدر جمہوریہ نے اس بات پر خوشی کا اظہار کیا کہ مصورِ فطرت خواجہ حسن نظامی نے جو حلقۂ نظامیہ قائم کیا تھا خواجہ حسن ثانی نظامی نے اس کو نئی وسعتیں عطا کیں اور اس روایت کو خواجہ سید محمد نظامی برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ نائب صدر جمہوریہ نے دو جلدوں پر مشتمل 'خواجہ حسن ثانی نظامی: شخصیت اور کارنامے' کے مرتب جناب فاروق ارگلی کی بھی ستائش کی اور اس سے قبل خواجہ حسن نظامی پر اس سلسلے کی ایک شاندار اور موقر کتاب کا بھی تذکرہ کیا جس کی رونمائی بھی انھیں کے ہاتھوں ہوئی تھی۔

تقریب کے شرکا میں جنوبی افریقہ جماعت نظامیہ کے ناظم حافظ فیاض موسم نظامی، ڈربن کے بی جناب ارشد خان نظامی، کرناٹک کے پیر پاشا نظامی اور جناب خالد نظامی و دیگر اصحاب شامل تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 19 جنوری 2017

مجموعہ رسائل امام شاہ ولی اللہ

نئی دھلی: شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام مجموعہ رسائل امام شاہ ولی اللہ کی چھٹی جلد کا اجرا کرتے ہوئے نائب صدر جمہوریہ حامد انصاری نے شاہ ولی اللہ

انسٹی ٹیوٹ کے علمی و تحقیقی کاموں کی تحسین کی اور مجموعہ رسائل امام شاہ ولی اللہ کے معیار تدوین و تحقیق اور تصحیح و تعلیق پر حیرت و استعجاب کا اظہار کیا، اس موقعے پر محمد ادیب سابق ممبر پارلیمنٹ بھی موجود تھے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 5 فروری 2017

سرسید نمبر

علی گڑھ: علی گڑھ کی معروف ادبی تنظیم 'بزمِ ادب خواتین' کی 2017 کی اوّلین نشست میرس روڈ پر واقع بیگم صبیحہ خاں کے دولت کدہ پر منعقد ہوئی جس کا آغاز بیگم ریحانہ حسن کی تلاوت کلام پاک اور ترجمہ سے ہوا۔ اس نشست میں بزم ادب خواتین کے زیر اہتمام شائع ہونے والے سالنامہ 'بزمِ ادب' کے 22 ویں شمارہ کا اجرا بھی عمل میں آیا۔ یہ شمارہ 'سرسید نمبر' کے طور پر شائع کیا گیا ہے۔ حاضرین کا خیر مقدم کرتے ہوئے بزمِ ادب خواتین کی سکریٹری راشدہ خلیل نے کہا کہ انھیں فخر ہے کہ بزمِ ادب خواتین اپنے قیام سے اب تک مسلسل سرگرم عمل ہے اور اردو زبان و ادب کے فروغ میں رول ادا کر رہی ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 3 فروری 2017

اشک ساگر

نئی دھلی: دہلی کانسٹی ٹیوشن کلب میں معروف مصنفہ سلمہ سلطانہ کی پانچویں کتاب اشک ساگر کا رسم اجرا سابق وزیر قانون رام جیٹھ ملانی (سینئر ایڈوکیٹ سپریم کورٹ) نے کیا اس موقعے پر انھوں نے کتاب کے بارے میں کہا کہ مجھے غلط فہمی ہوگئی میں یہ سمجھا کہ یہ کتاب عاشقی پر مبنی ہے مگر جب میں نے اس کا مطالعہ کیا تو مجھے اشک ساگر کی معنویت کا اندازہ ہوا۔ انھوں نے کہا کہ سلمہ نے یہ کتاب لکھ کر سماجی مسائل سے عوام الناس کو روشناس کرایا ہے اسی موقع پر انھوں نے کہا کہ میں اردو کا ماہر نہیں ہوں مگر اردو کا عاشق ضرور ہوں۔ انھوں نے کہا کہ میں نے اردو پڑھی ہے۔ اردو میں سندھی الفاظ کا بہت دخل ہے۔ اس موقعے پر تقریب کی صدارت کرتے ہوئے عالمی شہرت یافتہ شاعر پنڈت آنند موہن زتشی گلزار دہلوی نے اپنے صدارتی خطبے میں مہمان خصوصی رام جیٹھ ملانی کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ ایسے مرد مجاہد ہندوستان کی سرزمین پر موجود ہیں جن کی سرپرستی میں گنگا جمنی تہذیب کا چراغ روشن ہی رہے گا۔ انھوں نے سلمہ سلطانہ کی پانچویں کتاب اشک ساگر کی رونمائی پر مبارکباد دی۔ تقریب کی نظامت معروف صحافی زبیر قریشی نے کی۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 30 جنوری 2017

لہو بولتا بھی ہے

لکھنؤ: مسلم مجاہدین آزادی اور شہیدان وطن کی تعداد، قربانیاں اور جدوجہد کیا ہے۔ اسی کوشش میں سیاسی سوجھ بوجھ رکھنے والے سید شاہ نواز قادری نے تاریخ کے اوراق پلٹے تو مجاہدین آزادی اور شہیدان وطن کی ایک طویل فہرست ان کے سامنے آئی جسے دوسروں کی سازش یا ہماری غفلت کے سبب یکسر نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ نتیجتاً نہ صرف یہ کہ دوسری قومیں بلکہ مسلم رہبران ملت بھی مسلم شہدا اور جاں نثاران وطن کی قربانیوں سے یکسر ناواقف اور بے بہرہ ہوگئے تھے۔ پہلی مرتبہ کسی کتاب میں مسلم مجاہدین آزادی اور شہیدان وطن کی تعداد 1233 تک پہنچ سکی ورنہ یہ تعداد بمشکل 400 تک سمٹ جاتی تھی۔ سید شاہ نواز قادری کی پیہم کوشش اور کاوش سے قریب 550 صفحات پر مشتمل 'لہو بولتا بھی ہے' نامی ضخیم کتاب تیار ہوگئی...

کتاب کا اجرا 29 جنوری کو رائے اوما ناتھ بلی آڈیٹوریم میں دوپہر ایک بجے عمل میں آیا۔ ایک ماہ سے اخبارات میں اس کتاب پر گفتگو کا دور جاری ہے جس سے موضوع کی اہمیت اور کتاب کی افادیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ کتاب کی معتبریت اس سے بڑھ جاتی ہے۔ کتاب کی رونمائی سچر

کمیٹی کے چیئرمین اور سابق چیف جسٹس راجندر سچر جی کے بدست عمل میں آئی۔ صدارت کے فرائض مذہب اور سیاست میں یکساں دخل رکھنے والے مولانا عبیداللہ خاں اعظمی (سابق ممبر پارلیمنٹ) نے بحسن وخوبی انجام دیے۔

روزنامہ 'جدید خبر' دہلی، 30 جنوری 2017

اندھیرے میں جادو

نئی دہلی: نئی دہلی اخبار مشرق کے کارکن نبی احمد کے افسانوں کا مجموعہ 'اندھیرے میں جادو' کی رسم اجرا کے موقعے پر اخبار مشرق کے ایگزیکٹیو ایڈیٹر تنویر الحق نے کہا کہ مجھے خوشی ہے کہ انتہائی شستہ اور شائستہ اردو زبان میں نبی احمد نے اپنا دوسرا افسانوی مجموعہ پیش کیا۔ ان افسانوں کے اثرات دیرپا ہوں گے مجھے امید ہے کہ یہ آئندہ بھی اسی طرح کے افسانے تحریر کرتے رہیں گے۔ اس موقعے پر محمد وسیم الحق بھی موجود تھے۔

روزنامہ 'جدید خبر' دہلی، 23 جنوری 2017

تحریریں

نئی دہلی: سرسید ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر کے زیر اہتمام اردو کے ممتاز شاعر وناقد نیر قریشی گنگوہی کی تنقیدی کتاب 'تحریریں' کا اجرا غالب اکیڈمی بستی حضرت نظام الدین میں سینئر ایڈووکیٹ اور سپریم کورٹ بار ایسوسی ایشن کے صدر روپندر سوری کے ہاتھوں عمل میں آیا جس کی صدارت جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی کے صدر شعبہ اردو پروفیسر شہپر رسول نے کی اور نظامت ایڈوکیٹ بی یو برقی نے کی۔ اس تقریب کے مہمان خصوصی پروفیسر قیصر حیات، ڈاکٹر منگلایتن یونیورسٹی اور کنوینر ممتاز شاعر اور ایڈووکیٹ عمران عظیم تھے جبکہ جوائنٹ کنوینر ایڈووکیٹ صنوبر علی ایڈووکیٹ رہے۔ اس تقریب میں اے ایم یو اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے صدر ارشاد اللہ خاں، سکریٹری مدثر حیات، اے ایم یو لائرز فورم کے موجودہ صدر شیخ عمران ایڈووکیٹ اور سابق صدر ضیا اسلم خان بھی موجود تھے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 11 جنوری 2017

گوشۂ اردو

مراد آباد: جواہر نوودیہ ودیالیہ، کالے والا، مراد آباد میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ریسرچ اسکالر و اسکول میں ٹی جی ٹی اردو کے عہدے پر تقرر محمد جنید کی کتاب 'گوشۂ اردو' کا اجرا کیا گیا۔ جواہر نوودیہ ودیالیہ کے پرنسپل مسٹر راکیش کمار رائے کے دستِ مبارک سے کتاب کا اجرا عمل میں آیا۔ اس موقعے پر موجود اساتذہ اور طلبہ وطالبات کو خطاب کرتے ہوئے مسٹر آر کے رائے نے کہا کہ اردو زبان بہترین ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ذائقہ دار زبان ہے۔ اردو زبان کا لب ولہجہ ہر کسی کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ محمد جنید اردو کے ایک قابل اور لائق ٹیچر ہیں۔ انھوں نے سال بھر کی محنت ومشقت کے بعد کتاب 'گوشۂ اردو' کی ترتیب کو انجام دیا ہے۔ ان کا یہ قدم یقیناً لائق تحسین ہے اور وہ کتاب کی اشاعت پر مبارکباد کے مستحق ہیں۔ اپنی تقریر کے دوران انھوں نے بتایا کہ 'گوشۂ اردو' مختلف ریاستوں میں ٹی جی ٹی/پی جی ٹی کے تقرری امتحانات کے لیے بے حد معاون کتاب ہے۔ محمد جنید نے کتاب کے تعلق سے گفتگو کرتے ہوئے بتایا کہ اس کتاب کو این سی ای آر ٹی کی کتابوں کے تعاون سے تیار کیا گیا ہے۔ کتاب 'گوشۂ اردو' میں ہریانہ، راجستھان، اترپردیش، نوودیہ ودیالیہ اور دہلی میں تقرر ہونے والے ٹی جی ٹی/پی جی ٹی اور اسکول لیکچرر کے نصاب کو شامل کیا گیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 25 جنوری 2017

دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھا

کلکتہ: اس دلیل کے ساتھ کہ بیسویں صدی کے نصف آخر میں جن صحافیوں نے اردو صحافت کے دامن کو داغ دار اور آلودہ ہونے سے محفوظ رکھنے کی جدوجہد اور سعی کی ان میں مشہور صحافی اور کلکتہ سے شائع ہونے والے روزنامہ ہند کے سابق ایڈیٹر رئیس الدین فریدی کا نام سب سے نمایاں ہے۔ سابق ممبر پارلیمنٹ و روزنامہ آزاد ہند کے سابق ایڈیٹر احمد سعید ملیح آبادی نے رئیس الدین فریدی کو نظریہ ساز صحافی قرار دیتے ہوئے کہا کہ ان کی زندگی محنت، خودداری اور کسب حلال سے عبارت تھی۔ مشہور صحافی احمد سعید ملیح آبادی نے کہا کہ فریدی اردو صحافت کی ایک ایسی شخصیت تھی جن کے لیے اردو صحافت عبادت سے کم نہیں تھی۔ وہ ہمہ وقت اردو صحافت کی پاکیزگی کے لیے جدوجہد کرتے رہے۔ ملیح آبادی نے کہا کہ فریدی کی تحریریں نئی نسل کے لیے مشعل راہ ہیں۔ ملیح آبادی نے کہا کہ رئیس الدین فریدی کی صحافت کا میدان عمل، ممبئی، حیدرآباد، دہلی اور کلکتہ رہا۔ انھوں نے کلکتہ میں چار دہائیاں گزاریں مگر کلکتہ کا قیام کسی المیہ سے کم نہیں تھا کیونکہ وہ ایک ایسے اخبار سے وابستہ ہوگئے تھے جس کی اشاعت بہت ہی محدود تھی۔ جبکہ وہ ایک بڑے نامہ نگار کے ساتھ ساتھ نظریہ ساز صحافی تھے۔ رسم اجرا کی تقریب کا افتتاح کرتے ہوئے پروفیسر سلیمان خورشید نے کہا کہ 'دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھا' رئیس الدین فریدی کی خودنوشت سے کہیں زیادہ ایک عہد کی مکمل تاریخ ہے جس میں امروہہ، دہلی، ممبئی، حیدرآباد اور کلکتے کے بدلتے حالات کی معروضی انداز میں تاریخ پیش کی ہے۔ ماہنامہ 'انشا' کے ایڈیٹر ف س اعجاز نے اس کتاب پر پیش لفظ بھی لکھا ہے نے کہا کہ یہ کتاب رئیس الدین فریدی کی ایک ہزار سے زائد خودنوشت کا ایک مختصر حصہ ہے اور امید ہے کہ بقیہ حصہ بھی ہمارے سامنے آئے گا۔ اس موقعے پر رئیس الدین فریدی کی اہلیہ رضیہ فریدی کی کتاب 'متاع حیات' کا بھی رسم اجرا کیا گیا جسے ان کی بیٹی نے مرتب کیا ہے۔ تقریب میں کلکتہ شہر کے سرکردہ افراد کی ایک بڑی تعداد شریک تھی۔

روزنامہ 'جدید خبر' دہلی، 8 جنوری 2017

وفیات

نقش لائل پوری

ممبئی: ہندی فلموں کے مشہور ومعروف نغمہ نگار نقش لائل پوری کا انتقال 22 جنوری کو ہوگیا۔ ان کی عمر 89 برس تھی۔

وہ طویل عرصے سے علیل تھے۔ نقش لائل پوری 24 فروری 1928 کو فیصل آباد سے نزدیک لائل پور (پاکستان) میں پیدا ہوئے۔ ان کا اصل نام جسونت رائے شرما تھا۔ جب انھوں نے لکھنا شروع کیا تو تخلص نقش لائل پوری رکھ لیا۔ ان کے والد ایک انجینئر تھے اور ان کی خواہش تھی کہ وہ ان کے نقش قدم پر چلیں۔ اپنے اردو استاذ کی مدد سے وہ لاہور چلے آئے اور ادب کا مطالعہ شروع کر دیا اور مشاعروں میں توجہ کا مرکز بننے لگے۔ ہندوستان کی آزادی کے بعد نقش لائل پوری اپنے اہل خانہ کے ہمراہ لکھنؤ منتقل ہوگئے۔ 1951 میں ممبئی کا رخ کیا، تاکہ فلموں میں اپنا کیریئر بنا سکیں، جس میں انھیں کامیابی حاصل ہوئی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 23 جنوری 2017

خورشید کاکوی

پٹنہ: شاعر، ادیب اور صحافی خورشید عالم کا انتقال 29 جنوری اتوار کی صبح 9 بجے صادق پور لین، پٹنہ سٹی واقع رہائش پر ہوا۔ نماز

جنازہ سوموار کو 2 بجے مدرسہ سلیمانیہ احاطہ میں ادا کی گئی اور بغل کے ہی کشمیری باغ قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔ ان کے پسماندگان

میں اہلیہ کے ساتھ ایک بیٹا اور دو بیٹیاں ہیں۔ خورشید کاکوی نے ادب کو کبھی شہرت و نام و نمود کا بھی ذریعہ نہیں بنایا۔ پٹنہ میں ایک تعزیتی نشست کا انعقاد کیا گیا اور خورشید عالم کاکوی کی خوبیوں کا ذکر کرتے ہوئے ان کے لیے دعائے مغفرت کی گئی۔ روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 31 جنوری 2017

عظمت اللہ خاں

نئی دہلی: ذاکر حسین کالج شعبۂ اردو کے استاد عظمت اللہ خاں 25 جنوری کو اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔ عظمت اللہ خاں ایک بہت ہی مخلص اور نیک دل انسان تھے اور اردو ادب کے فروغ کے لیے ہمیشہ کوشاں رہے۔ اپنی پوری زندگی انھوں نے اردو کے لیے وقف کردی تھی۔ عظمت اللہ خاں کی مذکورہ صفات پروفیسر ابن کنول صدر شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی نے تعزیتی نشست میں کہیں، ساتھ ہی انھوں نے یہ بھی کہا کہ ان کے انتقال سے اردو دنیا میں ایک خلا پیدا ہوگیا ہے جس کا پُر کرنا مشکل ہے۔ شعبۂ اردو کے استاد ڈاکٹر علی جاوید نے عظمت اللہ خاں سے اپنے دیرینہ تعلقات کو یاد کرتے ہوئے کئی خوشگوار واقعات کا ذکر کیا اور اردو زبان و ادب سے ان کی جو محبت تھی اس کا بھی انھوں نے ذکر کیا۔ نیز وہ ایک اچھے ادیب کے ساتھ ساتھ ایک اچھے شاعر بھی تھے اور نظر تخلص کرتے تھے، اس تعزیتی نشست میں ڈاکٹر محمد کاظم، ڈاکٹر ابوبکر عباد، ڈاکٹر مشتاق عالم قادری، ڈاکٹر ارشاد نیازی اور ڈاکٹر متھن کمار کے علاوہ شعبۂ کے ریسرچ اسکالرز اور طلبہ و طالبات موجود تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 1 فروری 2017

بانو قدسیہ

لاہور: اردو کے معروف ادیب مرحوم اشفاق احمد کی اہلیہ اور معروف مصنفہ بانو قدسیہ کا طویل علالت کے بعد 88 سال کی عمر میں 4 فروری 2017 کو انتقال ہوگیا۔ معروف ادیبہ اور فکشن نگار بانو قدسیہ 28 نومبر 1928 کو ہندوستان کے مشرقی پنجاب کے ضلع فیروز پور میں پیدا ہوئیں۔ انھوں نے ایف اے اسلامیہ کالج لاہور اور بی اے کنیئرڈ کالج سے کیا جبکہ 1949 میں گریجویشن کا امتحان پاس کیا اور وہ اس وقت پاکستان ہجرت کر چکی تھیں۔ بانو قدسیہ نے گورنمنٹ کالج لاہور میں ایم اے اردو میں داخلہ لیا اور یہیں اشفاق احمد ان کے کلاس فیلو تھے اور دونوں نے دسمبر 1956 میں شادی کرلی۔ بانو قدسیہ نے 1981 میں 'راجہ گدھ' لکھا جس کا شمار اردو کے مقبول ترین ناولوں میں ہوتا ہے۔ ان کی کل تصانیف کی تعداد دو درجن سے زیادہ ہے اور ان میں ناول، افسانے، مضامین اور سوانح شامل ہیں۔ انھوں نے اردو کے علاوہ پنجابی زبان میں بھی لکھا۔ ان کی اہم تخلیقات میں امربیل، بازگشت، آدھی بات، دوسرا دروازہ، تمثیل، حاصل گھاٹ اور توجہ کی طالب قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے لیے بھی بہت سے ڈرامے لکھے ہیں۔ حکومت پاکستان کی جانب سے ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں 2003 میں 'ستارۂ امتیاز' اور 2010 میں 'ہلال امتیاز' سے نوازا گیا جبکہ اس کے علاوہ انھیں کئی قومی اور بین الاقوامی ایوارڈ بھی دیے گئے ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 5 فروری 2017

سلمیٰ صدیقی

ممبئی: اردو کی معروف نثر نگار سلمیٰ صدیقی کا 13 فروری 2017 کو انتقال ہوگیا۔ وہ تقریباً 86 برس کی تھیں۔

مرحومہ اردو کے نامور افسانہ نگار کرشن چندر کی شریک حیات تھیں۔ کرشن چندر کا 8 مارچ 1977 کو انتقال ہوگیا تھا۔ علی گڑھ کے مقبول اردو ناقد رشید احمد صدیقی کی صاحب زادی سلمیٰ صدیقی کی موت سے اردو دنیا پر غم کے بادل چھا گئے ہیں۔ سلمیٰ صدیقی 18 جون 1931 کو بنارس میں پیدا ہوئیں جہاں ان کا ننیہال تھا۔ ان کی تعلیم و تربیت علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی تعلیمی، ادبی و علمی فضا میں ہوئی۔ وہ اردو سے ایم اے کرنے کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے خواتین کالج میں لکچرر بھی رہیں۔ کرشن چندر سے سلمیٰ صدیقی کی پہلی ملاقات 1953 میں دہلی میں مجاز کے توسط سے ہوئی اور بہت جلد یہ ملاقات ازدواجی رشتے میں بدل گئی۔ وہ 1962 میں کرشن چندر کے ساتھ بمبئی آئیں اور وہیں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ سلمیٰ صدیقی نے اردو اور ہندی میں جو افسانے لکھے ہیں، وہ عورتوں کے مسائل سے تعلق رکھتے ہیں۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں ایک عورت کی نفسیات، اس کی شخصیت اور اس کی روح کی ترجمانی بہت سلیقے سے کی ہے۔ سلمیٰ صدیقی کے نومنتخب افسانوں کے عنوانات یہ ہیں: عرش کا پایہ، چھٹی پرانی نشانی، اندھا چاند، ایک تھا لڑکا، بھروسہ، منگل سوتر، سمجھوتا، گلہری کی بہن، مٹی کا چراغ۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 14 فروری 2017

خراج عقیدت

حفیظ میرٹھی کے یومِ وفات پر شعری نشست

حفیظ میرٹھی کے یوم وفات پر شعری نشست

میرٹھ: شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی اور یونائیٹڈ پروگریسیو تھیٹر ایسوسی ایشن، میرٹھ کے مشترکہ اہتمام میں نئے سال کے موقع اور حفیظ میرٹھی کی یاد میں شعبہ کے پریم چند سمینار ہال میں ایک مشاعرہ و کوی سمیلن کا انعقاد کیا گیا۔ صدارت کے فرائض معروف شاعر نذیر میرٹھی نے انجام دیے اور نظامت سمنیش سمن نے کی۔ استقبال اپٹا کے صدر بھارت بھوشن شرما نے اور شکریے کی رسم سریندر شرما نے ادا کی۔ اس سے قبل پروگرام کا آغاز تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ مہمانوں نے مل کر شمع روشن کی۔ بعد ازاں سعید احمد سہارنپوری نے حفیظ میرٹھی کی غزل سنا کر خوب واہ واہی لوٹی۔ اس موقع پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے کہا کہ حفیظ میرٹھی کا شمار اردو کے ایسے معدودے چند شعرا میں ہوتا ہے جنھوں نے شاعری سے ملک و ملت کی اصلاح کا کام لیا۔ حفیظ میرٹھی کی شاعری مثبت اقدار، خودداری، بے باکی اور حقیقت پسندی کے لیے ہمیشہ یاد کی جائے گی۔ حفیظ میرٹھی قول و فعل کے ایک تھے جو کچھ ان کی شاعری میں بیان ہوا وہی ان کے کردار کا حصہ بھی تھا۔ اس موقع پر ایک شعری نشست کا اہتمام کیا گیا جس میں میرٹھ اور آس پاس کے اردو اور ہندی کے شعرائے کرام نے حصہ لیا۔

روزنامہ 'جدید خبر' دہلی، 9 جنوری 2017

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان کی چند مطبوعات

کلیاتِ مضامین وحید اختر (جلد چہارم)
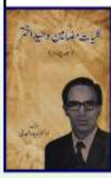
مرتب: ڈاکٹر سرور الہدیٰ
صفحات: 305
قیمت: 160 روپے

کلیاتِ مضامین وحید اختر (جلد پنجم)
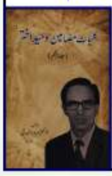
مرتب: ڈاکٹر سرور الہدیٰ
صفحات: 204
قیمت: 115 روپے

کلیاتِ مضامین وحید اختر (جلد ششم)

مرتب: ڈاکٹر سرور الہدیٰ
صفحات: 216
قیمت: -/115 روپے

آئینۂ جہاں: کلیات قرۃ العین حیدر (جلد پنجم: رپورتاژ)

تحقیق و ترتیب: جمیل اختر
صفحات: 407
قیمت: 182 روپے

آئینۂ جہاں: کلیات قرۃ العین حیدر (جلد ہفتم: مضامین)

تحقیق و ترتیب: جمیل اختر
صفحات: 359
قیمت: 165 روپے

عظیم سائنسداں (مع ترمیم و اضافہ)
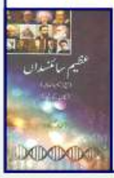
مصنف: احرار حسین
صفحات: 121
قیمت: -/32 روپے

اسرارِ کشف صوفیہ (1068ھ مطابق 1658)

مصنف: سید محمد کمال سنبھلی واسطی
تدوین و تصحیح متن و ترجمہ
وحواشی: ڈاکٹر مصباح احمد صدیقی
صفحات: 803، قیمت: -/335 روپے

انتخابِ سخن (جلد اوّل) سلسلۂ شاہ حاتم

مرتب: حسرت موہانی
صفحات: 388
قیمت: -/175 روپے

دستورِ ہند کا معمار ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر

مصنف: خواجہ عبدالمنتقم
صفحات: 155
قیمت: 70 روپے

داستان گو آیا ہے

مصنف: رتن سنگھ، مصور: فجر الدین
صفحات: 16
قیمت: 25 روپے

ہماری نظم

مصنف: فراغ روہوی
مصور: فجر الدین
صفحات: 20، قیمت: 30 روپے

دوسرا آدمی
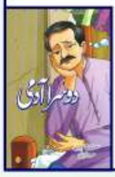
مصنف: قاسم خورشید
مصور: فجر الدین
صفحات: 16، قیمت: 25 روپے

زمین

مصنف: قاسم خورشید
مصور: فجر الدین
صفحات: 16، قیمت: 25 روپے

اذان

مصنف: قاسم خورشید
مصور: فجر الدین
صفحات: 16، قیمت: 25 روپے

طوطا کہانی

مصنف: محسن خان
مصور: فجر الدین
صفحات: 16، قیمت: 25 روپے

انصاف
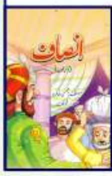
مصنف: محسن خان
مصور: فجر الدین
صفحات: 16، قیمت: 25 روپے

ایک دکھ بھری کہانی

مصنف: اقبال برکی
مصور: فجر الدین
صفحات: 16، قیمت: 25 روپے

مکھانے کی کھیر

مصنف: ذکیہ مشہدی
مصور: فجر الدین
صفحات: 16، قیمت: 25 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

URDU DUNIYA Monthly, March-2017, Vol.19, Issue:03
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

RNI NO. 70323/99
DL (S) - 01/3394/2017-19
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication:**24/02/2017**
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

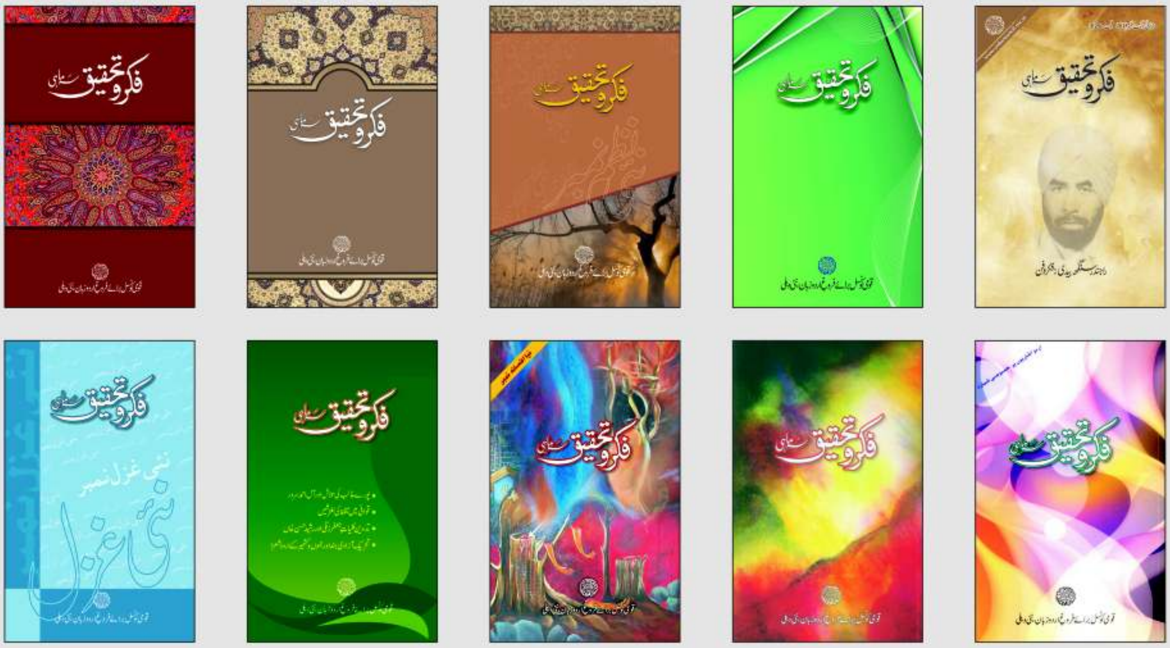

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے
مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

منگانے کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Printed and Published by Prof. Syed Ali Karim, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 institutional Area Jasola New Delhi-110025